بنگال میں اردو

یعنی

مشرقی و مغربی بنگال میں اردو زبان و ادب کی ابتدا سے
۱۹۵۴ء تک کی مکمل تاریخ

وفا راشدی

اردو پبلشنگ هاؤس اردو بازار دهلی ۶

بار اوّل ۵۰۰

قیمت پانچ روپے پچاس نئے پیسے

پبلشر۔ اردو پبلشنگ ہاؤس۔ دہلی ۶

مطبوعہ:۔ یونین پرنٹنگ پریس دہلی ۶

سخنہائے امروز

انتساب	وفا راشدی
پیش لفظ	ماہر القادری
تعارف	اقبال حامد دیوبندی
تقریظ منظوم	کامل صدیقی بریلوی
سخنہائے گفتنی	وفا راشدی

اِنتساب

بنگال کی عظیم المرتبت شخصیت حضرت علامہ رضا
وحشت کے نام جنہوں نے اردو زبان و ادب کو بہت کچھ دیا
لیکن اپنے لئے کچھ نہیں رکھا ۔

خیال تک نہ کیا اہل انجمن نے کبھی!
تمام رات جلی شمع انجمن کے لئے (وحشت)

ہر اُس شخص کے نام جو صوبائی عصبیت مذہبی
تعصب اور ذہنی و تمدنی، بُعد کی لعنتوں سے بلند ہو کر اس
کتاب کا مطالعہ کرے۔

ہر اُس مخلص و وسیع النظر اُردو نواز کے نام جو ذاتی مفاد
اور خود غرضانہ نظریوں سے بلند ہو کر اردو زبان و ادب کی
ترقی و ترویج میں کوشاں ہے۔

وفا راشدی

نَحْمَدُہٗ وَنُصَلِّیْ عَلٰی رَسُوْلِہِ الْکَرِیْمِ ؕ

ماہرُ القادری

ایڈیٹر ماہنامہ فاران کراچی

پیشِ لفظ

جناب وفاؔ راشدی نہایت خاموشی کے ساتھ زبان و ادب کی خدمت کرتے رہتے ہیں۔ شہرت کی ان کو اگر حرص ہوتی اور پروپیگنڈے کے فن سے وہ واقف ہوتے تو اب تک خاصے مشہور ہو جاتے۔ سستی شہرت کے وہ قائل نہیں ہیں اور نام پر کام کو ترجیح دیتے ہیں۔

"بنگال میں اردو" وفاؔ راشدی صاحب کی اُردو سے محبت کا ثبوت اور اُنکی کوششوں کی محسوس شہادت ہے۔ صاحب موصوف نے بڑی محنت اور کاوش و تحقیق کے ساتھ اس کتاب کو مُرتب فرمایا ہے ان کی یہ تالیف عوام نہیں بلکہ خواص کیلئے بھی کام کی چیز ہے، بنگال کے اردو شاعروں اور ادیبوں کی اس کتاب کو "ڈائریکٹری" سمجھئے!! اس خدمت کے لئے انہوں نے نہ جانے کہاں کہاں سے خوشے چُنے ہیں۔ اور اس گلدستہ کے لئے کس کس باغ سے پھول فراہم کئے ہیں۔

ڈھائی سو سال کے شعر و ادب کی تاریخ کو ایک مُجلّد میں جمع کر دینا کوئی ہنسی کھیل نہیں ہے جن لوگوں کو تصنیف و تالیف اور تدوین و ترتیب کا تجربہ ہے وہ جانتے ہیں کہ اس کام میں سچ مچ دانتوں پسینہ آجاتا ہے! پھر یہ کام رنگین و دلچسپ کم اور خشک زیادہ ہے، جب تک کسی مؤلف اور اہلِ قلم کو صبر و محنت کی عادت نہ ہو یہ کام انجام کو نہیں پہونچ سکتا ___ مگر وفاؔ صاحب نے پتھر کاٹ کاٹ کر جوئے شیر

مکالی ہے، اُن کی ہمت یقیناً آفریں کی مستحق ہے!

ان دنوں میری مصروفیت کا یہ عالم ہے کہ ضروری خط جواب کے انتظار کی راہ دیکھ رہے ہیں ایک کام نبٹتا ہوں تو دوسرا کام نکل آتا ہے، اس لئے کتاب کے پڑھنے کی فرصت نہ مل سکی، مگر جہاں جہاں سے بھی پڑھ سکا، کتاب کو مفید ہی پایا، تاریخی سِین سے مجھے بڑی وحشت ہوتی ہے اور وحشت نہ بھی ہو تو یہ یاد کسے رہتے ہیں، واقعات اور تاریخی سِنین کے سلسلہ میں اگر مؤلف کے قلم سے کہیں بھول چوک ہوئی ہے تو اس کی پکڑ وہ حضرات کریں گے جو اس میدان کے مرد ہیں۔

اُردو زبان کے ساتھ ہندوستان اور پاکستان میں بڑے بڑے لوگ بیوفائی کر رہے ہیں، زبان و ادب کے معاملہ میں ایسی طوطا چشمی کبھی دیکھنے اور سُننے میں نہیں آئی مگر جناب وفا راشدی صاحب کی یہ تالیف اس کا ثبوت ہے کہ وہ اُردو کے مخلص وفادار ہیں اور انہوں نے اُردو سے جو پیمانِ وفا باندھا ہے وہ ٹوٹ نہیں سکتا۔

مجھے توقع ہے کہ اُردو داں طبقہ میں یہ تالیف (بنگال میں اُردو) پسند کیجائے گی اور بنگال کے بعض سادہ لوح جو دوسروں کے کہنے میں آکر اُردو سے بیگانے سے رہنے لگے ہیں اس کتاب کو پڑھ کر اُن کی یہ بیگانگی اُنس و محبت سے بدل جائے گی — میرا ہی شعر ہے۔

ہو پھول میں رنگت کیسی ہی خوشبو نہیں تو کچھ بھی نہیں
اُس ملک میں چاہے ہُن برسیں اُردو نہیں تو کچھ بھی نہیں

ماہر اُلقادری
مُدیر "فاران" کراچی
۳۰ نومبر ۱۹۵۴ء

تعارف

اقبال حامد دیوبندی چیف ایڈیٹر روزنامہ آفتاب حیدرآباد (سندھ)

.... مجھے تعارف لکھنے کا حکم ملا ہے۔ بنگال میں اردو جیسی عظیم تخلیق یادگار تصنیف اور تاریخی دستاویز میں تعارف لکھنے کا عزم کیا تو پہلا سوال سامنے یہ آیا کہ تعارف کس کا لکھنا ہے تصنیف "بنگال میں اردو" کا یا مصنف (وفا راشدی) کا۔ (۹) اس سلسلہ میں مکتبہ سے رجوع اس لئے نہیں کیا کہ اگر وہاں سے یہ جواب ملا کر ــــ "دونوں کا" تو کیا ہوگا۔ دونوں کا تعارف لکھنے کی دوہری ذمہ داری میں پڑ جانے کے وہم میں راقم نے خود ہی فیصلہ کر لیا کہ تصانیف کے تعارف کی چنداں ضرورت نہیں اس لئے کہ یہ صحیفہ پڑھنے والوں کے پاس ہوگا، اور وہ خود ہی اس کے بارے میں فیصلے کے مجاز ہو سکتے ہیں لہٰذا تعارف اس کے مصنف وفا راشدی کا لکھا جائے جو ہر قاری کی نگاہ سے اوجھل ہوگا۔ ..

... - - وفا راشدی کے تعارف پر قلم بدست ہو جانے کی ایک وجہ بھی ہے کہ اس خالص بنگالی اردو داں نوجوان کے بارے میں راقم کو مشہور و معروف اہل قلم اور موقر جریدوں کے فقرے اور تبصرے ٹل گئے، اس کا یہ مطلب نہیں کہ اخباروں کے ریمارکس پر ہی میں وفا راشدی کا تعارف لکھ رہا ہوں اور ذاتی طور پر میں ان سے واقف نہیں، حقیقت یہ ہے کہ میں وفا راشدی کو گزشتہ پانچ برس سے دیکھ رہا ہوں پڑھ رہا ہوں اور پرکھ رہا ہوں لہٰذا تعریف کے سلسلہ میں عدم معلومات کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔!

میرے خیال میں تعارف شروع بھی نہیں کیا جا سکتا تاوقتیکہ یہ نہ ثابت کر دیا جائے کہ ضخیم تصنیف، ہمہ گیر کتاب اور محیط تاریخ "بنگال میں اردو" نامکمل ہے اور یہ بنگال کے تمام اردو داں اہلِ قلم کی نمائندگی نہیں کرتی، کیونکہ اس میں صرف وفا راشدی کا کہیں

ذکر نہیں ہے جو خود بھی بنگال کا ابھرتا ہوا اور امید افزا طور پر ہمیشہ ابھرتا رہنے والا اردو داں اہل قلم ہے۔ اگر وفا راشدی معمولی قسم کا اردو داں ہوتا۔ یعنی بنگالی ہونے کے باوجود اردو کا ادیب ہوتا ایسا ادیب جس نے اردو زبان میں افسانے لکھے ہوں۔ مضامین شائع کئے ہوں۔ اور تھوڑی بہت شاعری کی ہو تب بھی کوئی بات نہ تھی یہاں تو حیرتناک مسرت یا مسرت انگیز حیرت اس لئے ہے کہ وفا راشدی کئی مشہور کتابوں کا مصنف اور مؤلف اس کے ساتھ ہی ناموں فنکار ہونے کے باوجود۔ "بنگال میں اردو" کے صفحات میں ڈھونڈے سے نہیں ملتا میں سمجھتا ہوں یہی وہ وجہ ہے جس کی بنا پر پبلشر ــــــــــ کے نزدیک تعارف ضروری قرار پایا۔

وفا راشدی ۲۶ - ۲۷ برس تک کی عمر کا ایک ایسا نوجوان ہے جو اپنی معصوم شکل اور درمیانہ قد کی وجہ سے اور بھی کم عمر معلوم ہوتا ہے۔ مگر علامہ رضا علی وحشت کلکتوی جیسے بزرگ شاعر اور پروفیسر عندلیب شادانی جیسے پر عظمت فن کار نوجوان وفا راشدی کو سر آنکھوں پر جگہ دیتے ہیں۔ اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ وفا راشدی کس مرتبہ کا فرد ہے۔ میرے نزدیک "بنگال میں اردو" جیسی اہم تصنیف کو منظر عام پر لانا ہی وفا راشدی کا ایسا کارنامہ ہے۔ جو اس کو غیر فانی بنانے کے لئے کافی ہے۔ اس کی وجہ وہ محنت اور کاوش ہی نہیں جو اس کو تصنیف کرنے اور ترتیب دینے میں وفا راشدی نے صرف کی بلکہ سب سے اہم سبب اس کتاب کا اس وقت ترتیب پانا اور شائع ہونا ہے جبکہ وفا راشدی کے انفرادی اور قومی ماحول کی قطعی ناسازگاری موجود تھی۔ وفا راشدی نے کئی اچھی اور قابل قدر کتابوں کی تالیف اور تصنیف کے ایک عرصہ بعد جب بنگال میں اردو کا کام شروع کیا تو ان کی دائم المرض رفیقہ حیات زندگی کی آخری منزل پر قدم رکھ چکی تھیں۔ پورے آٹھ گھنٹہ کی سرکاری ملازمت کے بعد مریض بیوی کی دیکھ بھال کرنا اور تین کم سن و معصوم بچوں کا خیال رکھنا وفا راشدی کے فرائض میں داخل تھا اس کی زندگی کا یہ حصہ جس کا سب سے بڑا میں شاہد ہوں اور جس کے دوران "بنگال میں اردو" لکھی گئی انتہائی اذیت ناک تھا۔ میرے نزدیک عام انسان کی یا کسی ادیب کی زندگی

کے یہ کرب واذیت سے بھرپور لمحات ہی خصوصیت کے حامل ہوتے ہیں اس لئے وفا راشدی کے تعارف میں اس دردناک مدت کو ہی زیادہ اہمیت دینا چاہتا ہوں. جبکہ وفا راشدی اپنے آبائی وطن (بنگال) سے ہزاروں میل دور کوٹری (سندھ) کے ایک معمولی قصبہ میں ملازمت کی وجہ تھے. علی الصباح قصبہ سے ۲ میل دور اس کو ملازمت پر جانا پڑتا وہاں سے شام کو واپسی ہوتی اور جائے رہائش میں داخل ہوتے ہی اکثر و بیشتر یہ منظر سامنے ہوتا کہ نوجوان بیوی بیہوش پڑی ہے یا بخار کی شدت سے بھن رہی ہے اور دن بھر کے بھوکے پیاسے معصوم بچے جن کی فطرت اور احساس خودی اور خدا دونوں سے خالی ہیں حسرت و یاس کی تصویر بن بنے بیٹھے ہیں. گھر میں کوئی دوسرا بڑا یا چھوٹا فرد نہیں. اس لڑکھڑا دینے والے عالم میں وفا راشدی کو بیک وقت بچوں کے لئے کھانے اور تیلیوں کا اور رفیق زندگی کے لئے ڈاکٹر دوا یا اسپتال کا بندوبست کرنا پڑتا. جائے رہائش سے ہسپتال ڈاکٹر اور دوائیں ۵ میل دور حیدرآباد میں دستیاب ہو سکتی تھیں جہاں آنے جانے کے لئے بس تانگے اور ریل کا ہر وقت ملنا ضروری نہیں تھا. وفا راشدی پر ایسی جاں بلب مصیبتیں اور روح فرسا ایک دو نہیں گزریں بلکہ کئی برس تک وہ اس ماحول کی صبر آزمائیوں کے خلاف تیر آزمائیوں میں مبتلا رہا. ناقابل یقین حد تک حیرت انگیز امر ہے کہ وفا راشدی کی زندگی کا یہی کٹھن حصہ جو ابتلا اور آزمائشوں کے لحاظ سے مار ڈالنے والا کہا جا سکتا ہے "بنگال میں اردو کی ابتدا اور تکمیل کا زمانہ ہے — کاش مجھے اندازہ ہوتا اور میں احاطۂ تحریر میں لا سکتا کہ وفا راشدی نے اپنی حیات کے اس امتحانی دور میں یہ بیش بہا کتاب کس طرح مکمل کی اور وہ کس دل و دماغ کا مالک ہے جو لامحدود کلفتوں کے مستقل ہجوم میں اتنا بڑا کارنامہ کر سکا جس پُرغم اور الم انگیز زمانے کا میں ذکر کر رہا ہوں اسی زمانہ میں مشرقی بنگال کے اندر موجودہ دنیا کی تیسری سب سے بڑی زبان اردو اقتدار کے بھوکے سیاستدانوں کے ہاتھوں رائفلوں کی باڑھ پر رکھی ہوئی تھی. قضیۂ زبان پر ڈھاکہ فائرنگ سے کچھ عرصہ بعد وفا راشدی نے رنج و اندوہ کے زہر میں بجھا ہوا ایک نشتر اپنے جگر پر کھایا یعنی

اس کی دائم المریض بیوی پاکستان میں پھیلتے پھولتے ہوئے موذی مرض میں تڑپنے اور سسکنے کی تکالیف سے نجات پاکر رہی ملک بقا ہوگئی۔ اب جوانمرگ بیوی کی دائمی جدائی کا ہمیشہ تازہ رہنے والا غم وفا راشدی کا شریک حیات تھا اور وفا راشدی بیک وقت ملازم۔ قومی ادیب اور اپنے بچوں کا ماں اور باپ تھا۔ آزمائشوں اور ابتلاؤں کی بھٹی میں تپ کر انسان کندن بنتا ہے اور ہمارے اہل قلم اور حساس طبع افراد کیلئے تو یہ مقدر ہو چکا ہے۔ پھر وفا راشدی کو ماحول کی ستم رانیوں سے کیسے نجات مل سکتی تھی اور یہ کیسے ممکن تھا کہ خدائے رنج و مسرت اس کو ان انعامات سے نہ نوازتا جو اس قوم کے دانشوروں کے لئے مخصوص کر دیئے گئے ہیں۔ اس قیامت خیز اور حشر انگیز فضا میں جبکہ وفا راشدی کے سانسوں کی آمد و شد بھی اس کے نزدیک پرسش آلام سے کم نہ تھی بنگال میں اردو مکمل ہوئی۔ لیکن صفحہ قرطاس پر خون جگر ٹپکانیوالے وفا راشدی کو اس کد و کاوش کی داد اس طرح دی گئی کہ کوئی پبلشر اس کے اہتمام اشاعت پر اس لئے تیار نہ ہوا کہ وفا راشدی اس کی ناقدر افزائی ہونے کے ڈر سے اس کو مفت اور بلا معاوضہ دینے کو تیار نہ تھا۔ سینما کے گانوں اور ٹارزن کی کہانیوں پر یا عریاں فحش اور بازاری لٹریچر کی اشاعت پر جہازوں لدا کاغذ صرف کر دینے والوں نے یہ تو اعتراف کیا کہ بنگال میں اردو اپنی نوعیت و افادیت کے اعتبار سے نادر و نایاب کتاب ہوگی لیکن کاغذ کی گرانی یا عدم فراہمی کا عذر کر کے مسودے کو شکریئے کے ساتھ واپس کر دیا۔ یہ اور بات ہے کہ وفا راشدی نے ادب و قلم کی آڑ میں ادیب و عالم کا خون چوسنے والی ان جونکوں کو یہ کہہ کر گھر تک پہنچا دیا کہ "اس کی اشاعت کی راہ میں حائل ہونے والی ہر رکاوٹ میں میں برابر کا شریک رہوں گا"۔

بنگال میں اردو کی اشاعت دوسری صبر آزما مصیبت تھی جس سے وفا راشدی کا پالا پڑا۔ اس آخری مرحلہ کو طے کرنے کے لئے عامل لسانیات کے اس جوہر قابل (وفا راشدی) نے ان بزرگان اردو نگر سے رجوع کیا جن کی زندگی اور موت اور اوڑھنا بچھونا اردو ہے اور جنہوں نے نوابوں راجاؤں ریاستوں کے والیوں اور سرمایہ داروں کے بل پر ہی

لیکن درحقیقت اردو کے لئے کافی کچھ کیا ہے اور کر رہے ہیں مگر شاید اس لئے کہ یہ ایک خوددار نوجوان اور ذہین کتابوں کے مصنف و مؤلف کا قابل صدرشک کارنامہ تھا اور اس سے خطرہ تھا کہ ان کی لسانی ٹھیکیداری اور اُس اجارہ داری پر حرف آئے جو وہ اردو کے لئے جہاد کی صورت میں حاصل کئے رہے ہیں انھوں نے بھی باقاعدہ سرمایہ اور ذرائع طباعت واشاعت رکھنے کے باوجود بنگال میں اردو کی اشاعت کی فرمائش کو بہانہ بنا کر ٹال دیا۔ اور بے چارہ وفا راشدی بمنزل مراد سے ملتی اس چھوٹی سی شاہراہ پر ہفتوں تک حوصلہ شکن ٹھوکریں کھاتا پھرا۔ تب کہیں جا کر اس کی اشاعت کا اہتمام ہو سکا۔

اس مختصر سے تعارف کے بعد مجھے اعتراف کرنا چاہیئے کہ میں وفا راشدی اور بنگال میں اردو کے سلسلہ میں ایک زمانے کے چند واقعات لکھ سکا ہوں لیکن میرے نزدیک وفا راشدی کا تعارف عبارت ہے ان ہی چند واقعات سے جو اگر زیر شرح آئیں تو ایک اور ضخیم کتاب وجود میں لائی جا سکتی ہے۔

میں نے اس تعارف کے شروع میں متعدد اخباروں اور ماہناموں کے تراشوں کا ذکر کیا ہے جن میں وفا راشدی پر تبصرے کئے گئے ہیں ان تراشوں کو آپ اسی کتاب میں الگ مطالعہ کر سکتے ہیں۔

آخر میں میں اس اتفاق کے ساتھ وفا راشدی کو مندرجہ ذیل الفاظ میں خراج عقیدت پیش کرتا ہوں کہ بنگال میں اردو پڑھنے والا ہر شخص اس کے مطالعہ کے بعد میری تائید کریگا۔

بنگال میں اردو ایک بنگالی نوجوان وفا راشدی کا وہ لافانی شاہکار ہے جس نے اس عالم فانی سے گزر چکنے والے اور آئندہ گذرنے والے بنگال کے اردو داں اہل قلم کو حیات جاوداں بخش دی ہے۔

بنگال میں اردو پر دوسری دسالمبر عالم کی طرح دن اور رات کی تہیں چڑھتی چلی جائیں گی اور حوادث و واقعات کے انبار لگتے چلے جائیں گے۔ مگر یہ کتاب اپنے مصنف

وفاراشدی کے ساتھ اس وقت تک زندہ وتابندہ رہے گی جب تک کہ اردو زبان کے ساتھ اس کو بھی دورِ جہالت کی طرح دنیا کے حال اور مستقبل سے کالعدم نہ کر دیا جائے۔

وفاراشدی نے بنگال میں اردو جن حالات میں تصنیف کی ان کے لئے اقبالؒ کے الفاظ میں ؎

چیتے کا جگر چاہیئے شاہین کا تجسّس

اور اب

بنگال اور اردو پر جو کچھ لکھا جائے گا وہ بنگال میں اردو کا ماخوذ ہو گا۔ یا پھر بنگال اور اردو پر لکھنے والے کو قلم رکھ دینا پڑے گا۔

اِقبال حامد۔ حیدر آباد سندھ

تقریظ منظوم

(کامل صدیقی بریلوی صدر بزم ریاض الادب حیدرآباد سندھ)

میرے دوست مسٹر وقار راشدی
کہ جن کی ہے وقفِ ادب زندگی

شب و روز ہے شغلِ علم و ادب
مضامین نگاری، کبھی شاعری

بڑا شوخ اندازِ تقریر ہے
غضب کی ہے تحریر میں دلکشی

ہیں کیفِ محبت میں ڈوبے ہوئے
بڑی قابلِ رشک ہے زندگی

ودیعت ہے فطرت میں ذوقِ عمل
عیاں ہے ہر اک بات سے برتری

بلندی پہ رہتی ہے ہر دم نظر
اردو میں بھی ہے بہت پختگی

ترقیٔ اردو کی ہے آرزو
ہیں سرگرم اس کے لئے ہر گھڑی

زباں پر نہ کیوں آئے بے ساختہ
ہو دراصل جو بات انصاف کی

ہے اردو ہی بس ایک ایسی زبان
کہ جس پر ہے سب کی نظر واقعی

بناتی ہے ملّت کے کردار کو
مسلّم ہے اس کی نمائندگی

ادب کے جواہر سے معمور ہے
بڑی ایک دولت ہے تہذیب کی

اسی کے ہے دم سے ادب کی بقا
ادب بھی مٹے گا جو یہ مٹ گئی

زمانے کو روداد سب یاد ہے
نہ بھولے گا ہرگز زمانہ کبھی

نوازا ہے اُردو کو پنجاب نے
عطا کی ہے اس کو نئی زندگی

مگر اس سے بھی کس کو انکار ہے
ہمیشہ دکن پر بھی چھائی رہی

نہیں صرف دلّی ہی اس کا وطن
اودھ نے بھی اس پر فدا جان کی

یہ کہنے میں کو تامّل نہیں
نظر اس پہ بنگال کی بھی رہی

وفا کی یہ تالیف ہے سامنے
ضرورت نہیں اب کسی بحث کی

وضاحت سے سب کچھ کیا ہے رقم
بظاہر نہیں ہے کمی کوئی بھی

مفصل مشاہیر کا ذکر ہے
بتائی ہے حالت ہر اک دور کی

نوازا ہے اُردو کو ہر دور نے
کسی نے کبھی کی نہ پہلو تہی

بالآخر یہ کہنا پڑے گا ہمیں
کہ بنگال میں بھی اشاعت رہی

یہ نسخہ جو پیشِ نظر آج ہے
بڑا قابلِ قدر ہے واقعی

زمانے میں پھر شہرتِ خاص کے
نہ کیوں مستحق ہوں وفا راشدی

حقیقت میں اُردو کا محتاج ہے
ہو مشرقی مسلمان یا مغربی

سخنہائے گفتنی

بارہ سال سے اس تحقیق و کاوش سے دلچسپی رہی ہے کہ سرزمین بنگال (مغربی و مشرقی) کے ان علماء و فضلاء شعراء و ادباء کو دنیائے ادب سے روشناس کراؤں جن کے قومی کارنامے علمی تحریکات اور ادبی خدمات فراموش نہیں کیجا سکتیں۔ چنانچہ وقتاً فوقتاً میں نے اس موضوع پر متعدد مضامین لکھے جو برصغیر ہند و پاک کے معیاری جرائد آج کل دہلی، شاعر آگرہ، فاران کراچی، ترقی بنگلور، روزنامہ جنگ کراچی۔ آفتاب حیدرآباد (سندھ) جام نو کراچی ندیم پٹنہ، جدید اردو کلکتہ اور دلربا ڈھاکہ وغیرہ میں چھپے اور حلقہ ادب میں پسند کیے گئے۔ خدائے بزرگ و برتر کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ میری یہ کوشش اب ”بنگال[1] میں اردو“ کی شکل میں ہدیہ ارباب ذوق ہے۔

میں نے اس کتاب کی ترتیب و تدوین اور تالیف و تحریر میں جس محنت و کاوش اور تحقیق و تفتیش سے کام لیا ہے۔ اس کا اندازہ صرف وہی حضرات لگا سکتے ہیں جو بذات خود اسی قسم کے کام سے دوچار ہوئے ہوں۔ ریگزار سندھ جیسے مقام میں بیٹھ کر بنگال میں اردو جیسی کتاب کی تالیف کوئی آسان کام نہیں تھا۔ اس سلسلے میں جتنی کتابیں جمع کی تھیں اور جو مواد فراہم کیا تھا وہ ڈھاکہ اور کلکتہ میں رہ گیا۔ باوجود کوششوں کے جب بعض مستند کتابیں سندھ اور پنجاب میں دستیاب نہ ہو سکیں تو مجھے ۱۹۵۲ء اور ۱۹۵۴ء میں ڈھاکہ اور کلکتہ کا سفر کرنا پڑا۔ اسی کتاب میں اردو زبان کی خدمات اور ترقی و عروج

---

[1] یہ کتاب دونوں بنگالوں کو محیط ہے۔

کی ابتداء سے لیکر آج تک کے ارتقائی جائزے، ادبی تبصرے اور اہل علم وفضل وارباب شعرو ادب کے حالات زندگی مع نمونۂ کلام نظم ونثر پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

کتاب کے پہلے حصہ میں "بنگال میں اردو کی ابتداء اور اس کی ترقی" پر وضاحت سے بحث کی گئی ہے اس کے بعد بتدریج ارتقاء وترقی کے اعتبار سے مندرجہ ذیل دور قائم کئے گئے ہیں۔

پہلا دور	فورٹ ولیم کالج اور اُس عہد کے دیگر مصنفین	سنہ ۱۷۰۰ء تا سنہ ۱۸۲۵ء
دوسرا دور	بنگال میں اُردو شاعری کا عروج	سنہ ۱۸۲۵ء تا سنہ ۱۸۷۵ء
تیسرا دور	شمس الشیخ اور خالد کا زمانہ	سنہ ۱۸۷۵ء تا سنہ ۱۹۱۰ء
چوتھا دور	آزاد، وحشت، ناطق و آرزو کا زمانہ	سنہ ۱۹۱۰ء تا سنہ ۱۹۵۴ء

علاوہ ازیں دیگر ابواب کے عنوانات یہ ہیں۔

(۱) بنگال میں واجد علی شاہ کا زمانہ اور اُن کے ہمعصر شعراء
(۲) بنگال میں علامہ آرزو لکھنوی اور ان کے تلامذہ
(۳) بنگال کے ہندو ادیب
(۴) بنگال کی اہل قلم خواتین۔
(۵) بنگال میں اُردو صحافت
(۶) ادبی انجمنیں
(۷) بنگال میں اردو تصانیف ومطبوعات

اس حقیقت کا مجھے اعتراف ہے کہ میں نہ شاعر ہوں نہ ادیب، مؤلف ہوں نہ مصنف، سخن سنجی وسخن فہمی سے بہت دور ہوں۔ مزید برآں میرا تعلق شہر کلکتہ (مغربی بنگال) سے ہونے کے باعث میری آبائی زبان بنگالی ہے۔ لیکن خدمت زبان وادب کا شوق میرے دل میں ایام طالب علمی سے کارفرما ہے اور یہی وہ شوق ہے جس کی بناء پر کچھ نہ کچھ برابر لکھتا رہتا

اس کتاب میں ایسے حضرات کا تذکرہ بھی شامل ہے جن کا مقامِ ولادت بنگال نہیں لیکن ان میں سے اکثر و بیشتر ایسے ہیں جنہوں نے بنگال میں تعلیم و تربیت پائی، پروان چڑھے اور وہیں پیوندِ خاک ہوئے اور جو بقیدِ حیات بھی ہیں وہ آج تک یہیں کی فضا میں سانس لے رہے ہیں۔ یہ امر اس لئے قابلِ اعتراض نہ ہوگا کہ میرؔ اور غالبؔ جو دہلوی مشہور ہیں دراصل ان کا وطن آگرہ تھا۔ آخری عمر میں میرؔ لکھنؤ پہنچے اور وہیں کے ہو رہے اور غالبؔ دہلی میں سپردِ لحد ہوئے لیکن تاریخ اردو میں ہمیشہ ان کا تذکرہ اہلِ دہلی کی حیثیت سے آتا ہے۔ اسی طرح نظم طباطبائی کا تذکرہ "دکن میں اردو" میں ملتا ہے حالانکہ وہ لکھنؤ میں پیدا ہوئے۔ کلکتہ میں تعلیم پائی اور ان کی زندگی کا آخری حصہ حیدرآباد دکن میں بسر ہوا۔

میں اپنے حسبِ ذیل محسنوں اور کرم فرماؤں کا تہہ دل سے شکر گزار اور ممنونِ احسان ہوں کہ انھوں نے نہ صرف میری ہر طرح حوصلہ افزائی فرمائی بلکہ میرے استفسارات کا جواب نہایت فراخدلی سے دیا اور بعض امور میں اپنی عدیم الفرصتی کے باوجود میری مدد فرمائی۔

خان بہادر علامہ رضا علی وحشتؔ۔ پروفیسر عباس علی خاں بیخودؔ ایم۔ اے۔ حرمؔ محمد آبادی۔ ماہر القادری ایڈیٹر فاران کراچی۔ سید محمود طرزی۔ سید امیر رضا مظہری الکاظمی ایم۔ اے، بی۔ ٹی۔ پروفیسر اطہر قادری ایم۔ اے۔ پروفیسر عبدالمجید ایم۔ اے۔ آفسر ماہ پوری۔ مولانا عبدالمعبود وعابد داناپوری۔ رشید الزماں خلش بی۔ اے۔ مظہر خیری ایڈیٹر ماہنامہ جام نو کراچی۔ ابراہیم ہوش ایڈیٹر روزنامہ آبشار کلکتہ۔ اقبال حامد ایڈیٹر روزنامہ آفتاب حیدر آباد (سندھ)

"بنگال میں اردو" کا موضوع اس قدر وسیع و ہمہ گیر ہے کہ زیرِ نظر تالیف ہر اعتبار سے مکمل نہیں کہی جا سکتی۔ اور بعض قدیم و جدید انشاء پرداز، افسانہ نگار، ڈرامہ نویس اور دیگر حامیانِ ادب کا تذکرہ رہ گیا ہے۔ بنگال میں بہت سے ایسے

ANGLO INDIAN CHRISTIAN SCHOLARS
بھی گذرے ہیں جن کا تذکرہ اس کتاب میں ضروری تھا۔ لیکن ضخامت کے خیال سے انھیں
نظر انداز کرنا پڑا۔ انشاء اللہ اس کی دوسری جلد (VOLUME II) میں یہ کمی
پوری کر دی جائے گی۔

شاعروں اور ادیبوں کے حالات کی ترتیب میں اختصار کو مدِ نظر رکھا گیا ہے
تذکرے کو زیادہ پھیلا کر ضخامت بڑھنے کی کوشش نہیں کی گئی اس لئے کہ یہ کتاب
ایک تذکرہ ہے تنقید نہیں۔

مجھے اس کتاب میں بہت سی فروگذاشتوں کا اعتراف ہے جن کی اصلاح افسوس
ہے نہیں کی جا سکی امید ہے کہ آپ معاف فرمائیں گے۔

کمترین

وفا راشدی

ترتیب

بنگال میں اُردو کی ابتدا اور اُس کی ترقی

تمہید

بنگال[1] ہمیشہ سے سیاسی و سماجی جدوجہد اور انقلابی تحریکات کا مرکز، علم و ادب کا مخزن، شعر، نغمہ و موسیقی کا سرچشمہ اور رقص و سرود، چنگ و رباب کا گہوارہ رہا ہے۔ جہاں تک اردو کی ترقی و ترویج اور توسیع و اشاعت کا تعلق ہے بنگال کو بھی برصغیر پاک و ہند کے دیگر مشہور صوبوں کی طرح "مرکز اردو" ہونے کا فخر حاصل ہے۔ اس حقیقت کا اعتراف مشہور فرانسیسی عالم و مورخ موسیو گارساں دی تاسی نے اپنے "خطبات" کے صفحہ ۱۱۸ میں حسب ذیل الفاظ میں کیا ہے۔

"اردو کے مرکزیہ شہر ہیں ۔ دہلی ۔ آگرہ ۔ لاہور ۔ میرٹھ ۔ لکھنؤ ۔ بنارس ۔ کانپور مرزاپور ۔ فیض آباد ۔ الٰہ آباد اور ۔ کلکتہ[2] ۔ جہاں ہندوستانی[3] شلی صوبہ جاتی زبان کے بولی جاتی ہے۔"

---

[1] مشرقی و مغربی دونوں بنگال مراد ہے۔ تقسیم کے باعث بنگال میں سیاسی حالات کے زیراثر زبان و ادب میں جو انقلاب رونما ہوا اس کا اندازہ آگے کے صفحات کے مطالعہ سے ہو جائیگا۔ [2] کلکتہ مغربی بنگال کا وہ شہرہ آفاق شہر ہے جسے برصغیر ہند و پاک کے تمام شہروں میں اولیت کا درجہ حاصل ہے [3] بنگال میں اردو کو عموماً ہندوستانی یا دیسی زبان کے نام سے موسوم کیا گیا ہے وہاں کے ۷۵ فیصدی باشندے باوجود صوبائی زبان، بنگالی کے اردو بولتے اور سمجھ لیتے ہیں۔

داستانِ اُردو

آج سے دو ہزار سال قبل ہندوستان کے عوام کی زبان تامل، اوڑیا، تلگو وغیرہ تھی۔ جب آریہ قوم نے وسط ایشیا سے اتر کر شمالی ہند پر حملہ کیا تو وہاں کے قدیم باشندے اپنا وطن اور گھر بار چھوڑ کر جنوبی ہند کی طرف بھاگے اور وہاں آباد ہونے پر مجبور ہوئے۔ آریہ قوم نے فاتح کی حیثیت سے پنجاب اور گنگا کے کنارے پر اپنا تسلط جمالیا۔ یہ ایک تاریخی امر ہے کہ جب کوئی فاتح قوم کسی نئی سلطنت پر برسرِ اقتدار آتی ہے تو وہاں کی مفتوح قوم پر سب سے زیادہ اثر اس کی زبان کا ہوتا ہے۔ آریہ قوم اپنے ساتھ زبان سنسکرت لائی تھی۔ لہذا اس زبان کی اشاعت لازمی امر تھی۔ چونکہ یہ فاتح کی زبان تھی اس لیے تمام بول چال میں نہایت بے تکلفی کے ساتھ استعمال ہوتی تھی۔ فاتح و مفتوح قوموں کی زبانیں ایک دوسرے سے اس طرح مل گئیں کہ سنسکرت اپنا اصل روپ بدلنے لگی۔ اور تھوڑے ہی عرصہ میں ایک نئی شکل میں نمودار ہوئی جس کا نام پراکرت رکھا گیا۔ پھر پراکرت نے خاص و عام میں وہ مقبولیت حاصل کر لی کہ نہ صرف روزمرہ کے امورِ زندگی میں بولی جانے لگی۔ بلکہ عوام کی جھونپڑیوں سے نکل کر امیروں اور حکمرانوں کی مجلسوں تک پہنچ گئی۔ درباروں میں اس نے شرفِ باریابی حاصل کیا اور دفتروں میں رسائی پائی۔ بتدریج اس زبان نے اتنی ترقی کی کہ مستقل ادب کی حیثیت اختیار کر لی صرف یہی نہیں بلکہ علم و مذہب کی متعدد کتابیں بھی پراکرت ادب میں شائع ہوئیں۔

۵۸۷ھ مطابق ۱۱۹۱ء میں جب راجہ بکرماجیت کے سر پر تاج شاہی رکھا گیا تو اس کے عہد میں قدیم سنسکرت کو از سرِ نو جلانے کی کوشش کی گئی اور سرکاری زبان قرار دی گئی۔ لیکن اس وقت تک عوام پراکرت سے اس قدر مانوس ہو چکے تھے کہ سنسکرت کی بجائے پراکرت اُن کا اوڑھنا بچھونا تھی لیکن پراکرت نے بھی تھوڑی عمر پائی اور سنسکرت کی طرح اس کی اصلیت بھی باقی نہ رہی

پھر ایک دور وہ آیا کہ وہ بھاکا یا برج بھاشا کی نقاب اوڑھنے پر مجبور ہو گئی تحقیق و تفتیش سے پتہ چلتا ہے کہ ہندوستان میں مسلمان بادشاہوں کی آمد سے قبل ہندوستان کے شمالی حصہ میں برج بھاشا مروج ہو چکی تھی یہ زبان نہایت شیریں اور پیاری تھی۔

سنہ ۸۰۰ء کے آغاز میں ہندوستان میں مسلمانوں کی فتوحات کا دور شروع ہوتا ہے۔ سنہ ۱۰۰۱ء میں محمود غزنوی نے ہندوستان پر چڑھائیاں کیں اس زمانہ میں بھاشا کو ترقی ہوئی۔ چار سو سال کے بعد شاہان مغلیہ کا دور دورہ ہوا ۱۵۰۵ء میں شہنشاہ بابر نے اپنی سلطنت کی مستحکم بنیاد رکھی مسلمان فاتحوں کی زبان فارسی تھی اور فارسی میں بہت سے ترکی و عربی کے الفاظ بھی شامل تھے۔ سلاطین مغلیہ کے عہد میں بہت سی دوسری قومیں غیر ممالک سے بھی آئی تھیں جن میں یورپ کی پرتگالی اور فرانسیسی و ترکی قابل ذکر ہیں۔ ہندوستان کی قدیم زبان، فاتحوں کی نئی زبان، اور غیر ملکیوں کی متعدد زبانوں کے آپس میں ربط و اختلاط کے علاوہ شاہجہاں کے عہد میں سپاہیوں اور عوام کی بول چال کی وجہ سے فارسی، عربی، ترکی، فرانسیسی اور پرتگالی الفاظ کچھ اس طرح غلط ملط ہوگئے کہ بھاشا کی اصل بالکل ہی بدل گئی اور ایک نئی زبان نے جنم لیا۔ چونکہ ترکی زبان میں اردو کے معنی لشکر کے ہیں اس لئے اس کا نام بھی "اردو" قرار پایا۔ بعد میں اس زبان پر مذہبی تعصب کا کچھ اس طرح رنگ چڑھا کہ یہ صرف مسلمانوں کی زبان قرار دی گئی جو صحیح نہیں ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ شاہی فوج میں ہندو مسلمان سب ہی شامل تھے اور دونوں قوموں کے اتحاد محبت اور میل جول سے اس کی نشو و نما ہوئی لہذا اسے مشترکہ زبان تسلیم کرنا یقیناً بجا ہے۔

اب اردو زبان اس قابل ہو گئی ہے کہ یہ نہ صرف بنگال سے لے کر کشمیر تک

اور سندھ سے لے کر دکن تک بولی اور سمجھی جاتی ہے بلکہ شمالی و جنوبی ہند کی درودیوار سے گذر کر چین و عرب، مصر و عجم، یورپ وامریکہ کی دنیا میں چھا چکی ہے۔ خصوصاً یورپ کی یونیورسٹیوں میں جہاں علوم مشرقیہ کی اعلیٰ تعلیم دی جاتی ہے وہاں اردو زبان کی تعلیم کا بھی ایک ایک شعبہ موجود ہے۔

بنگال میں اردو کی ابتدا

اردو کی ابتدا کے متعلق مختلف صوبوں کے مصنفوں اور ادیبوں نے عموماً اپنے اپنے صوبے میں اُردو کی ابتدا بتلائی ہے۔ کسی نے اس کی ابتدا پنجاب سے کسی نے سندھ اور دکن سے اور کسی نے دوآبہ گنگا، جمنا سے۔ صوبائی جذبے نے حقیقت پر کچھ اس طرح نقاب ڈال رکھا ہے کہ اب تک کسی غیر جانبدار مورخ نے صحیح طور پر اس کی مولد بتلانے میں حق و انصاف سے کام نہیں لیا۔ جہاں تک میری نظر نے کام کیا ہے۔ میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ اُردو کی ابتدا کسی خاص صوبے سے منسوب کرنا ہرگز قرینِ انصاف نہیں۔ شاہجہاں کے عہد میں جب پراکرت کی بیٹی بھاشا نے اردو کا روپ دھارا تو اس زبان کے پرستار دہلی یا شمالی ہند تک محدود نہ تھے بلکہ وہاں کے باشندوں کو شمال و جنوب کے مختلف مقامات میں آمد و رفت کا موقع ملتا رہا اس طرح جہاں وہ لوگ گئے نئی بولی اپنے ہمراہ لیتے گئے اور وہاں اردو زبان پھیلتی گئی۔

اس کی وضاحت میں ناطق لکھنوی کی حسبِ ذیل عبارت بطور سند کافی ہے:۔

" اردو کو ایک ایسا سرچشمہ تصور فرمایئے جو شمالی ہند کے پہاڑوں سے جاری ہوا، دہلی میں آکر دریا بنا، اس دریا سے بیسیوں شاخیں نکلیں ایک بنگال کو گئی، ایک بہار کو، ایک اودھ کو اور ایک گجرات کو یہاں یہ شاخ تمام دکن میں پھیل کر ایک سمندر بن گئی۔ اودھ میں

جو شاخ پہنچی اس کے پانی کو تمام ہندوستان خصوصاً آگرہ اور دہلی کے ادیبوں اور شاعروں نے جمع ہو کر لکھنؤ میں صاف کیا اور صاف کر کے تمام ملک میں نہریں دوڑا دیں۔" (نظم اردو صفہ ۱۵)

آپ نے دیکھا کہ دریائے دہلی کی شاخیں بیک وقت بنگال، بہار، اودھ، گجرات میں پھیل گئیں۔ یہ اور بات ہے کہ دکن میں اس شاخ نے سمندر کی سی حیثیت اختیار کر لی۔ اس سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ بنگال کو بھی اردو کی آماجگاہ ہونے کا شرف اسی وقت سے حاصل ہوا جب اردو کی ابتدا ہوئی اس کی مزید صراحت آگے کی جائے گی۔

بہار کے شعراء میں حضرت شرف الدین احمد یحییٰ منیری کا کلام آٹھویں صدی ہجری میں اور اودھ کے کبیر کا نوی صدی میں ملتا ہے۔ نو آٹھویں صدی ہجری میں بنگال کے شعراء مثلاً مخدوم اشرف جہانگیر وغیرہ کا تذکرہ و نمونۂ کلام بھی دستیاب ہوتا ہے۔ بنگال کے سلطان حسین شاہ جو بہت بڑا علم دوست، سرپرست اور قدردانِ زبان وادب تھا کے زمانے میں اردو اور بنگلہ دونوں ادب نے وہ فروغ پایا کہ اس کی مثال تاریخ میں نہیں ملتی۔ عربی و فارسی کی بیشمار کتابیں اسی کے زمانے میں اردو میں منتقل ہوئیں۔ —— ایام حسین شاہ ۹۰۹ھ میں قلنس مصنف برگاؤنی جو اس کا درباری شاعر تھا اور ایک باکمال صاحبِ علم و فضل، حسین شاہ کی مدح میں کہتا ہے ؎

شاہ حسین آہے بڑا راجہ چتر سنگھاسن ان کو چھاجا

بہاؤ الدین باجن متوفی ۹۱۲ھ اس کا ہم عصر شاعر تھا ؎

باجن جو کسی کے عیب ڈھانکے اُس سے ارجن تھر تھر کانپے

اس قسم کی اردو دسویں صدی کے شعراء مثلاً شیخ عبدالقدوس گنگوہی اور بہاؤ الدین برساوی کے کلام میں بھی عام ہے۔ شیخ جیون، محبوب عالم، مولانا عبدی گیارہویں صدی کے مشہور شعراء گزرے ہیں۔ اس زمانے میں نہ صرف پنجاب و دہلی

ہیں بلکہ بنگال، اودھ، بہار اور ہر شمالی و مشرقی صوبے میں عام طور سے اوسط درجہ کی صاف اور شستہ اردو بولی جاتی تھی اور نظم ہوتی تھی۔

(نظام اردو ص۱۲)

٤؎ بہار میں شیخ شرف الدین احمد یحییٰ منیری متوفی ۷۸۲ھ کے ملفوظات میں نہایت فصیح اردو ہے۔

٥؎ بنگال میں شیخ نور الحق پنڈوی متوفی ۸۱۳ھ کے اردو جملے اور اقوال برابر ملتے ہیں۔ تقریباً اس زمانے میں قطبینی شاعر پنجاب سے یہاں آیا کٹک میں ایک نامعلوم مدت سے نہایت عمدہ اردو بنگال (مرشد آباد) کے ذریعہ پہنچی۔ حضرت مخدوم اشرف جہانگیر کی، اردو سے بنگال، بہار اور اودھ کو شرف حاصل ہوا۔ شیخ شرف الدین احمد یحییٰ منیر بنگال میں بھی رہے۔

٦؎ یعنی پنجاب سے دہلی، دہلی سے دولت آباد، اودھ، بہار، بنگال اور دولت آباد سے گجرات، گجرات سے بیجاپور دکن، اور بنگال سے کٹک اسی طرح تمام صوبوں میں اردو پہونچ گئی۔

٧؎ بنگال میں اردو کی ابتدائی دور کے چند شعراء کے تصنیفات و ملفوظات کا اقتباس ملاحظہ ہو ۔

مخدوم اشرف جہانگیر۔ مولو سمنان، مسکن بنگال سن وفات ۸۰۸ھ

"چھپری کے منہ کھنڈا سمائے۔"

"چھپری" یعنی بکری اور کھنڈ کے معنی چاول کا چورا۔

ان کے ایک منتر میں ہے — "سوا لاکھ سپاری بندھوں" یعنی باندھوں

شیخ نور الحق پنڈوی۔ مولد لاہور، مسکن بنگال سن وفات ۸۱۳ھ

"پیو ند پوچھے پاتری مجھ سہاگن ماؤں"

(نظم اردو حاشیہ ۲۱ تا ۲۷ صفحات ۲۰ - ۲۴ - ۲۲۰)

اٹھارویں صدی عیسوی یعنی برطانوی دورِ حکومت میں بھی مبلغین نے تبلیغی امور میں بھی اردو کو استعمال کیا۔ شمالی و جنوبی ہند کے گرجاؤں مثلاً سردھنہ کی بیگم ثمرو کے گرجا اور آگرہ کے کیتھولک چرچ میں جو اردو بولنے والوں کے صوبے ہیں کے علاوہ صوبہ بنگال کے مختلف شہروں مثلاً کلکتہ، سیرام پور، مرشد آباد وغیرہ کے ہندوستانی گرجاؤں میں بھی اردو زبان کو عیسائی مذہب کی تبلیغ و اشاعت اور توسیع و عبادت کا ذریعہ قرار دیا۔ بعض گرجاؤں میں بنگالی زبان بھی ذریعہ تبلیغ رہی۔

سر چارلس ٹری ویلین Sir Charle trevliyan نے اعلان کیا تھا کہ ۵۰۰ روپے کا انعام اس شخص کو دیا جائے گا جو اردو زبان میں عربی کی سائنس اور موجودہ یورپین سائنس کے باہمی تعلق پر سب سے اچھا مضمون پیش کرے گا۔ چنانچہ ایک مضمون بمبئی سے آیا۔ اور دوسرا کلکتہ سے۔ کلکتہ والا مضمون مولوی عبید اللہ استاد ہوگلی کالج کا تھا۔ اس مضمون کی جانچ کے لئے ولیم میور نے مولوی محمد وحید کو مقرر کیا تھا۔ عبید اللہ کا مضمون بعض لحاظ سے بہتر تھا۔ لہٰذا یہ انعام انھوں نے حاصل کیا۔ یہ ہیں بنگال میں اردو کی ترویج کے ابتدائی حالات۔

(خطبات گارساں دی تاسی صفحہ ۵۶۸)

اردو تقریریں

بنگال میں زبان اردو نہ صرف روزمرہ کی ضروریات و معاملات زندگی کے سلسلہ میں مروج رہی ہے۔ بلکہ عام جلسوں، عدالتوں، انجمنوں، اسکولوں اور کالجوں میں بھی اکثر و بیشتر تقریریں اردو ہی میں ہوتی رہی ہیں جس کا اندازہ ذیل کے چند ایک تاریخی واقعات سے بخوبی ہو جائے گا۔

جب بنگال کے راجہ نندی کے خلاف مقدمہ چلایا گیا تو اس کی ایک تاریخ ۸ جون ۱۷۷۵ء کے دن وکیل نے مجسٹریٹ کے سامنے یہ تجویز پیش کی کہ مدعی و مدعا علیہ کو اجازت دی جائے وہ اپنا اپنا بیان ہندوستانی زبان (اردو) میں دیں کیونکہ یہ ایسی زبان ہے جسے بنگال میں ہر شخص بولتا اور لکھتا ہے۔

صوبۂ بنگال کے لفٹنٹ گورنر سر جے پی گرانٹ جب اپنی میعاد گورنری پوری کرنے کے بعد ہندوستان چھوڑ رہے تھے تو باشندگان کلکتہ کے زیر اہتمام ۶ر اپریل ۱۸۶۲ء کو ایک جلسہ منعقد ہوا جلسے کے صدر راجہ راؤ کانت دیو بہادر تھے اعلیٰ افسران میں انگریز و ہندوستانی سب ہی موجود تھے۔ راجہ کالی کرشن بہادر جیسے اردو کے مشہور شاعر و ادیب بھی شریک تھے۔ گورنر کی خاص ہدایت تھی کہ تقریریں اردو میں ہوں۔ چنانچہ اُس روز کی تمام تقریریں بنگالی یا انگریزی کی بجائے اُردو زبان میں کی گئیں۔ عوام کی طرف سے جو سپاسنامہ پیش کیا گیا وہ بھی اردو زبان میں تھا۔

۱۸۶۴ء میں انجمن "مجلس مذاکرۂ علمیہ اہل اسلام" کی طرف سے زیر صدارت نواب عبداللطیف بہادر مرحوم ایک جلسہ منعقد ہوا۔ سر سید احمد بھی تشریف لائے تھے، انہوں نے علم و حکمت اور قومی خدمات پر ایک مفصل تقریر کی جو اردو میں تھی۔ ان کے علاوہ جن حضرات نے بھی تقریریں کیں۔ اردو میں کیں۔

اخبار انڈین میل مورخہ ۱۴ر مارچ ۱۸۶۴ء میں درج ہے کہ کلکتہ اور مضافات کلکتہ میں نمائش کے سلسلہ میں کلکتہ کی پبلک نے ۱۸۶۴ء میں آنریبل سسلی بیڈن (گورنر بنگال) کی خدمت میں جو ایڈریس پیش کیا تھا۔ وہ اس اعتبار سے زیادہ اہمیت رکھتا ہے کہ وہ اُردو زبان میں تھا نہ کہ انگریزی یا بنگلہ میں

شہزادہ ویلز کی شادی کے موقعہ پر ہندوستان کے تمام شہروں

میں جلسے منعقد ہوئے ۱۸ رمئی کو کلکتہ میں جو جلسہ ہوا اس میں منشی امیر علی نے اردو میں نہایت فصیح و بلیغ تقریر کی۔ مقامی اخباروں میں اس تقریر کا انگریزی میں ترجمہ شائع ہوا۔

(خطبات گارساں دتاسی صفحات ۲۷۳-۲۷۲)

عصر حاضر میں بھی بنگال میں مذہبی، قومی و سیاسی سرگرمیاں ہمیشہ اردو زبان ہی میں ہوتی رہی ہیں۔ مسجدوں میں نماز کے خطبات، جلسوں میں لیڈروں کی تقریریں اردو میں ہوتی رہی ہیں۔ مولانا محمد علی۔ مولانا شوکت علی۔ مولانا ابوالکلام آزاد جیسے نابغۂ روزگار۔ علماء سیاست داں اردو میں تقریر کرتے رہے۔ قائد اعظم محمد علی جناح خود اردو صاف اور صحیح نہیں بول سکتے تھے مگر چونکہ اہل بنگال اردو زبان بولتے اور سمجھ لیتے ہیں۔ لہذا ۱۹۴۶ء میں کلکتہ اور ۱۹۴۸ء میں ڈھاکہ میں انہوں نے جو تقریریں کیں وہ اردو میں تھیں۔ آج بھی سرزمین بنگال میں ایسی قابل قدر و شہرۂ آفاق ہستیاں بقید حیات ہیں جو خالص بنگالی ہونے کے باوجود اُردو زبان میں نہایت فصیح و بلیغ تقریر کرتے ہیں۔ ان میں متحدہ محاذ کے ہر دلعزیز لیڈر حسین شہید سہروردی سابق وزیر اعلیٰ متحدہ بنگال، مولوی ابوالقاسم فضل الحق سابق وزیر اعلیٰ متحدہ بنگال و مشرقی پاکستان۔ خواجہ ناظم الدین سابق گورنر جنرل و وزیر اعظم پاکستان اور مولانا اکرام علیخاں۔ ایڈیٹر روزنامہ آزاد ڈھاکہ کے اسمائے گرامی اہل بنگال کے لئے باعث ناز و افتخار ہیں۔

اُردو مطبوعات

ذیل میں چند مطبوعات کی ایک نامکمل فہرست پیش کی جاتی ہے جو اٹھارویں اور انیسویں صدی میں منظر عام پر آئیں۔ اور جن کی نشر و اشاعت کا فخر بنگال کو حاصل ہے۔ یہ امر بھی قابل ذکر ہے کہ ۱۸۵۹ء میں بنگال کے صرف شہر کلکتہ میں بیس مطبع تھے۔

(نوٹ صفحہ ۱۰ پر ملاحظہ ہو)

الف :- ایک انگریز افسر جس کا نام ایس۔ ڈبلو۔ فیلن تھا (S.W. Fallon) نے اجمیر میں ایک انگریزی ہندوستانی لغت مرتب کی تھی۔ جو ۱۸۵۸ء میں کلکتہ میں چھپی۔

ب :- ۱۸۱۱ء میں میر محمد تقی میر کا "کلیات میر" سب سے پہلے کلکتہ میں طبع ہوا۔

ج :- گلدستۂ نشاط ایک اردو تذکرہ ہے جس کے مؤلف کا نام معلوم نہ ہو سکا ۱۲۵۲ھ یعنی ۱۸۳۶-۷ء میں بمقام کلکتہ شائع ہوا۔

(خطبات گارساں دتاسی ص ۶۸)

د :- مولوی عبداللہ نے ہگلی میں ۱۸۲۹ء میں قرآن شریف کا اور ۱۸۳ء میں "تنبیہ الغافلین" کا اردو ترجمہ چھپوایا۔ اول الذکر کا ترجمہ شاہ عبدالقادر نے اپنے بھائی شاہ عبدالعزیز کی تفسیر قرآن شریف موسوم بہ "تفسیر عزیزی" فارسی زبان سے اردو میں کیا تھا۔ آخرالذکر کا ترجمہ خود مولوی عبداللہ نے مولوی سید احمد شہید کی عربی کتاب سے کیا تھا۔

(تاریخ نظم و نثر اردو ص ۲۳۹)

محمود الرب خالد بنگالی مرحوم نے رسالہ اختر کے افتتاحیہ میں سپرد قلم کیا ہے۔ سہیل یمن، مصنف نصیر الدین حیدر مرحوم کی مشہور تالیف ہے۔ موصوف کی ایک قابل قدر تقریظ فارسی میں "مؤید برہان" میں شامل ہے۔ یہ وہ تقریظ

(نوٹ ص ۹) بنگال کے مطابع کی مکمل فہرست کوئی پچاس سال قبل Selection from The Records of Bengal Govt: کے نام سے چھپی تھی اس کا ایک نسخہ بنگال ایشیاٹک سوسائٹی کلکتہ میں محفوظ ہے۔

ہے جس کی شمولیت سے موید برہان کی قدر و قیمت میں چار چاند لگ گئے۔ یہ کتاب بھی بنگال میں شائع ہوئی۔

دورِ اوّل کی بہترین مثنوی "بکاولی" سید ریحان الدین مرحوم کی تصنیف ہے اور یہ اردو زبان کی شاہکار کہی جا سکتی ہے۔ نصیر الدین حیدر اور سید ریحان الدین دونوں نے سرزمین بنگال میں آنکھیں کھولیں اور وہیں پیوند خاک ہوئے مذکورہ بالا مطبوعات کے علاوہ بے شمار کتابیں بنگال میں شائع ہوئیں جن کی ایک فہرست کتاب کے آخر میں درج کی جائے گی۔

بنگالی اور اردو

بنگالی بحیثیت صوبائی زبان سرزمین بنگال میں صدیوں سے بولی اور سمجھی جاتی ہے یہ دراصل سنسکرت کی کئی شاخوں مثلاً پراکرت، میرٹھی، گجراتی، ہندی، مائی تھلی، آسامی اور اڑیا وغیرہ میں سے ایک ہے یا یوں سمجھ لیجئے کہ سنسکرت کی ایک بگڑی ہوئی شکل ہے، جس کا نام بنگالی، رکھ دیا گیا۔ اس زبان میں بعد میں عربی، فارسی، پرتگالی اور انگریزی وغیرہ کی زبانوں کے الفاظ بھی کثرت سے شامل ہے۔

بنگالی زبان کی ابتدا کے متعلق بھی مختلف کہانیاں ہیں مگر مزید تحقیقات سے پتہ چلتا ہے کہ بدھوں نے اس کی داغ بیل ڈالی گوسینوں کے عہد حکومت میں اس کی توسیع و اشاعت کی راہ میں مذہبی تعصب کا پردہ حائل رہا لیکن سین حکومتوں کے خاتمے کے بعد ہی مسلمان بادشاہوں کے زیر سرپرستی اس نے وہ ترقی اور عروج حاصل کیا کہ پھر اسے کوئی طاقت مٹا نہ سکی۔ اردو کی طرح بنگالی زبان بھی ہندو مسلم اتحاد کی آغوش میں پروان چڑھی اور بتدریج ارتقائی راہوں سے گذر کر اسی منزل پر گامزن ہوئی کہ ایک صوبائی زبان کی حیثیت اختیار کرلی۔

عہد برطانیہ میں عیسائی مبلغوں اور معلموں نے گرجاؤں اور درس گاہوں میں

اردو کے ساتھ ساتھ بنگالی کو بھی ذریعہ تعلیم و تبلیغ قرار دیا۔ فورٹ ولیم کالج اور سیرام پور کے پادریوں کی مدد سے بے شمار عربی و فارسی کتابوں کا بنگالی میں بھی ترجمہ ہوا۔ ان کتابوں میں عربی اور فارسی کے الفاظ اس طرح شامل ہو گئے۔ کہ بعض بعض جملے یا ٹکڑے بالکل اردو کے معلوم ہونے لگے۔ یہاں تک کہ عربی و فارسی نظمیں بھی اکثر و بیشتر بنگالی رسم الخط میں لکھی جانے لگیں۔ انیسویں صدی کے جن مصنفوں نے عربی و فارسی سے بنگالی زبان کو مالا مال کیا ان میں عبد العلیم مصنف ہانیفر لڑائی (جنگِ حنیف)، قصص الانبیاء منور علی کی الماں گلی یحاں شاہی گل بکاؤلی امادت علی وغیرہ مشہور ہیں۔

پندرہویں صدی سے آج تک سرزمین بنگال نے اسی زبان میں وہ شاعر، ادیب، مصور اور فنکار پیدا کئے جن کی تخلیقات گرانمایہ و بلند پایہ سے ایک دنیا حیران اور ایک عالم انگشت بدنداں ہے۔ ایسے فنکاروں میں سے اکثر و بیشتر بنگالی ادب کے ستون مانے جاتے ہیں اور بعض کا شمار دنیا کے بڑے مفکروں اور جلیل القدر فنکاروں میں ہوتا ہے۔ قدیم و جدید فنکاروں میں شیخ فیض اللہ سید شاہ الاوّل، قاضی دولت بہرام خاں، کیقباد، شرف حسین، قاضی نذر السلام، جسیم الدین، غلام مصطفےٰ، فرخ احمد مسلمانوں میں، راجہ رام موہن رائے، رام رام باسو، میکائیل مدھو سدھن، رابندر ناتھ ٹیگور، سرت چندر چیٹرجی۔ غیر مسلموں میں خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔

سپہر ادب کی اس محفل ماہ و انجم میں قاضی نذر الاسلام اور رابندر ناتھ ٹیگور سب سے بلند مقام پر تاباں و درخشاں نظر آتے ہیں۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ ٹیگور نے گیتان جلی لکھ کر نوبل پرائز حاصل کیا۔ اور عالمگیر شہرت کا مالک بنا لیکن قاضی نذر الاسلام اپنی انفرادی خصوصیات کے باعث

ٹیگور سے کہیں زیادہ ممتاز ہے جس کا اعتراف خود ٹیگور نے ان الفاظ میں کیا ہے۔

—— "نذر الاسلام کی بے پناہ انفرادیت و افادیت ٹیگور کی حدِ فکر سے بہت آگے بڑھ چکی ہے"۔

اوپر عرض کیا جا چکا ہے کہ حسین شاہ کے عہدِ حکومت میں بنگالی ادب کے دوش بدوش اردو ادب کو بھی فروغ حاصل ہوا۔ ابتدا سے فارسی بطور شاہی زبان بولی جاتی تھی۔ مذہبی، تعلیمی و تبلیغی معاملات میں عربی زبان استعمال ہوتی تھی امرار اکثر عوام سے رابطہ پیدا کرنے کی غرض سے اردو بولا کرتے تھے ۱۴۰۶ء میں چینی سیاح مہوان جو بنگال آیا تھا اس نے بنگال کے مختلف پہلوؤں پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے زبان کے متعلق کہا تھا۔

"عوام کی زبان بنگالی ہے۔ فارسی بھی بولی جاتی ہے۔" اس کے اس بیان سے میرے اس دعویٰ کی تصدیق ہو جاتی ہے۔ کہ بنگال میں فارسی قدیم زمانے سے رائج رہی۔ حسین شاہ کے زمانے میں عربی و فارسی و اردو کے باہمی ارتباط کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ عرب، مصر، ترکی اور دیگر غیر ممالک کے تاجروں کے علاوہ جو درویش، فقرار، سیاسی اور مذہبی پیشوا بنگال آئے تھے وہ تبلیغی امور کے سلسلہ میں اپنی اپنی زبان میں تقریریں یا گفتگو کرتے تھے جس کی وجہ سے بنگالی، عربی اور فارسی الفاظ کے خلط ملط کے باعث اردو ترقی کرتی گئی۔ بنگال کے دیہاتی گیت میں جو پوتھی، کے نام سے مشہور ہیں۔ عربی و فارسی کے بے شمار الفاظ ملتے ہیں اور وہاں کے غریب مزدور کسان آج بھی ان گیتوں کو جھوم جھوم کر پڑھتے ہیں۔ یہ گیت عہدِ حسین شاہ کی یادگار ہیں۔

علاوہ ازیں بنگالی زبان میں قرآن مجید کے دس سے زائد ترجمے

(سب سے پہلا ترجمہ ایک ہندو ادیب کرشن چندر اسین باشندہ ڈھاکہ نے کیا تھا) رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے سوانح حیات، حدیث شریف، گلستان، بوستاں، پند نامے، حسن وعشق، دیو، جن، پری، وغیرہ کی کہانیوں، قصص الانبیا، یوسف زلیخا، شیریں فرہاد، لیلےٰ مجنوں، الف لیلیٰ، قصہ گل بکاؤلی کی منتقلی اس بات کی سند ہے کہ بنگالی ادیب اپنی مادری زبان (بنگالی) کے علاوہ عربی، فارسی و اردو سے بھی بدرجۂ کمال واقفیت رکھتے تھے۔ گا سان دی تاسی نے اپنے خطبات صفحات ۶۸-۶۷ میں لکھا ہے کہ " بنگال میں ہندو علاوہ اپنی صوبائی زبان بنگلہ کے ہندی میں بھی لکھتے ہیں اور مسلمان صوبہ جات شمالی و مغربی اردو استعمال کرتے ہیں۔ ۱۸۳۱ء کے بعد ایک شخص پریاداس ساکن بنگال نے بھگت مال لکھی اس شخص کا تعلق وشینو کے ایک فرقہ سے ہے جس کا بانی نتھا نند تھا۔"

آج بنگالی زبان پر اردو اس طرح مسلط ہے کہ بنگال میں پچھتر فی صدی باشندے اردو بولتے اور سمجھ لیتے ہیں۔ اور پچاس فی صدی بخوبی لکھ پڑھ لیتے ہیں صرف شہروں ہی میں نہیں بلکہ دیہاتوں اور قصبوں میں بھی عام طور پر بچوں کی تعلیم کی ابتدا گھروں، مسجدوں یا مکتبوں میں عربی اور اردو سے ہوتی ہے۔ اسکولوں اور کالجوں میں فارسی و عربی و اردو کے شعبے موجود ہیں۔ وہ طلباء جو انگریزی کے ساتھ ساتھ اپنی مادری زبان بنگالی کے ذریعہ تعلیم حاصل کرتے ہیں ساتویں جماعت میں انھیں عربی، فارسی اردو میں سے ایک زبان کا انتخاب ضروری ہوتا ہے۔ اور اسی طرح وہ اُردو لکھنے پڑھنے پر قادر ہو جاتے ہیں۔

سنہ ۱۷۰۰ء تا سنہ ۱۸۲۵ء

پہلا دور

فورٹ ولیم کالج کلکتہ اور اس عہد کے دیگر مصنفین

تمہید اٹھارویں صدی عیسوی کے آخر میں جب عہدِ مغلیہ کا ٹمٹماتا ہوا چراغ ہمیشہ کے لئے گل ہو گیا۔ اور انگریزوں کا آفتاب حکومت طلوع ہوا تو اس وقت تک ہندوستان کی دفتری زبان فارسی تھی۔ نئے گورنر جنرل لارڈ وارن ہسٹنگز کے زمانے میں جا بجا اسکول اور کالج قائم کئے گئے۔ جہاں انگریزوں کو فارسی اور ہندوستانیوں کو انگریزی زبان کی تعلیم ضروری قرار دی گئی۔ لیکن ہندوستان کے حالات وکوائف، تہذیب و تمدن، ثقافت، و معاشرت سے

بہرہ ور ہوتے اور وہاں کے تعلیم یافتہ طبقے سے ربط و ارتباط پیدا کرنے کے لئے انگریزوں کے نزدیک اردو سے بہتر کوئی اور زبان اس کام کی صلاحیت نہ رکھتی تھی۔ چنانچہ انھوں نے اردو کو رواج دینے کا فیصلہ کیا۔ ۱۸۳۲ء میں فارسی کی بجائے اردو کو دفتری زبان قرار دیا گیا۔ لارڈ ہیسٹنگز کے بعد جب لارڈ ویلزلی گورنر جنرل کی حیثیت سے ہندوستان آئے تو ان کی زیر نگرانی ۱۰ رمئی ۱۸۰۰ء میں فورٹ ولیم کالج کلکتہ (مغربی بنگال) کی بنیاد ڈالی گئی۔ جہاں سب سے پہلے ایسٹ انڈیا کمپنی کے ملازموں کو فارسی و ہندوستانی دونوں زبانوں میں بہتر سے بہتر تعلیم دی جانے لگی اصل مقصد یہ تھا کہ حکومت کو زبان کے ذریعہ امور سیاست اور تنظیم ملک گیری میں زیادہ سے زیادہ سہولتیں پیدا ہو جائیں۔

فورٹ ولیم کالج کا کام یہیں تک محدود نہ رہا بلکہ اردو کو فروغ دینے کی اسکیم باقاعدہ عمل میں آئی۔ ہندوستان کے طول و عرض سے بڑے بڑے علماء و فضلاء، اور شعراء و ادباء کا عہدۂ تصنیف و تالیف و ترجمہ پر تقرر ہوا۔ انھوں نے وہ بلند پایہ و عدیم المثال کتابیں لکھیں جو آج تک اردو ادب کا گرانقدر سرمایہ تسلیم کی جاتی ہیں۔ ان مصنفوں میں مسلم اور غیر مسلم سب ہی شامل تھے۔ ہندو مصنفوں کا ذکر، ہندو ادیبوں، کے باب میں کیا جائے گا۔

فورٹ ولیم کالج سے پہلے نظم و نثر اردو میں کئی کتابیں موجود تھیں فضلی شاعر نے ۱۷۳۲ء میں محمد شاہ بادشاہ دہلی کے عہد میں 'دہ مجلس، کے نام سے ایک کتاب نثر میں لکھی تھی۔ ۱۱۴۱ھ میں شمس ولی اللہ نے ایک مثنوی 'شہدائے کربلا، کے حالات میں قلمبند کی تھی۔ تحقیق و تفتیش سے پتہ چلتا ہے

کہ وہ مجلس، بھی فضلی کی طبعزاد نہیں ملا حسین واعظ کاشفی کی فارسی کتاب روضۃ الشہدا کا ترجمہ ہے۔ 'وہ مجلس' کی اشاعت کے کچھ دنوں بعد احمد شاہ تاجدار دہلی کے زمانے میں میر محمد حسین کلیم دہلوی نے 'فصوص الحکم' کا اردو میں ترجمہ کیا۔ اسی زمانے میں میر محمد عطا حسین خاں تحسین نے جو اٹاوہ کے رہنے والے تھے ۱۷۹۰ء میں امیر خسرو کی 'چہار درویش' کو فارسی سے اردو میں 'نوطرز مرصع' کے نام سے منتقل کیا۔ یہ امر بھی قابل ذکر ہے کہ عہد نواب شجاع الدولہ میں میر عطا حسین جنرل اسمتھ کے ہمراہ بحیثیت میر منشی عرصہ تک کلکتہ میں مقیم رہے۔ (گل رعنا عبدالحی)

لیکن یہ کتابیں ایسی نہیں تھیں جن کو نثر اردو کا نمونہ کہا جا سکے یا ان کے مترجموں یا مؤلفوں کو موجد زبان اردو قرار دیا جا سکے۔ کیونکہ وہ سب کتابیں زیادہ تر فارسی سے ترجمہ کی گئی تھیں اور مذہبی رنگ اور قصے کہانیوں کے طرز پر لکھی گئی تھیں۔ نہ ان کی عبارت درست اور عام فہم ہوتی تھی نہ صرف و نحو کا خیال رکھا جاتا تھا۔ چنانچہ فورٹ ولیم کالج کے مصنفوں اور ادیبوں نے پرانی روش سے ہٹکر ایک نئی روش اختیار کی۔ ادب اردو میں ایک نیا راستہ نکالا۔ عربی، فارسی و سنسکرت کے غیر مانوس، ثقیل اور بے ترتیب الفاظ کی بجائے آسان، سلیس، سادہ، بے تکلف اور بامحاورہ الفاظ استعمال کئے۔ دراصل جدید نثر نگاری کی ابتدا فورٹ ولیم کالج سے ہوتی ہے اور یہاں کی مطبوعات نثر اردو کا بہترین نمونہ تسلیم کی جاتی ہیں۔

میر امن دہلوی نے میر عطا حسین تحسین کی نوطرز مرصع کو "باغ و بہار" کا نام دے کر نئی شکل اور نئے رنگ میں پیش کیا۔ یہ اردو ادب کا سب سے پہلا طویل افسانہ یا ناول ہے۔ جو ۱۸۰۱ء میں بمقام

کلکتہ لکھا گیا۔ تحسین کے ترجمے میں فارسی و عربی کے غیر مانوس الفاظ بہت تھے، اور زبان نہایت بے رنگ و پُر تکلف معلوم ہوتی تھی۔ میر امن نے اسے بامحاورہ و آسان زبان میں لکھا۔ سلیس اردو اور اندازِ بیان کے لحاظ سے یہ کتاب بے مثال ہے۔ دلی کی ٹکسالی زبان کے حسن و لطافت سے بھی مالا مال ہے۔ ڈاکٹر گلکرسٹ کی ہدایت تھی کہ ساری کتابوں کی تصنیف یا ترجمہ میں زبان کی سادگی صفائی اور سلاست کا خاص خیال رکھا جائے۔ 'باغ و بہار' کے دیباچہ میں میر امن نے حسبِ ذیل وضاحت کی ہے :۔

" خداوندِ نعمت، صاحبِ مروت، نجیبوں کے قدر دان جان گلکرسٹ صاحب نے (کہ ہمیشہ اقبال ان کا زیادہ رہے جب تک گنگا جمنا بہے) لطف سے فرمایا کہ قصے کو ٹھیٹ ہندوستانی گفتگو میں جو اردو کے لوگ ہندو مسلمان، عورت مرد، لڑکے بالے، خاص و عام، آپس میں بولتے چالتے ہیں ترجمہ کرو۔ موافقِ حکم حضور کے میں نے بھی اسی محاورہ سے لکھنا شروع کیا جیسے کوئی باتیں کرتا ہے۔"

یہ زبان کی ایسی خصوصیت ہے جو اس سے پہلے کبھی نظر نہ آئی اور یہ گلکرسٹ کی جدتِ طبع کا نتیجہ ہے۔ 'باغ و بہار' کا قصہ نہایت دلچسپ ہے اُس زمانے کے رسم و رواج، طرز و معاشرت کی تصویر بہ نہایت دلکش انداز میں کھینچی گئی ہے۔ دیباچہ میں سببِ تالیف اور زبانِ اردو کی مختصر تاریخ بھی درج ہے یہ کتاب نہ صرف ہندوستانیوں میں بلکہ اہلِ یورپ میں بھی بیحد مقبول ہوئی اور تقسیمِ ہند تک کلکتہ میں انگریزوں کے نصاب میں شامل رہی۔ اس کی مقبولیت کا اندازہ اس امر سے بھی کیا جا سکتا ہے کہ اس کا ترجمہ دیسی زبان کے علاوہ

انگریزی، فرانسیسی، پرتگالی، لاطینی، زبانوں میں بھی ہوا۔ اور ہر ملک میں بہ نگاہ قدر دیکھی گئی۔

میرامن نے ملا حسین واعظ کاشفی کی تصنیف " اخلاقِ محسنی" کے طرز میں ایک کتاب لکھی جس کا نام، گنج خوبی، رکھا۔ اس کا سن طباعت ۱۸۰۲ء ہے۔ 'گل رعنا' میں لکھا ہے کہ میرامن شعر بھی کہتے تھے اور لطف تخلص کرتے تھے۔

سید محمد حیدر بخش

عربی و فارسی میں غیر معمولی قابلیت رکھتے تھے سب سے پہلی کتاب ۱۸۰۰ء میں 'قصۂ مہر وماہ' کے نام سے لکھی تھی۔ ڈاکٹر گلکرسٹ نے یہ کتاب بہت پسند کی اور ان کی قابلیت کے اعتراف میں اپنے زمرۂ مصنفین میں شامل کیا۔ ۱۸۰۱ء میں 'آرائش محفل' یعنی قصۂ حاتم طائی کو فارسی سے اردو میں منتقل کیا اس کا ترجمہ بنگلہ، ہندی گجراتی، زبانوں میں ہو چکا ہے۔ تیسری قابل قدر تصنیف، طوطا کہانی ہے جس میں ابن نشاطی کی، طوطی نامہ، کو جدید رنگ میں پیش کیا جو دراصل سنسکرت کی ایک کتاب "شوکا پشتتی" سے ماخوذ ہے۔ 'طوطا کہانی' اتنی مقبول ہوئی کہ اس کا ترجمہ کئی زبانوں میں مثلاً ۱۸۷۵ء میں انگریزی میں مسٹر اسمال نے ۱۸۰۶ء میں بنگلہ میں چندن چرن سیرام پوری نے۔ 'طوطا اتہاس' کے نام سے، ہندی میں اننار پرشاد رامانے، غواصی نے دکنی زبان میں (نظم میں)، گجراتی نظم میں سمالا بھٹ نے اور مرہٹی میں کسی نامعلوم نے کیا۔

حیدر بخش نے امیر خسرو کی فارسی مثنوی 'قصۂ لیلیٰ مجنوں' کو اردو جامہ پہنایا۔ 'گل مغفرت' نامی کتاب بھی ان کی تصنیف ہے۔ جس میں اولیاء اللہ کے حالات درج ہیں۔ چہار دانش، کو گلزار دانش، کے نام سے لباس اردو میں ملبوس کیا۔ ۱۲۲۴ھ میں منشی مرزا مہدی کی

نادر نامہ' سے 'تاریخ نادری' کا ترجمہ کیا۔ نظامی کی مشہور مثنوی کے جواب میں 'ہفت پیکر' تصنیف کی۔ یہ تصنیف ۱۸۰۵ء اور ۱۸۰۶ء یعنی دو سال میں مکمل ہوئی۔ ان کتابوں کے علاوہ چند مراثی، ایک دیوان مجموعہ کلیات و حکایات بھی ان کی یادگار سے ہیں۔

میر شیر علی افسوس دہلوی کی ایک تصنیف کا نام بھی 'آرائشِ محفل' ہے۔ اسی میں ہندوستان کے شہر و ملک کے حالات بالتفصیل ملتے ہیں جو پڑھنے سے تعلق رکھتے ہیں۔ یہ منشی سوجن رائے کی 'خلاصتہ التواریخ' کا ماخذ ہے۔ آرائشِ محفل ۱۸۰۴ء میں کلکتہ میں چھپی ۱۸۰۲ء میں 'گلستانِ سعدی' کو 'باغِ اردو' کا نام دے کر اردو زبان و ادب میں روشناس کیا۔ افسوس نے میر بہادر علی کی، 'نثرِ بے نظیر'، منشی عزت اللہ کی 'مذہبِ عشق' اور مولوی محمد اسمٰعیل کی 'بہارِ دانش' کی تصنیف میں بھی مدد دی تھی 'کلیاتِ سودا' بھی افسوس کی تصحیح سے منظر عام پر آیا تھا۔ افسوس کو شاعری سے بھی فطری ذوق تھا۔ ایک دیوان ان کی یادگار ہے ۱۸۰۹ء بمقام کلکتہ انتقال کیا۔

میر بہادر علی حسینی نے میر حسن دہلوی کی مشہور مثنوی 'سحر البیان' یعنی قصۂ بدرِ منیر و بے نظیر، کے نام سے اردو نثر میں ترجمہ کیا یہ کتاب ۱۸۰۲ء اور ۱۸۰۳ء دو سال میں مکمل ہوئی۔ ان کی دوسری کتاب، اخلاقِ ہندی بھی قابلِ ستائش ہے جو ۱۸۰۲ء میں فارسی کی 'مفرح القلوب' سے ترجمہ ہوئی اور وہ فارسی کتاب سنسکرت کی ایک کتاب سے ماخوذ ہے۔ زبان اردو کی صرف و نحو اور فنِ عروض سے متعلق ڈاکٹر گلکرسٹ کے لکھے ہوئے قواعد کا خلاصہ تحریر کیا جو ۱۸۱۶ء

میں کلکتہ میں چھپا۔ شہاب الدین تالش کی تصنیف "تاریخ آسام" کا بھی ترجمہ کیا یہ وہ کتاب ہے جس میں ۱۶۶۲ء کے تاریخی حملہ، آسام کا ذکر ہے جو اورنگ زیب کے مشہور جرنیل نے کیا تھا۔ حسینی نے اس کے ترجمہ کو لرگ کی فرمائش پر کیا تھا۔ علاوہ ازیں، قصۂ لقمان اور "ترجمہ قرآن مجید" بھی ان کی اعانت سے پایۂ تکمیل کو پہنچا۔

مرزا کاظم علی جوان دہلوی

نے کالیداس کی مشہور تصنیف "سنگھاسن بتیسی" یعنی قصۂ شکنتلا کا ۱۸۰۱ء میں برج بھاشا سے اردو میں ترجمہ کیا۔ کالیداس کی اس کتاب کا سب سے پہلا ترجمہ ۱۷۱۶ء میں شہنشاہ فرخ سیر کے سپہ سالار موسیٰ خاں پسر فدائی خاں کے حسب حکم "شاعر نواز بشیر" نے کیا تھا۔ اور یہ ۱۸۰۲ء میں للو لال جی کی نظر ثانی کے بعد کلکتہ میں طبع ہوا۔ قرآن شریف کا اردو ترجمہ سب سے پہلے جوان نے کیا خاندان بہمنی سے متعلق مشہور تاریخ کو بھی اردو میں منتقل کیا۔ بارہ ماسہ "دستور ہند" بھی ان کی ایک قابل قدر تصنیف ہے جس میں ہندوستان کی دو بڑی قوم ہندو اور مسلمانوں کے تہواروں، وہاں کے موسموں، اور فصلوں کا نہایت دلچسپ انداز میں ذکر ہے۔ جوان نے 'خرد افروز' کے نام سے میر و سودا کے کلام کا ایک مجموعہ بھی مرتب کیا۔ ۱۸۱۵ء میں فورٹ ولیم کالج کے تحت جتنے مشاعرے ہوئے۔ ان میں برابر شرکت کی۔

اکرام علی

عربی زبان سے بھی متعدد کتابیں اردو میں منتقل ہوئیں ان میں خاص طور پر قابل ذکر وہ ترجمہ ہے جسے اکرام علی نے ۱۸۱۰ء میں بغداد کے شہرۂ آفاق رسائل 'اخوان الصفا' میں سے ایک رسالہ کا ترجمہ 'اخوان الصفا' کے نام سے کیا۔ یہ انسانیت و حیوانیت کے موازنے کا

اعلیٰ نمونہ ہے۔

مرزا علی لطف نے ۱۸۰۱ء یا ۱۲۱۵ھ میں گلشنِ ہند کے نام سے ایک تذکرہ لکھا۔ جو اصل میں مرزا علی ابراہیم خاں بہاری کی گلزارِ ابراہیم' کا اردو ترجمہ ہے یہ تذکرہ بعد میں مولوی عبد اللہ خاں کے زیر اہتمام حیدر آباد دکن میں شائع ہوا۔ یہ اس لحاظ سے بھی زیادہ دلچسپ ہے کہ مصنف نے اس میں اپنے عہد کے ان شعراء کے حالات لکھے ہیں جن سے وہ ذاتی طور پر واقف تھے یا ملاقات کر چکے تھے۔ لطف فارسی میں شعر کہتے اور اپنے والد ہیجر سے مشورہ سخن کرتے تھے۔

مولوی حفیظ الدین نے ابو الفضل کی 'عیار دانش' کو موسوم بہ خرد افروز کو اردو لباس سے آراستہ کیا۔ یہ سنسکرت زبان کی اس کتاب سے ماخوذ ہے جس کا نام عربی زبان میں 'کلیلہ دمنہ' ہے۔

مظہر علی خاں ولا نے سنگھاسن بتیسی' کی طرح 'بیتال پچیسی' کا سنسکرت سے اردو ادب میں گرانبہا اضافہ کیا۔ اس کے علاوہ حسب ذیل مطبوعات ان کی علمی قابلیت وادبی کاوش کی مظہر ہیں۔

۱:۔ منظوم اردو ترجمہ پند نامہ سعدی۔ مطبوعہ ۱۸۰۲ء۔ مقام اشاعت کلکتہ۔

۲:۔ ہفت گلشن مصنفہ ناصر علیخاں بلگرامی واسطی کا اردو ترجمہ۔ یہ کتاب سات ابواب پر مشتمل ہے۔ اخلاق و عادات، اقوالِ نبوی اور بزرگوں کے احترام، ادب، اطاعت و فرمانبرداری کی باتیں اس میں درج ہیں۔ جو خالص مذہبی رنگ میں ہیں۔ سن طباعت ۱۸۰۱ء۔

۳:- موتی رام کیشر کی برج بھاشا کو اردو زبان میں 'قصہ مادھونل وکام کنڈلا' کے نام سے منتقل کرنے کا سہرا ولا کے سر ہے۔ سنِ تصنیف ۱۸۰۱ء

۴:- عہدِ شیر شاہ کی فارسی تاریخ کا اردو ترجمہ۔

مظہر علی ولا کو شعر و شاعری سے بھی فطری مناسبت تھی اور بڑے بلند پایہ شعر کہتے تھے۔ مرزا جان طپش اور مصحفی سے استفادۂ سخن کیا۔ غزل قصیدہ، رباعی، قطعہ، تمام اصناف سخن میں طبع آزمائی کی۔ ان کا ایک ضخیم دیوان 'دیوانِ ریختہ'، فورٹ ولیم کالج لائبریری میں موجود ہے۔

مولوی امانت اللہ نے ۱۸۱۰ء میں نظم میں 'صرف اردو' تصنیف کی جو زبان اردو کے صرف و نحو سے متعلق ہے۔ ۱۸۰۴ء میں عربی اور اردو زبان میں 'ہدایت الاسلام' تصنیف کی جس کا ترجمہ ڈاکٹر گلکرسٹ نے انگریزی میں کیا۔ ۱۸۰۵ء میں کپتان جیمس مونٹ کے حسب فرمائش 'جامع الاخلاق'، کا اردو ترجمہ "اخلاقِ جلالی" سے کیا۔ شاعری میں شیدا تخلص کرتے تھے۔

خلیل علیخاں اشک نے ۱۸۰۹ء میں واقعاتِ اکبر، کے نام سے 'اکبر نامہ' کا نہایت کامیاب ترجمہ کیا۔

مرزا جان طپش نے اردو محاورات پر ایک کتاب لکھی۔ ۱۸۱۱ء میں ایک طویل مثنوی موسوم بہ 'بہار دانش' تصنیف کی۔ ایک کلیات بھی یادگار ہے۔ انھیں اردو، فارسی، سنسکرت میں بھی مہارت حاصل تھی۔ کلکتہ میں پیدا ہوئے۔ پھر ڈھاکہ (مشرقی پاکستان کی دارالحکومت) میں سکونت اختیار کی۔ ۱۸۲۰ء میں وفات پائی۔ حلقۂ تلامذہ

بہت وسیع تھا جن میں بعض بہت مشہور ہوئے اور بعض شاگردوں میں شمار ہوئے ایسے شاگردوں میں احمد بیگ تپاں، غلام حسین آتش، فرجم علی۔ بیخود عبداللہ جنوں کی خدمات قابل ستائش ہیں۔ ان میں حافظ اکرام علی ضیغم نے سب سے زیادہ شہرت حاصل کی۔ ان کا تذکرہ آگے کے صفحات میں ملاحظہ فرمائیے۔

میر علی

بنگال کے رہنے والے تھے انہوں نے 'مل دی' کا قصہ موسوم بہ 'بہارِ عشق' اردو میں نظم کیا۔ یہ وہ معرکہ آرا کتاب ہے جو 'گل وصنوبر' کے نام سے چھٹی مرتبہ ۱۸۴۷ء بمقام کلکتہ طبع ہوئی۔

سیرام پور مرکز

اسی زمانے میں سیرام پور میں بھی بنگالی اور اردو کا ایک مرکز قائم ہوا جو فورٹ ولیم کالج کے ساتھ ساتھ اردو کی خدمت کر رہا تھا۔ وہاں بھی اہل علم وفضل کا اچھا خاصا گروہ جمع ہو گیا تھا پروفیسر کیری اور لیم وارڈ کی کوششوں سے نادر و مقبول کتابوں کا بنگالی زبان میں ترجمہ ہوا۔ اور ۱۸۳۹ء میں بنگالی زبان پورے صوبہ میں سرکاری زبان تسلیم کی گئی۔ نہ صرف بنگلہ زبان وادب کو ترقی ہوئی بلکہ اردو زبان وادب کو بھی بہت عروج حاصل ہوا۔ اور اس زبان میں بھی نہایت اہم علمی ومذہبی تصانیف کا بیش بہا اضافہ کیا گیا۔ سب سے پہلے قرآن شریف کا ترجمہ یہیں ہوا۔ پادریوں کی مدد سے بائیبل کا نہایت سلیس وشستہ اردو میں بھی ترجمہ ہوا۔ گو اس سے قبل بھی بنجمن شلگز اور کالبرگ کی مساعی جمیلہ سے ۱۷۴۸ء میں ترجمہ ہو چکا تھا۔ لیکن وہ ترجمہ مقبول نہ تھا اس کی وجہ یہ تھی کہ اس کی

لہ خطبات گارساں دی تاسی ص ۱۵۷

عبارت ثقیل اور غیر مانوس الفاظ سے مملو تھی۔ یونانی زبان سے ۱۸۱۴ء میں عہد جدید، کو اردو ادب میں پیش کرنے کا سہرا پادری مارٹن کے سر ہے عہد جدید کا ترجمہ بھی ۱۸۰۵ء میں پہلے کلکتہ میں چھپ چکا تھا اس کے مترجم مرزا محمد فطرت اور فورٹ ولیم کے دیگر اہل قلم تھے۔ ڈاکٹر ہنٹر نے بھی اس پر نظر ثانی کی تھی مگر مارٹن کا ترجمہ سب سے زیادہ کامیاب اور مفید ثابت ہوا۔ بائیبل کا ترجمہ پانچ جلدوں پر مشتمل ہے جس کی تکمیل ۱۸۱۶ء تا ۱۸۰۹ء میں ہوئی۔ بائیبل کے ترجمہ و اشاعت کا اصل مقصد عیسائی مذہب کی تبلیغ تھا۔ اسی سلسلہ میں متعدد رسائل و اخبارات و کتابچے بھی شائع ہوتے رہے لیکن اس تحریک کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہوا کہ اردو زبان و ادب کی کافی ترقی و ترویج ہو گئی اور اس زبان میں بہت سی مفید کتابوں کا اضافہ ہو گیا۔

فورٹ ولیم کالج اور سیرام پور مرکز کے تحت جو کتابیں منظر عام پر آئیں وہ دراصل عربی، فارسی، ہندی و سنسکرت، زبانوں کی زمین منت ہیں، جو آگے چل کر نئی نسلوں کے لئے مشعل راہ و مینارۂ منزل ثابت ہوئیں۔ آج انہیں خدمات کی بدولت اردو اس منزل پر پہنچی ہے کہ دنیا کی ترقی یافتہ زبانوں میں شمار ہونے کی پوری صلاحیت رکھتی ہے۔

ڈاکٹر جان گلکرسٹ

اس عظمت و مقبولیت کے لئے اردو زبان کو اپنے سب سے بڑے محسن و سرپرست ایک انگریز افسر کا احسان مند ہونا چاہیئے۔ جنہوں نے اردو ادب و جدید نثر کی صحیح معنوں میں داغ بیل ڈالی۔ اُن کی زیر نگرانی اردو کی عظیم الشان خدمات

انجام دی گئیں۔ یہ انگریز افسر ڈاکٹر جان گلکرسٹ تھے وہ خود انگریزی کے ایک جلیل القدر ادیب ہونے کے علاوہ فارسی و اردو میں کامل دستگاہ رکھتے تھے۔

جان گلکرسٹ ۱۷۵۹ء میں اسکاٹ لینڈ کے دارالخلافہ اڈنبرا میں پیدا ہوئے۔ اڈنبرا کے جارج ہیریٹ اسکول میں تعلیم پائی۔ ڈاکٹری سے انہیں بچپن سے دلچسپی تھی۔ چنانچہ اپنے ہی شہر کے ایک میڈیکل ہسپتال میں علم طب کی تکمیل کی ۱۷۸۳ء میں ایسٹ انڈیا کمپنی میں بحیثیت ڈاکٹر ملازم ہوئے اور کلکتہ بھیج دیئے گئے۔ گلکرسٹ کو نہ صرف علوم مشرقیہ بلکہ مختلف زبانیں سیکھنے کا بہت شوق تھا۔ کلکتہ میں انہوں نے بیک وقت فارسی، سنسکرت، اردو زبانوں کی تعلیم باقاعدہ حاصل کی۔ دیسی زبان سے ان کی واقفیت کا قصہ بیحد دلچسپ ہے۔ وہ یہ کہ دہلی اور لکھنؤ جیسے مقامات میں جہاں اردو صحیح اور بامحاورہ بولی جاتی ہے۔ دیسی کپڑوں میں ملبوس وہاں کے شہروں اور گلیوں کی سیر کیا کرتے وہاں کے باشندوں سے ربط و ارتباط پیدا کرتے۔ اور ان کی زبان میں گفتگو کرنے کی کوشش کرتے۔ اس طرح اپنی فطری ذہانت اور ذاتی کوششوں سے فارسی و اردو پر قدرت حاصل کرلی تو تصنیف و تالیف کی طرف متوجہ ہوئے۔ لارڈ ویلزلی نے جو اس وقت گورنر جنرل ہند تھے ان کی قابلیت سے بیحد متاثر ہو کر فورٹ ولیم کالج کے عہدۂ افسر اعلیٰ پر فائز کیا۔ کثرت کار کے باعث ان کی صحت خراب رہنے لگی۔ اور پنشن لے کر ۱۸۰۴ء میں ولایت چلے گئے۔ زبانِ اردو سے انھیں اتنی محبت تھی کہ اپنے وطن اڈنبرا میں بھی سول سروس کے امیدواروں کو اس زبان کی تعلیم دیتے رہے۔ ۱۸۱۸ء میں جب ایسٹ انڈیا کمپنی نے

زبان اردو کی تعلیم کی غرض سے اورنٹیل انسٹی ٹیوٹ کا سنگ بنیاد رکھا تو وہاں کے پروفیسر مقرر ہوئے ۱۸۲۵ء میں انسٹی ٹیوٹ بند ہو جانے کے باوجود انگریزوں کو تا دم آخر پرائیویٹ طور پر اردو کی تعلیم دیتے رہے لیکن کسی حال میں بھی بنگال کو نہ بھولے۔ بنگال سے ان کی بے پناہ محبت اور اردو کی بے لوث و ناقابلِ فراموش خدمت کا ثبوت اس امر سے ملتا ہے۔ کہ وفات سے پیشتر انہوں نے اڈنبرا یونیورسٹی کے نام ایک وصیت کی کہ ان کی جائیداد سات ہزار فرانک سالانہ کی آمدنی سے تین وظائف مقرر کئے جائیں اور یہ ہندوستان کے ان طلبار کو اعلیٰ تعلیم کے لئے دیئے جائیں جو بنگال۔ مدراس یا بمبئی کے ہوں۔ گلکرسٹ ۸۲ سال کی عمر میں ۱۸۴۱ء میں بمقام پیرس عالم جاودانی کو سدھارے۔

ڈاکٹر گلکرسٹ کی تصانیف حسبِ ذیل ہے۔

۱:۔ اُردو کی ایک جامع لغت بہت مشہور ہے۔ نو سال میں تیار ہوئی اس کی یہ خصوصیت بھی قابلِ تعریف ہے کہ اس میں نہ صرف الفاظ کے معنی بتائے گئے ہیں بلکہ ہر لفظ کی اصل بھی واضح کی گئی ہے۔

۲:۔ ہندوستانی علم اللسان ۔ انگریزی و اردو الفاظ کے بالتفصیل معنی درج ہیں۔ اردو کی عام بول چال پر بھی عالمانہ تبصرہ ہے۔ قواعدِ زبان اردو کے متعلق بھی ایک مفید مقدمہ شامل ہے۔ اس کا دوسرا ایڈیشن کپتان ٹامس آدیک کی زیرِ نگرانی ترمیم و اضافہ کے بعد اڈنبرا سے شائع ہوا۔

۳:۔ اُردو کی 'صرف و نحو' اور فنِ عروض سے متعلق گلکرسٹ کی زندہ جاوید کتاب ہے۔ اسے دراصل علم البیان کا تیسرا ایڈیشن کہنا

چاہیئے ۔ یہ عہدِ برطانیہ تک فورٹ ولیم کے نصاب میں داخل رہی ۔

۴ ۔ "ہندی کی آسان مشقیں" کے نام سے ایک مختصر سی کتاب لکھی تھی۔ جو کالج کے ابتدائی اُمیدواروں کے لئے بہت مفید ثابت ہوئی اس کی زبان سہل اور آسان ہے ۔

۵ ۔ فارسی زبان کا جدید نظریہ ، ـــ اس میں افعال پر بحث کی گئی ہے اور ان کے صحیح وجائز استعمال بتائے گئے ہیں ۔

۶ ۔ مشرقی زباندان ، ـــ اس میں اردو زبان میں ہتھیاروں کے ناموں کی ایک طویل فہرست ہے شروع میں اُردو زبان کی تاریخ پر ایک مختصر سا مضمون مقدمہ کی شکل میں شامل ہے

۷ ۔ بیاضِ ہندی ، ـــ اس میں فورٹ ولیم کالج کے تمام مصنفین کی تحریروں کے نمونے ہیں ۔ یہ انتخاب ۱۸۰۳ء میں کیا گیا ہے ۔ اس کے مطالعے سے اس زمانے کے مصنفین کے طرزِ تحریر اور خصوصیات نثر کا اندازہ ہوتا ہے ۔

۸ ۔ اجنبیوں کے لئے رہنمائے اردو ـــ انگریزوں کے کم سے کم وقت میں اُردو سیکھنے کے خیال سے یہ کتاب لکھی تھی ۔ سنِ اشاعت ۱۸۰۲ء ہے ۔

۹ ۔ عملی نمونے ، ـــ اُردو الفاظ کے صحیح تلفظ اند ادائیگی پر ایک مختصر لیکن مفید کتابچہ ہے ۔

اُردو کی ترقی و ترویج ، توسیع و اشاعت اور غیر ملکیوں کو تعلیم دینے کی غرض سے گلکرسٹ نے اور بہت سی کتابیں تصنیف کیں جن میں ـــ مکالمات ہندی و عربی ؛ ہندوستانی گو ، اتالیقِ ہندی ، مشرقی حصہ

ہندی، عربی، آئینہ وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

بابائے اُردو ڈاکٹر مولوی عبدالحق فرماتے ہیں ــــ حقیقت یہ ہے کہ اُردو نثر کا نثر کا لکھنا اُسی وقت سے شروع ہوا۔ اور بلا مبالغہ ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ جو احسان ولی نے اُردو نظم پر کیا تھا۔ اس سے زیادہ نہیں تو اسی قدر احسان جان گلکرسٹ نے اُردو نثر پر کیا ہے [۱]

ڈاکٹر گلکرسٹ کے علاوہ اور چند انگریز افسروں کی خدمات بسلسلہ زبان اُردو قابل ستائش ہیں۔ ان میں کپتان روبک، کپتان ٹیلر، ڈاکٹر ہنٹر وغیرہ بھی شکریہ کے مستحق ہیں۔

فورٹ ولیم کالج کی تحریکوں سے ایک انقلاب عظیم رونما ہو گیا ایک طرف ہندوستان کے پڑھے لکھے لوگوں میں ذوقِ شعر و ادب نشوونما پانے لگا تو دوسری طرف اخبارات و رسائل و جرائد منظر عام پر آنے لگے۔ صرف یہی نہیں بلکہ اس زمانے میں اُردو کی ہر دلعزیزی اتنی بڑھ گئی تھی کہ علماء کو اس زبان میں تصنیف و تالیف کا خیال پیدا ہوا۔

حضرت شاہ عبدالقادر نے ۱۲۳۲ھ میں قرآن شریف کا با محاورہ ترجمہ کیا۔ ان کے بھائی شاہ رفیع الدین نے تحت اللفظ ترجمہ کیا۔ ان کے بھتیجے مولانا محمد اسمٰعیل نے اپنی کتاب ردالاشراک، کے باب اول کا ترجمہ اُردو میں تقویۃ الایمان، کے نام سے کیا[۲]۔ مشرقی بنگال میں اُردو زبان کے شیدائی۔ مولوی کرامت علی نے مذہبی و اصلاحی موضوعات پر بیشتر مفید کتابیں لکھیں۔ بنگالی رسم الخط میں اُردو نظمیں

---

[۱] اُردو ادب صفحہ ۵ [۲] گلِ رعنا مصنفہ عبدالحی

بھی عام رواج پاتی گئیں گرچہ وہاں کی تصانیف نظم ونثر میں عربی، فارسی کے الفاظ نظر آتے ہیں لیکن یہ الفاظ وغیرہ مانوس نہیں۔ بلکہ وہی ہیں جو جدید زبان میں رائج ہو چکی ہیں۔

فورٹ ولیم کالج کی خدمات کی بدولت اردو نہ صرف ہندوستان کے گوشہ گوشہ میں پھیل گئی بلکہ دلی اور لکھنؤ کے در و دیوار سے گزر کر بہار و بنگال کی سرسبز و شاداب وادیوں تک پہنچ گئی۔ قیام فورٹ ولیم کالج سے قبل بنگالی میں فارسی و اردو۔ امراؤ شرفا کا اوڑھنا، بچھونا اور ان کی مجلسوں کا طرۂ امتیاز تھیں۔ خصوصاً کلکتہ کے علاوہ نوابان ڈھاکہ و مرشد آباد نے نہ صرف فارسی و اردو ادب کی سرپرستی کی بلکہ اپنے اپنے عہد کے شعرا و ادبا کو حسن عنایت و ثروت سے نوازا۔

محمد فقیہہ دردمند نواب علی وردی خاں کے زمانے میں ایک مشہور بنگالی اردو شاعر کا پتہ چلتا ہے، جن کا نام محمد فقیہہ اور تخلص دردمند تھا۔ دردمند نواب موصوف کے دربار کے ممتاز شاعر تھے۔ مرزا جانان جاناں مظہر سے مشورۂ سخن کیا کرتے تھے ۱۷۴۷ء میں انتقال ہوا۔

نواب سراج الدولہ کو فارسی و اردو سے بڑی دلچسپی تھی وہ خود بھی عالم تھا۔ اور اہل علم کی دل سے قدر کرتا۔ اس نے بھی علم و ادب کی بڑی سرپرستی کی۔ اس کے دربار میں نامی گرامی شعرا کو شرف باریابی حاصل تھا۔ جن میں قدرت اللہ قدرت اور فرحت اللہ فرحت زیادہ مقبول ہوئے۔ یہ شعرائے دہلی و لکھنؤ میر۔ سودا آبرو۔ حاتم۔ ساجی وغیرہ کے ہمعصر تھے۔ جو اٹھارویں صدی کے اوسط میں

گذرے سب کے سب صاحبِ دیوان تھے۔

قدرت مؤلف تاریخ ادب اردو، لکھتے ہیں کہ شاہ قدرت اللہ قدرت شمس الدین فقیر کے برادر عمزاد ے تھے اور اغلب ہے کہ ان سے مشورہ سخن بھی کیا ہے۔ لیکن عبدالغفور خاں نساخ نے متذکرۂ سخن شعراء" میں لکھا ہے کہ قدرت مظہر جان جاناں اور جعفر علی حسرت کے شاگرد تھے۔ قدرت نے خان آرزو کو بھی اپنا کلام دکھایا تھا۔ دہلی کے رہنے والے تھے محمد شاہ کے زمانے میں نوابان مرشد آباد کی قدردانی کی شہرت سنکر مرشد آباد چلے آئے اور یہیں ۱۲۰۵ھ میں پیوند خاک ہوئے۔ یہ عجیب بات ہے کہ میر نے قدرت کو عاجز سخن کا لقب دیا ہے۔ حالانکہ میر حسن ان کے بڑے مداح تھے۔ اور کلام کی یوں توصیف کی ہے۔ "سمند نظمش در میدان فارسی و ہندی چالاک، و چست و تصویر بے نظیر معانیش در استخوان ہندی الفاظ درست بندہ۔ دبیر و یک بار در شاعرہ بہ لکھنؤ دیدہ ام" مرزا علی لطف نے بھی کلام قدرت کے متعلق اچھی رائے کا اظہار کیا ہے۔ قدرت کا نمونۂ کلام حسب ذیل ہے ؎

ہنگامۂ پرہیز دور ع اب ابر آیا
اے بادہ کشو مژدہ کہ پھر ابر تنہ آیا

سینہ اسکا ہی دل اسکا ہی جگر اسکا ہے
تیر بیداد جدھر رخ کرے گھر اس کا ہے

ایک ہی پردے کے گر سمجھو تو یہ سب ہیں الاپ
گر صدائے چنگ ہے یا نغمۂ ناقوس ہے

گر میسر ہو تو کسی عشرت سے کیجے زندگی

اس طرف آوازِ طبل اودھر صدائے کوس ہے
کل تو قدرت پائے خم رکھتے تھے تسبیح ریا
آج رہینِ جام مئے یہ خرقۂ سالوس ہے

قدرت کے زمانے میں اور کئی مشہور مرثیہ گو و مرثیہ خواں شعراء نے بھی محمد شاہ بادشاہ دہلی کے عہد حکومت میں دہلی چھوڑ کر مرشد آباد میں سکونت اختیار کر لی تھی ان میں میر سوز، مرزا ظہور علی خلیق، نواب نوازش محمد خاں وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ یہ لوگ محمد خاں شہاب جنگ کے دامنِ دولت سے وابستہ تھے۔

انشاءؔ اکثر ارباب ذوق اس بات سے ناواقف ہیں کہ میر انشاء اللہ خاں انشاءؔ جیسے ظرافت و مزاح نگار شاعر کی روح نے خاک بنگال کو پسند کیا۔ انشاءؔ مرشد آباد میں پیدا ہوئے وہیں اپنے والد کے زیر نگرانی زیورِ تعلیم و تربیت سے آراستہ ہوئے بچپن سے شعر کہتے تھے۔ شروع میں اپنے والد سے مشورہ کرتے تھے جب سن شعور کو پہنچے تو وہیں سے شاہ عالم بادشاہ دہلی کے دربار سے منسلک ہوئے۔ دلی اجڑنے کے بعد لکھنؤ چلے گئے جہاں وزیر سعادت علی خاں نے نہ صرف ان کو دادِ سخن دی بلکہ بہر طور قدر بھی کی[1]۔

صفدرؔ مرشد آباد میں انشاءؔ کے والد میر ماشاء اللہ خاں شاہی طبیب تھے جو زوال دہلی کے بعد دہلی سے یہاں آ گئے تھے۔ ماشاء اللہ شعر و سخن کے بھی دلدادہ تھے اور ان کا تخلص صفدرؔ تھا۔

---

[1] انشاءؔ — متوفی ۱۲۳۳ھ مطابق ۱۸۱۷ء — نمونۂ کلام اور مفصل حالات کے لئے دیکھو۔ تاریخِ ادب اُردو، صفحہ ۱۷۹ تا صفحہ ۱۹۱

شرف جنگ پلاسی کے بعد مرشد آباد کی محفل لٹ گئی۔ اہل قلم حضرات ادھر اُدھر منتشر ہونے پر مجبور ہوئے۔ میر جعفر کے دور میں نواب میر محمد شرف مشہور شاعر ہوئے۔ شرف کا تعلق شاہی خاندان سے تھا۔ غالباً میر جعفر کے بھتیجے یا بھانجے تھے۔ نواب سید جعفر خاں صوبیدار مرشد آباد سب کے سب تلف ہو گئے۔ ان کی ایک رباعی زبان زدِ عام ہے جو سینہ بہ سینہ چلی آتی ہے۔ یہ رباعی ان کی خوشحال زندگی کی آئینہ دار ہے ؎

قزاق نہیں کہ لوٹ لاتے ہیں ہم — مزدور نہیں کہ روز پاتے ہیں ہم
کیا پوچھتے ہو یارو حقیقت اپنی — اللہ دیتا ہے بیٹھے کھاتے ہیں ہم

زبان کی روانی اسلوب بیان کی صفائی قابل داد ہیں

آشنا نام میر ابیر علی۔ تخلص آشنا۔ میر ببر مرشد آبادی کے بیٹے اور غلام حسین آتش کے شاگرد تھے۔ ان کا ایک قطع ہے ؎

مجھ کو تو بات کل کی نہیں یاد آشنا
کہتے ہیں روزِ حشر کو دینا حساب ہے

ثریا والا جاہ آسماں قدر سید اسد علی مرزا بہادر، امیر الامرا نواب منصور علی خاں بہادر نواب ناظم بنگال کے چشم و چراغ اور نواب ناظم مرشد آباد کے چھوٹے بھائی تھے ابتدائی تعلیم مرشد آباد میں اور اعلیٰ تعلیم انگلستان میں اپنے برادر والا قدر نواب میر حسین علی خاں نواب بہادر۔ مرشد آباد کے ساتھ حاصل کی۔ انگلستان سے واپس آکر مرشد آباد میں کم اور کلکتہ میں زیادہ رہا کرتے تھے۔ کئی ہزار روپے ماہوار وثیقہ وظیفہ سرکار سے ملتا تھا ذوقِ شعر و سخن خداداد تھا نمونۂ کلام یہ ہے ؎

میری وفا اور ان کی جفا ہے عجیب راز — ہے دادرس کوئی نہ کوئی دادخواہ ہے

ٹھوکر لگا کے فہم کہے گر غیرتِ مسیح — لبیک کہہ کے آؤں میں باہر مزار کے

ہزاروں آندھیاں آئیں پسِ مرگ — نہ اُٹھی خاک پر مجھ ناتواں کی

مٹایا اس طرح آخر فلک نے — نہ رکھی خاک تک مجھ بے نشاں کی

یہاں رہتا ہے جلوہ نورِ حق کا — جگہ دل میں نہیں عشق بتاں کی

ان کے علاوہ مرشد آباد میں لاتعداد شعراء، وادباء گذرے ہیں۔ کتاب کی ضخامت کے خیال سے سب کا تذکرہ یہاں ممکن نہیں۔ دوسری والیوم (volume) میں یہ کمی پوری کر دی جائے گی۔

دوسرا دور

۱۸۲۵ء تا ۱۸۷۵ء

بنگال میں اُردو شاعری کا عروج

تمہید "پہلا دور" کے باب سے واضح ہے کہ وہ دور نہ صرف بنگال بلکہ سارے ہندوستان میں نثر کی ترقی کا دور تھا۔ زیر نظر باب میں اس امر پہ روشنی ڈالنے کی کوشش کی جائے گی کہ دور بنگال میں اُردو شاعری کے عروج کا دور تھا یہ وہ زمانہ تھا جب ایک طرف انشاء اللہ خاں انشاء اور قاضی محمد اختر اپنی ضیائے فکر سے دربار اودھ کو منور کر رہے تھے تو دوسری طرف بنگال کی ادبی انجمنیں پُرگو شاعروں کی شمع تخلیقات سے جگمگا رہی تھیں۔ غدر ۱۸۵۷ء کی بادِ خزاں سے دہلی اور لکھنؤ کے گلستان سخن

اُجڑ گئے۔ واجد علی شاہ معزول کر کے لکھنؤ سے کلکتہ لائے گئے تو وہ نہ صرف اپنے ہمراہ لکھنوی مذاق سخن اور سرمایۂ زبان لائے بلکہ اپنے تمام خوشہ چیں اہل علم وفضل کو بھی ساتھ لے آئے جن کے ذوقِ شعر وادب نے مٹیا برج (جو کلکتہ کے قریب ہے) کو لکھنؤ کا ایک نمونہ بنا دیا۔ اس زمانے میں بنگال کے ہر چہار طرف شعر وسخن کا کافی چرچا رہا۔ مرزا نواب خاں۔ داغ دہلی سے اور نظم طباطبائی دکن سے کلکتہ آئے اور وہاں کے مشاعروں اور ادبی محفلوں میں برابر شرکت کی۔ بنگال کے مختلف مقامات میں عبدالغفور خاں نساخ، شہباز، محمود آزاد و محمد آزاد وغیرہ جیسے کاہرینِ سخن و ماہرینِ ادب کے علاوہ اور بہت سے باکمال شعراء و مایۂ ناز انشاء پرداز موجود تھے۔

اختر

انشاء کی طرح اور کئی مقبول شاعروں نے بنگال کی فضائے شعر وادب میں پرورش پائی اور لکھنؤ کی محفل ادب کو حیات جاوداں بخشی ان میں انشاء کے بعد قاضی محمد صادق خاں اختر خلف قاضی محمد لعل کا نام نامی نمایاں طور پر نظر آتا ہے۔

اختر کی جائے پیدائش شہر ہگلی ہے فارسی کے مستند استاد مرزا قتیل کے آگے زانوئے تلمذ تہہ کیا۔ اختر کی فصاحت و بلاغت اور حسن کلام نے غازی الدین حیدر بادشاہ اودھ کو بہت جلد اپنا گرویدہ بنا لیا تھا۔ انہیں درباری شعراء میں ایک درجۂ امتیاز کے ساتھ

لے واجد علی شاہ اور ان کے خوشہ چیں شعراء کے تذکرے ایک علیحدہ باب کی شکل میں آگے پیش کئے جائیں گے۔

ساتھ خطاب "ملک الشعراء" بھی عطا ہوا۔ ان کا کلام دہلی اور لکھنؤ کے جرائد میں عموماً "شاعر بے بدل" کے لقب سے شائع ہوا کرتا تھا۔ مصحفی، جرأت اور انشاء وغیرہ کے ہمراہ اکثر مشاعروں میں شرکت کی۔

علامہ رضا علی وحشتؔ کلکتوی اپنے ایک قابل قدر مقالہ میں رقم طراز ہیں ؎

" اختر بیشتر فارسی کہتے تھے اور اُردو میں بھی شعر روانی کے ساتھ موزوں کرتے تھے۔ ناسخؔ و آتشؔ اور ان کے شاگردوں کا زمانہ تھا۔ اور دہلی میں ذوقؔ و غالبؔ و مومنؔ۔ ان کے ہمعصر تھے۔ اختر نے ایک تذکرہ موسوم بہ آفتاب عالمتاب[۱] لکھا تھا۔ جس میں پانچ ہزار فارسی شعراء کا حال اور کلام ملتا ہے اور جس سے نواب صدیق حسن خاں کو شمع انجمن[۲]" کی تالیف میں بڑی مدد ملی تھی۔ غازی الدین حیدر کی توصیف میں ایک کتاب موسوم بہ مطلع العلوم ومجمع الفنون" کی تالیفات سے ہے۔ یہ فارسی میں لکھی گئی تھی اور منشی نول کشور نے اس کا اُردو ترجمہ شائع کیا تھا[۳]۔ گلدستہ محبت[۴] جس میں گورنر جنرل لارڈ ہسٹنگز اور غازی الدین حیدر کی ملاقات کا حال ہے۔" مثنوی سراپا سوز" صبح صادق خودنوشتہ سوانح عمری۔ دیوان فارسی۔ بہار بےخزاں، بہار اقبال، گنج نیرنگ

---

[۱] واجد علی شاہ اور ان کے خوشہ چیں شعراء کے تذکرے ایک علیحدہ باب کی شکل میں آگے پیش کئے جائیں گے۔

[۲] تذکرہ شمع انجمن، مرتبہ نواب صدیق حسن خاں (۱۲۹۲ھ)

[۳] تذکرہ سخن شعراء، مرتبہ مولوی عبدالغفور خاں۔ نساخ۔ مطبوعہ لکھنؤ ۱۸۷۵ء

[۴] تاریخ ادب اردو مصنفہ رام بابو سکسینہ۔ مطبوعہ منشی نول کشور لکھنؤ۔

ہفت اختر اور ایک دیوان ریختہ ان کی یادگار ہیں۔

قاضی اختر کو واجد علی شاہ جانِ عالم پیا اختر کے استادِ سخن ہونے کا فخر حاصل تھا۔ یہ امر بھی دلچسپ ہے کہ واجد علی شاہ نے انعام واکرام کے عوض یہ تخلص اختر قاضی اختر سے خرید لیا تھا[1]۔ جب واجد علی شاہ ان سے ناراض ہو گئے تو وہ لکھنؤ چھوڑ کر اٹاوہ چلے گئے اور وہیں ۱۸۵۸ء میں وفات پائی[2]۔

کسی زمانے میں ان کا مندرجہ ذیل قطعہ زبان زد خاص و عام تھا۔ جس سے اختر کا کمالِ فن بخوبی ظاہر ہوتا ہے ملاحظہ ہو ؎

کل شیخ بن کے مجتہد عصر ساقیا | دکھلا کے سبز باغ عذاب و ثواب کا
کہنے لگا زراہ تبختر مجھے بہ طنز | معلوم ہوگا حشر میں پینا شراب کا
میں نے کہا کہ میں بھی ہوں یہ خوب جانتا | پر کیا کروں کہ ہے ابھی عالم شباب کا
گستاخی ہو معاف تو اک عرض میں کروں | لیکن نہ کیجئے مجھے مورد عتاب کا
مئے اور کنج باغ ہو ساقی ہو ماہوش | اور واں کوئی مخل نہ ہو باعث حجاب کا
گردن میں ہاتھ ڈال کے وہ شوخ بیحجاب | دے ذائقہ زباں کو دہن کے لعاب کا
منت سے پھر کہے کہ ہمارا لہو پیئے | گرمی نہ جائے جلد یہ پیالہ شراب کا
اس وقت بھی سلام کروں قبلہ آپ کو | گر کچھ بھی خوف کیجئے روز حساب کا
اور امتحان بغیر تو یہ آپ کا غلام | قائل نہیں ہے قبلہ کسی شیخ و شاب کا

کلام کا رنگ وہی ہے جو ان کے لکھنؤ اور دہلی کے معاصرین کا تھا۔

---

[1] تاریخ ادب اردو

[2] تذکرہ گل رعنا اور خمخانہ جاوید میں لکھا ہے کہ لکھنؤ میں رحلت کی اور تاریخ ادب اردو میں درج ہے کہ اٹاوہ میں۔ حقیقت کا علم اللہ کو ہے۔

اخترؔ کی کچھ غزلیات اُردو، فارسی کا ایک قلمی نسخہ علامہ وحشتؔ کے پاس موجود ہے۔

لکھنؤ اور غازی الدین حیدر کے زمانے کا لکھنؤ غریب سے کیسے چھوڑا جاسکتا تھا۔ کہتے ہیں ؎

چاہتے ہیں جائیں بنگالے کو ہم دامن فشاں

پر کریں کیا لکھنؤ کی خاک دامنگیر ہے

کلام فارسی ؎

آہ جانسوز کہ در سینۂ من شعلہ کش است
این چراغیست ببالین حزار دل من

خط برآورد وی وز لیشانی ہنوز
پیشوائے سادہ رویانی ہنوز

گرچہ از خط صبح حسنت شام شد
جانِ اخترؔ ماہ تابانی ہنوز

ضیغمؔ:

غدر کے بعد جن شعراء نے بنگال میں شہرت حاصل کی ان میں سید حافظ اکرام احمد ضیغمؔ سب سے زیادہ نامور استاد گذرے ہیں۔ پیشہ طبابت تھا۔ شعر و شاعری سے فطری ذوق رکھتے تھے۔ شعرائے دہلی و لکھنؤ میں میرؔ، سوداؔ و نسیمؔ کے ہمعصر تھے۔ بنگال کے معاصرین میں خواجہ عبدالرحیم صباؔ، خواجہ فیض الدین شائقؔ تلمیذ غالبؔ وغیرہ جیسے سخن سنج موجود تھے۔ مرزا جان تپشؔ کی طرح وہ بھی آخری عمر میں رام پور سے ڈھاکہ تشریف لے گئے اور وہیں سپرد خاک ہوئے۔ ضیغمؔ نے شاہ رؤف احمد رافتؔ سرہندی شاگرد جرأتؔ سے اکتساب فن کیا۔

ضیغمؔ اردو فارسی کے صاحب دیوان تھے۔ مختلف صاحت سخن میں طبع آزمائی کی مگر ریختہ و مرثیہ میں خاص ملکہ تھا۔ بنگال میں انھوں نے بہت سے لائق و فائق شاگرد چھوڑے۔ جن میں عبدالغفور خاں بہادر نساخؔ، سید محمود آزادؔ، عبداللہ شفقؔ

حکیم اشرف علی مست۔ خواجہ عبدالغفار آختر۔ حافظ رشید الٰہی وحشت، راجہ فہمی نی متر ارمان سپہر ادب کے درخشند ستارے بن کر چمکے۔ محمود آزاد نے ایک شعر میں ضیغم کی مکمل تعریف کی ہے ؎

کامل فن سخن ماہر اصناف کلام
کوئی ضیغم سا نظر مجھ کو نہ استاد آیا

نساخ

غدر یعنی ۱۸۵۷ء کے بعد لارڈ میکالے کی تجویز سے انگریزی زبان کو عربی و فارسی کی جگہ ترجیح دی جانے لگی۔ مسلمانوں کی انتہائی بدبختی تھی کہ انھوں نے پہلے پہل اسی سات سمندر پار کی زبان کو اپنانے میں "اسلام کو خطرے میں" محسوس کیا۔ کسی نے اس کے سیکھنے والوں پر کفر کا فتویٰ صادر کیا کسی نے اس کے حامیوں کو "دشمن اسلام" قرار دیا۔ کسی نے روائتی توہین تصور کیا اور جانے مذہب کی آڑ میں کیا کیا گل ہائے رنگا رنگ کھلائے گئے۔ آفریں ہے اُن دور اندیش، ذی فہم و باہمت نفوس پر جنھوں نے انگریزی کی اہمیت کا اندازہ کرتے ہوئے اسے سیکھا۔ عوام میں اس اجنبی و غیر مانوس زبان کی توسیع و اشاعت اور تعلیمی بیداری کی کوششیں کیں ایسی بلند ہستیوں میں سرسید احمد خاں کی طرح بنگال میں حاجی محمد محسن، نواب عبداللطیف اور ان کے بھائی خان بہادر ابو محمد عبدالغفور خاں نساخ کے نام بڑی عزت اور احترام سے لئے جاتے ہیں۔ صرف انگریزی ہی نہیں بلکہ اردو کی ترقی میں بھی نساخ کا بہت کچھ حصہ ہے۔ اُردو سے ان کی بے پناہ محبت اور غیر معمولی خدمات ناقابل فراموش ہیں۔

نساخ کے والد ماجد قاضی فقیر محمد کلکتہ ہائی کورٹ کے سربرآوردہ وکیل تھے علم و ادب سے بھی خاص شغف تھا۔ ان کی ایک "تاریخ فارسی زبان میں موسوم بہ جامع التواریخ" ۱۸۹۷ء میں نول کشور پریس لکھنؤ سے شائع ہو چکی ہے۔

نساخ کی پیدائش مشرقی بنگال کے ایک ضلع فرید پور میں ۱۲۴۹ھ میں ہوئی۔ شیفتہ، نیّر، مجروح، حالی، داغ، امیر وغیرہ کے ہمعصر اور حافظ نسیم کے قابلِ فخر شاگرد تھے۔ ڈپٹی مجسٹریٹ کی حیثیت سے ان کا تبادلہ بہار اور بنگال کے مختلف مقامات میں ہوتا رہا۔ جہاں کہیں بھی گئے، شاعری وصلاحیت کا لوہا منوایا اور دو چار شاعر بنا آئے۔

جب ان کا پہلا دیوان "دفترِ بے مثال" زیورِ اشاعت سے آراستہ ہو کر منظرِ عام پر آیا تو غالب نے اپنے حسبِ ذیل مکتوب میں تحسین آمیز خیالات کا اظہار کیا تھا۔

"جناب مولوی قبلہ، یہ درویش گوشہ نشین جو موسوم بہ اسد اللہ اور متخلص بہ غالب ہے۔ مکرمتِ حال کا شاکر اور آئندہ افزائش عنایت کا طالب ہے۔ دفتر بے مثال، کو عطیہ کبریٰ اور موہبت عظمیٰ سمجھ کر یاد آوری کا احسان مانا۔ پہلے اس قدر افزائش کا شکریہ ادا کرتا ہوں کہ حضرت نے اس ہیچمداں کو قابلِ خطاب اور لائقِ عطائے خطاب جانا۔ میں دروغ گو نہیں۔ خوشامد میری خو نہیں۔ دیوانِ فیض عنوان اسم با مسمیٰ ہے۔ "دفتر بے مثال" اس کا نام بجا ہے۔ الفاظ متعین، خیال بلند، مضمون عمدہ، بندش دل پسند، ہم فقیر لوگ اعلانِ کلمۃ الحق میں بے باک و گستاخ ہیں۔ شیخ امام بخش طرزِ جدید کے موجد اور پرانی ناہموار روشوں کے ناسخ تھے۔ آپ اُن سے بڑھ کر بصیغہ، مبالغہ نساخ ہیں۔ تم دانۂ رموزِ اردو زبان ہو۔ سرمایۂ نازشِ قلم رو ہندوستان ہو۔"

ایک طرف مرزا غالب کے زبان و بیان سے لطف اندوز ہوئیے تو دوسری طرف ایک بنگالی کی شاعرانہ عظمت کا اندازہ فرمائیے۔

متعدد تالیفات و تصانیف نساخ کی یادگار ہیں۔ ان میں سب سے زیادہ مشہور، زندہ جاوید اور قابلِ قدر ان کا تذکرہ موسوم بہ "تذکرۂ سخنِ شعرار" ہے جو ۱۲۹۱ھ لکھنؤ سے شائع ہوا تھا۔ یہ تذکرہ اس اعتبار سے خاص طور پر توجہ طلب ہے کہ اس میں ان کے معاصرین کا بھی ذکر ہے اور بنگالہ کے اکثر شعرار دادبار جن کا ذکر کہیں نہیں ملتا اس میں شامل کئے گئے ہیں۔ ایک تذکرہ اپنے ہمعصر فارسی گو شعرار کا بھی ترتیب دیا تھا۔ جس کا نام "تذکرۃ المعاصرین" ہے اُس تذکرے سے کچھ دلچسپ باتیں معلوم ہوئیں ایک یہ کہ سر سیّد احمد خاں فارسی شعر کہتے تھے اور آسی تخلص کرتے تھے۔ سر سید کے فارسی اشعار کے علاوہ داغ دہلوی، امیر لکھنوی کے فارسی کلام کا نمونہ بھی اس میں ملتا ہے۔ نساخ کی تالیفات میں ایک مجموعہ مختلف شعرار کے فارسی کلام کا ہے اس کا نام "قندِ پارسی" ہے۔ ایک تصنیف موسوم بہ "گنجِ تواریخ" ہے اس میں لوگوں کی تاریخ وفات بشکل قطعہ یا ادبیات لکھی گئی ہے۔ ابتدائے سن ہجری سے لے کر ۱۲۹۰ھ تک ان کی اُردو غزلیات چار دیوان پر مشتمل ہیں۔ دیوان چہارم مسمّیٰ بہ نام تاریخی "ارمغانی" (۱۳۰۲ھ) ہے اس دیوان کے سر ورق پر ان کی دیگر تصانیف کے نام مرقوم ہیں جیسے زبانِ ریختہ، قطعہ منتخب، انتخابِ نقص، منظرِ معار، چشمۂ فیض، شاہد عشرت، مرغوب دل، اشعار نساخ، ارمغاں، ترانۂ خامہ، باغِ فکر مصروف بہ قطعات نساخ، سوانح عمری نساخ وغیرہ۔ طومار اغلاط، میں لکھنؤ کے چند مشہور شعرار مثلاً آتش، ناسخ، امیر، وزیر، صبا، منیر وغیرہم کے کلام پر اعتراضات ہیں اعتراض اپنی جگہ پر مستحکم ہیں۔ آتش کا شعر ہے ؎

قالب بیجان کے منظور پیراہن میں ہے
یار کی تصویر کھنچواؤں تو کہتا ہے وہ شوخ

لہ مقالاتِ وحشت از خان بہادر رضا علی وحشت

یار اور شوخ سے اگر ایک ہی شخص مراد ہے تو دو لفظ لانے کی ضرورت نہ تھی بس اس سے عجز طبیعت کا حال کھلتا ہے۔

اعتراضات بر کلام ناسخ۔

جب دہان یار دیکھا گور تنگ آئی نظر
نار دوزخ یاد آئے زلف پیچاں دیکھ کر

دہان یار گور تنگ، کیا عمدہ تشبیہ ہے!

اعتراضات بر کلام امیر لکھنوی

ڈری یہ رات کو میری سیاہ بختی کی ظلمت سے
دعائے نور پڑھ کر اپنے اوپر شمع نے دم کی

دعائے نور کیا؟ شاید سورۂ نور کو بسبب ردیف دکی، دعائے نور کہا ہے۔ وہ رے ایجاد!

اس چمن میں طائر کم پر اگر ہوں میں تو کیا
دور ہے صیاد ابھی اور آشیاں نزدیک ہے

لفظ 'کم پر' نے مرغ فصاحت کے پر لگا دیئے کہ اڑ بھاگا۔

بزرگوں کا کہنا ہے کہ نساخ نے اپنا یہ تخلص ناسخ لکھنوی کے جواب میں اختیار کیا تھا۔ اس کی وجہ یہ بتائی جاتی ہے۔ چونکہ اہل لکھنؤ کا اپنے زبان و کلام پر زعم انھیں پسند نہ تھا اور ان کے کلام پر لکھنؤ والوں نے بہت سے اعتراضات کیے تھے نساخ نے بھی اس کے جواب میں اہل لکھنؤ کے کلام پر اعتراضات کیے۔ لیکن یہ سلسلہ بند نہ ہوا بلکہ نساخ کے اعتراضات کے بعد بھی ان کے کلام پر اعتراضات کی بوچھار ہوتی رہی۔ ایک بزرگ آغا علی نام ساکن لکھنؤ مدرس مدرسۂ عالیہ محمود آباد نے نساخ کی بری طرح خبر لی ان کے

اعتراضات کی ایک مثال ان کی کتاب مسمٰی بہ "تبعیض" سے نقل کرتا ہوں۔

دھواں ہے زلف اور شعلہ ہے عارض
ترا قد رداں شمع رواں ہے

یہ سرو رواں پر قیاس فرماکر شمع رواں۔ ایجاد فرمائی گئی ہے اس وقت تک تو شعرا رسے زبان اُردو نے شمع رواں کو تکلیف نہیں دی تھی۔

نسّاخ نے میرزا دبیر کے کلام پر بھی تنقیدی نظر ڈالی جو اپنی جگہ دلچسپ اور مفید ہے۔

میر انیس کے متعلق یہاں تک کہدیا کہ سوائے مرثیہ کے اور کسی صنف سخن میں مطلق دخل نہیں رکھتے بلکہ مرثیہ بھی ان کا ایسا نہیں کہ عیوب شاعری سے پاک ہو۔"

نسّاخ نے فریدالدین عطار کے 'پندنامہ' کا بھی اردو میں ترجمہ کیا تھا۔ قاآنی ہند ذوق کے کلام کا جواب بھی لکھا ہے۔

نسّاخ امام الشعرار کے لقب سے یاد کیے جاتے تھے ان کے چند اشعار جو تھے دیوان" ارمغانی" سے پیش کیے جاتے ہیں۔ بقول علامہ وحشتؔ نسّاخ دماغ داآتش کے رنگ میں ڈوبے ہوئے تھے۔ اسے رنگِ قدیم کہا جاسکتا ہے ؎

کی صفت ان کی بے دہانی کی | دھوم ہے بے ہبری نکتہ دانی کی
حسرت عمر رفتہ ہے دل میں | اب کہاں شوخیاں جوانی کی
ساری باتیں تھیں میرے ہی دم تک | اب کہاں دھوم لن ترانی کی

کوئی اعجاز ہے یا ہے یہ کرامت تیری
بن گئی لب پہ مرے شکر شکایت تیری

تو نے رسوائی مگر نام اسی کا رکھا

میرے باعث جو ہوئی خلق میں شہرت تیری
مر گئے غالب و آزردہ رہا ہے اک تو
ذاتِ نساخ بہت اب ہے غنیمت تیری
نادان تھا دل اپنا جو تجھ پہ آ گیا تھا
تو بے وفا ہے یہ تو میں خوب جانتا تھا

نساخ کے زمانے میں بنگال کے مختلف مقامات میں واجد علی شاہ اختر اور ان کے خوشہ چیں کے علاوہ اور کئی باکمال شعراء موجود تھے۔ طوطا کہانی کے مشہور مصنف سید محمد حیدر بخش حیدری، اور رمز چاٹگام شاہد فرید پور، منظوم مالاہ، اعظم و معراج کلکتہ کے رہنے والے تھے ان میں سب سے زیادہ مشہور شاعر شاہ الفت حسین فریاد تھے۔ ان کا وطن مرشد آباد تھا۔ مگر کلکتہ میں سکونت پذیر تھے۔ تاریخ نادری ان کی نادر تصنیف ہے۔ ان کے شاگردوں میں عبدالودود اوحد ایک بلند پایہ سخن سنج تھے۔ وفات کے بعد دیوان طبع ہوا جس کی تعریفیں امیر مینائی اور داغ دہلوی جیسے استادانِ فن نے کیں۔ اوحد کو شاعرانہ طبیعت قدرت کی طرف سے ورثے میں ملی تھی۔ ان کے والد متخلص بہ واحد فارسی کے خوش فکر شاعر تھے ان کے خاندان کے دو افراد شاداں اور ناطق چوٹی کے شاعروں میں شمار کئے جاتے تھے۔

نساخ کے شاگردوں کا حلقہ کافی وسیع تھا جن میں شمس، آزاد، نسخ، حمید، ضیا، مرحبا، فوق، موج، سنور، مسرور، طالب الانچی رام امرتسری مصطفےٰ، حیدر، وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ ان کا شمار انیسویں صدی کے اچھے شاعروں میں ہوتا ہے۔

کامل نصیر الدین ہاشمی نے "مدراس میں اُردو" صفحہ ۱۸ میں کامل کے متعلق یہ چند سطریں لکھی ہیں۔ "غلام کبریا نام اور کامل تخلص ۱۲۱۱ھ میں بنگال سے مدراس آئے اور یہاں اقامت کرلی۔ عربی فارسی اور اُردو میں شعر کہا کرتے طوطی بنگال کے لقب سے مشہور تھے۔

احمد نام آقا احمد علی تخلص احمد۔ ان کے جدِ امجد ایران کے باشندے تھے دادا آغا عبدالعلی خوش نویس خطاط تھے۔ پدر بزرگوار شجاعت علی جن کا تاریخی نام منظر علی تھا۔ ۱۰ر شوال ۱۲۵۵ھ میں ڈھاکہ میں پیدا ہوئے شعر کہتے تھے۔ اسد اللہ کوکب جیسے عالم و فاضل شاعر کے دامنِ فیض سے وابستہ تھے۔

آقا احمد علی فارسی و اُردو کے ایک بلند پایہ شاعر اور اپنے عہد کے چوٹی کے انشاء پرداز تھے۔ ان کی قابلیت کا اعتراف غالب جیسے یگانۂ روزگار سخنور نے کیا ہے۔ شعر گوئی سے زیادہ شعر فہمی کے قدر دان تھے۔ ۱۸۶۲ء میں وطن ڈھاکہ چھوڑ کر کلکتہ چلے گئے۔ اور وہاں فارسی و عربی علوم و فنون کی ایک درس گاہ موسوم بہ "مدرسہ احمدیہ" قائم کی۔

تصانیف حسب ذیل ہیں۔

۱:۔ موید برہان۔ ۱۸۶۵ء میں طبع ہوئی۔ ۱۸۶۲ء میں غالب کے رسالہ "برہان قاطع" پر جو اعتراضات کئے گئے تھے۔ یہ کتاب ان اعتراضات کے جواب میں لکھی گئی تھی۔ جس کے متعلق غالب نے کہا تھا

مولوی احمد علی احمد تخلص نسخہ ۔۔۔ در خصوص گفتگو نے پارسی انشا کردہ است

خواجہ را از اصفہانی آبا چہ سود ۔۔۔ خانفش در کشور بنگالہ پیدا کردہ است

'برہان قاطع' پر اعتراضات کے جواب میں ہندوستان کے کئی نامور اہل قلم نے رسالے لکھے جن میں سعادت کی "محرق" مرزا رحیم بیگ میرٹھی کی "ساطع برہان" مشہور ہیں۔ مگر مؤید برہان، ان سب میں عدیم المثال ہے

۲ :۔ "شمشیر تیز تر" ۱۸۶۸ء میں مرزا غالبؔ کی "تیغ تیز" کے جواب میں شائع ہوئی تھی۔ آقا احمد کی یہ تصنیف فارسی زبان میں ہے اور بہت بلند درجہ رکھتی ہے۔ تذکرہ مؤید برہان، اور شمشیر تیز تر، کے ذکر کے بغیر نامکمل ہے۔

مندرجہ بالا دو کتابیں احمد کو بحیثیت شاعر، محقق، اور ناقد زندہ رکھنے کے لئے کافی ہیں۔

۳ ۔ ترانہ، میں ان کی فارسی رباعی کی تاریخ اور اس کے اوزان ہیں۔ ان کے ایک شاگرد "بلوخمین" نے ۱۸۶۷ء میں کلکتہ سے شائع کی تھی۔

۴ :۔ اشتقاق " اس مختصر سی کتاب میں فارسی کے صرف و نحو پر بحث کی گئی ہے۔

۵ :۔ "ہفت آسمان" ان کی آخری تصنیف ہے۔ جس میں مثنوی کے سات اوزان کی شرح ہے۔ ایشیاٹک سوسائٹی کلکتہ نے دسمبر ۱۸۷۲ء میں اس کا ایک باب" آسمان اول" کے نام سے شائع کیا۔ چند مثنویوں کے عنوانات مندرجہ ذیل ہیں۔

" مثنوی دیس ورامین ہیں" سکندر نامہ، نظامی، اقبال نامہ جہانگیری، تاثر عالمگیری، منتخب التواریخ بدایونی، اکبر نامہ ابوالفضل وغیرہ۔

احمد کا مدرسہ عالیہ کلکتہ کے مدرس بھی رہے۔ ہفت آسمان کے آخری حصے میں اپنے بعض شاگردوں کا ذکر خصوصیت کے ساتھ کیا ہے جن میں محمود آزاد، محمد اشرف، عبدالعلیم عاصم اور فدا سلہٹی قابل ذکر ہیں۔

آقا احمد نے جون ۱۸۷۳ء ڈھاکہ میں رحلت کی۔ نساخ نے تاریخ وفات کہی :۔

"واصل حق آغا احمد"

آزاد نواب سیّد محمود متخلص بہ آزاد عرف منجھلے صاحب۔ سیّد اسلا الدین حیدر کے بیٹے اور خان بہادر سید علی مہدی کے پوتے تھے۔ ان کے پر دادا میر اشرف علی ایران سے ڈھاکہ آ گئے تھے۔

محمود آزاد کا سن ولادت ۱۸۴۳ء بمقام ڈھاکہ۔ اور سن وفات ۱۹۰۷ء (بعمر ۶۵ سال) ہے۔ آزاد اپنے زمانے کے مقبول ترین شاعر تھے۔

ابتدائے شاعری میں شیدا تخلص کرتے تھے۔ مشہور مزاح نگار اور نامور نامہ نگار "اودھ پنچ" سید محمد آزاد کے بڑے بھائی تھے۔

شروع میں آقا احمد علی احمد اصفہانی باشندۂ ڈھاکہ کے دامن فیض سے وابستہ رہے۔ پھر اکرام احمد ضیغم کے چشمۂ فیض وعنایت سے مستفید ہوئے۔ مرزا غالب سے آزاد کے تعلقات خاص تھے۔ یہاں تک کہا جاتا ہے کہ وہ غالب کے شاگرد

بھی تھے۔ چنانچہ ڈاکٹر عندلیب شادانی۔ ایم۔ اے۔ پی۔ ایچ۔ ڈی (لندن) اپنے ایک[1] مقالہ میں رقم طراز ہیں:۔

" شرف صاحب[2] کا بیان ہے کہ آزاد مرزا غالب کے شاگرد تھے۔ آزاد کا یہ دستور تھا کہ تقریباً ہر سال وہ دہلی جاتے تھے اور دو تین مہینے وہاں قیام کرتے تھے اور اس سفر کی غائت مرزا غالب سے ملاقات اور ان کی صحبت سے استفادہ ہوتی تھی۔ جب تک مرزا غالب زندہ رہے آزاد برابر دہلی جاتے رہے حکیم محمود خاں دہلوی، نواب مصطفےٰ خاں شیفتہ، مجروح اور حالی سے بھی ملاقاتیں رہیں۔ ان بزرگوں سے تعلقات خاص تھے۔ جس زمانے میں مرزا غالب اپنے مقدمے کے سلسلے میں کلکتہ آئے ہوئے تھے۔ آزاد بھی ان سے ملنے کلکتہ گئے تھے۔ غرض مرزا غالب کے ساتھ وہ غیر معمولی دلچسپی اور ارادت رکھتے تھے۔"

آزاد کا دیوان ۱۸۸۹ء میں ان کے دوست مولوی مہدی حسن خاں شاداب کے زیر اہتمام مطبع المطابع عظیم آباد سے شائع ہوا۔ اس کا مقدمہ اورنگ آباد کالج کے پروفیسر عبدالغفور شہباز مرحوم نے نہایت دلچسپ انداز بہ زبانِ فارسی قلم بند کیا ہے اس کا ایک نسخہ علامہ وحشت کے ذاتی کتب خانے میں موجود ہے جو بڑی خستہ حالت میں ہے اس کے دیکھنے سے پتہ چلتا ہے کہ ۱۲۳ صفحے کے دیوان میں کل ۱۳ غزلیں اور پانچ رباعیاں اردو کی ہیں اور باقی صفحات فارسی کلام سے بھرے پڑے ہیں۔ جس سے یہ انداز

---

[1] ۔ مشرقی پاکستان کے اردو ادیب "[2] سید شرف الحسینی شرف مصنف گلستان شرف محمود آزاد کے بھانجے ہوتے ہیں ڈھاکہ کے یادگارِ سلف بزرگ اور باکمال شاعر ہیں ان کا تذکرہ عصر حاضر کے باب میں ملاحظہ کیجیے۔

کرنا مشکل نہیں کہ ان کی طبیعت فارسی گوئی کی طرف زیادہ مائل تھی۔ انھیں مرزا غالب کی طرح اپنے فارسی کلام پر ناز تھا اور بجا ناز تھا۔ فرماتے ہیں ؎

آزادؔ نظم ریختہ کچھ میرا فن نہیں
واقف ہیں فارسی کے مرے شعر تر سے آپ

مرزا غالبؔ کا اپنے اُردو کلام کے مقابلہ میں فارسی شاعری کے متعلق یہ نظریہ ہے ؎

فارسی بیں تا ببینی نقش ہائے رنگ رنگ
بگذر از مجموعۂ اُردو کہ بیرنگِ من است

علامہ وحشتؔ اپنے ایک گرانقدر مقالہ میں تحریر فرماتے ہیں۔

"آزادؔ فارسی کی طرف زیادہ مائل تھے اور اس زبان میں اہلِ زبان کی سی لطافت پیدا کی ہے۔ پرزور قصائد خاقانی اور عرفی کی زمینوں میں کہے ہیں۔ غزلیں بھی خوب کہی ہیں۔ ایک پُر زور قصیدہ میں جو خاقانی کے مشہور قصیدہ "دل من پیر تعلیم است و من طفل زباندانش" کی زمین میں لکھا ہے۔ اپنے کو فیضی قرار دیا ہے اور بھائی کو ابو الفضل۔ چنانچہ فرماتے ہیں ؎

بنظم و نثر امروز ادا بو الفضل است و من فیضی
بود اد پایہ سنج من منم از نکتہ فہمائش

کلام فارسی کے چند اشعار بطور نمونہ از خروارے پیش کیے جاتے ہیں۔

اپنے وطن ڈھاکہ کی تعریف میں کہتے ہیں ؎

ہمایوں خطہ مینو سوادے دلکشا شہرے
کہ باشد رہ کشِ گلزار جنت ہر بیا بانش

مبارک مرز بومے جانفزا جائے طرب خیزے
کہ آمد خوشتر از صبح وطن شام غریبانش
زتاثیر ہوا و آب جاں بخش و رواں پرور
فراغ از فیضِ انفاسِ مسیح و آب حیوانش
زجان آسائی شام و مسرت زائی صبحش
بجاں شام ہرات و صبح نیشاپور قربانش

ایک قصیدہ "حمد باری تعالیٰ" کی شوکتِ الفاظ اور معانی کی دلنشینی ملاحظہ فرمایئے ؎

اے ذات تو از شائبہ شرک مبّرا
برہانِ وجود تو زہر ذرہ ہویدا
انوارِ جمالت بکمال انجمن افروز
آثارِ وجوت بوجوب آئینہ پیرا
گل پوش زحمد تو سر صفحۂ دیوان
پُر نور زنام تو رُخِ دفتر انشاء
نطق از شرفِ نسبتِ حمد تو مباہی
اندیشہ بہ نیروی ثنای تو توانا
سرگشتۂ صحرائی خیالِ تو تجسس
وارفتۂ سودائی وصالِ تو تمنا

مندرجہ بالا اشعار سے آزاد کی شاعرانہ عظمت کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے

یہ امر قابل ستائش ہے کہ آزاد نے فارسی شاعری کی نسبت

اردو میں بہت کم اشعار کہے، لیکن اس کم سخنی کے باوجود اردو کلام متانت فصاحت، بلاغت، زور، روانی، پختگی، نشست الفاظ کی ترکیب اور مضمون آفرینی سے مملو ہے۔ اور یہ وہ خوبیاں ہیں جن کی بنا پر انھیں نہ صرف فارسی بلکہ اُردو شاعری میں بھی ممتاز مقام حاصل ہے۔ آزاد نے غالبؔ، ذوقؔ، مومنؔ کی زمینوں پر بھی طبع آزمائی کی ہے اور اپنی کوششوں میں کامیاب ہیں۔

غالبؔ کی زمین پر کتنا پُر زور مطلع کیا ہے ؎

شیوۂ پرسشِ احباب ستم ہے ہم کو
کیا کہیں ہائے کسی شوخ کا غم ہے ہم کو

بیخودیٔ شوق کی اور عرض تمنا ان سے
نہیں معلوم کہ منہ سے مرے کیا کیا نکلا

منبر پہ ہیں ڈہرے ہوئے کسی کروفر سے آپ
آجائیے میکدے میں واعظ تو سیر ہو
گویا کہ ٹالتے ہیں بلا اپنے سر سے آپ
انکار سے برا یہ ہے اصرار آپ کا

آزاد

خاں بہادر نواب سیّد محمد آزاد خلف سید اسد الدین حیدر۔ ولد خان بہادر سید مہدی علی ابن میر اشرف علی ایرانی، نواب سیّد محمود آزاد کے چھوٹے بھائی اور ڈھاکہ کے صاحب جاہ و ثروت رئیس تھے ۱۸۴۶ء میں ڈھاکہ میں پیدا ہوئے۔ سرکاری ملازمت کے سلسلہ میں عمر کا بیشتر حصہ کلکتہ میں گذرا اور غالباً ان کا انتقال بھی یہیں ہوا۔

آزاد انیسویں صدی کے اوسط کے نامور و مقبول ترین انشاء پردازوں مثلاً اکبر آبادی، منشی احمد علی کسمنڈوی، منشی جوالا پرشاد برق، منشی تربھو ناتھ ہجر اور مرزا مچھو بیگ عاشق "ستم ظریف" کے ہمعصر تھے۔ ان حضرات سے آزاد کے تعلقات دوستانہ تھے۔ اُس زمانے کے تقریباً تمام رسالوں اور اخباروں میں آزاد کے مضامین شائع ہوا کرتے تھے جن میں سے بعض کے نام یہ ہیں:۔

اودھ پنچ، آگرہ اخبار، آگرہ، دوربین دہلی، اکمل الاخبار دہلی، شیر قیصر لکھنؤ اور انگریزی اخبار "رئیس اینڈ رعیت" کلکتہ۔ انگریزی اخبار میں جو مضامین شائع ہوئے وہ ان کی انگریزی دانی اور مغربی ادب سے واقفیت کے شاہد ہیں۔

آزاد کے نام کو زندہ و پائندہ رکھنے کے لئے "اودھ پنچ" لکھنؤ جسے ۱۸۷۷ء سے منشی سجاد حسین نکالتے تھے، کے فائلیں کافی ہیں۔ "اودھ پنچ" اُس زمانے میں ہر دلعزیز اخبار تھا۔ ہندوستان کے گوشہ گوشہ میں بڑے ذوق و شوق سے پڑھا جاتا تھا۔ اس اخبار کی کامیابی و دلچسپی کا باعث عرف محمد آزاد کی نرالی اور دلنشیں تحریریں تھیں۔ اُس کے لکھنے والوں میں اکبر الہ آبادی اور دوسرے متذکرۂ بالا بہترین انشاء پرداز تھے جن میں آزاد کا نام بھی نمایاں حیثیت رکھتا ہے۔

آزاد کا نام کم از کم بحیثیت نامہ نگار اودھ پنچ دنیائے ادب میں ہمیشہ زندہ جاوید رہے گا۔

نئی ڈکشنری، کے عنوان سے جنوری ۱۸۸۷ء سے "اودھ پنچ" میں ایک نہایت دلچسپ اور جدت طراز ظرافت آمیز سلسلہ شروع کیا

کیا تھا جس کے تحت ہر سال نئے نئے الفاظ کے معانی مع تشریح و تفصیل کے سمجھاتے تھے چند الفاظ خیالات آزاد سے نقل کئے جاتے ہیں ۔

" پالیسی ۔ آنرہ انٹرسیٹ ۔ پارٹی فیلنگ ۔ سویلزیشن ۔ فیملی ایجوکیشن کورٹ شپ ۔ کانشس ۔ پارلیمنٹ ۔ سائنٹفک ۔ فرانٹیر ۔ فاٹکرہ، قرم ساق اولڈ پاپا ۔ مہذب بی بی ۔ موچی ۔ ڈومن ۔ الکشن زادہ ۔ آیا ۔ اوڑیا بہرہ میانچی ۔ پیرائی وغیرہ ۔"

آزادؔ کی تحریر میں طنز و مزاح کے تیر و نشتر بھی ہیں اور زبان و ادب کی حلاوت و چاشنی بھی ۔ صاحب طرز انشاء پرداز ہونے کے علاوہ انھوں نے جس جدت و ندرت اور شگفتگی ۔ رعنائی و بے ساختگی کے ساتھ تراکیب الفاظ ۔ محاوراتِ زبان، نادر اصلاحات ۔ رنگین تشبیہات اسلوب ظرافت کو عطا کئے وہ اپنی مثال آپ ہیں ۔

آزادؔ کے مزاحیہ مضامین اگر یکجا جمع کئے جائیں تو کئی ضخیم کتابیں مرتب ہو سکتی ہیں ۔ ایک مجموعہ موسوم بہ خیالاتِ آزاد، پہلی دفعہ ۱۸۸۷ء میں نوجی پریس لکھنؤ میں طبع ہوا ۔ دوسرا ایڈیشن دیگر مضامین کے اضافہ کے ساتھ ۱۹۰۸ء میں محمد عبدالحمید ۔ حمیدؔ کے زیر اہتمام رضوانی پریس کلکتہ سے شائع ہوا ۔ اس کا ایک نسخہ محترمی ڈاکٹر عندلیب شادانی کے ذاتی کتب خانے میں محفوظ ہے ۔ اس کے علاوہ اور چند کتابیں مثلاً سوانح عمری آزادؔ، نوابی دربار وغیرہ بھی زیور اشاعت سے آراستہ ہو کر منظر عام پر آکر مقبول خاص و عام ہوئیں ۔

" خیالات آزاد " میں پروفیسر عبدالغفور شہباز[1] کا مختصر سا دیباچہ شامل ہے جو نہایت دلچسپ، مفید اور معلومات افزا ہے ۔ نیز محمد آزادؔ

---

[1] شہباز کا مفصل حال آگے کے صفحات میں لکھا جائے گا ۔

کے طرزِ تحریر، مقبولیت۔ تحریر اور کتاب کی ادبیت پر روشنی پڑتی ہے شہباز لکھتے ہیں۔

عالم انشا۔ پردازی پر اس شخص کا اس قدر احسان ہے شاید ہی کوئی انشاء پرداز ایسا ہو گا جس کے قلم سے اتنے مختلف نو ایجاد رنگوں میں اتنی مقبول اور دل پسند تحریریں نکلی ہوں۔ اس مجموعے میں جس قدر تحریریں ہیں شوخی ظرافت آمیزی میں وہ بھی کم نہیں۔

بہت سے ڈرامے جو اس شخص کے قلم جادو رقم سے مختلف اخلاقی مضامین پر نکلے اور متانت کے مضامین اس میں بالکل دبے ہی نہیں گئے۔"

اسی دیباچہ کے صفحات میں پروفیسر شہباز ایک جگہ اور رقم طراز ہیں۔

" شوخی ظرافت جو اس شخص کا ایک خلقی جوہر ہے وہ بھی اس آزادی کے زمانے میں بے چمکے نہ رہی اور اس کی چمک دمک اس غضب کی ہوئی کہ اکثر خیرہ چشم گھبرائے اور بہت سے صاحب نظر چکر میں آئے۔ اکثر مجالس میں ان کے قلم سے نکلے ہوئے فقرات نقل محفل بنے اور اکثر زبانوں پر ان کے بعض برجستہ جملے ضرب المثل کی طرح جاری ہوئے۔ جدت پسندی سے مضمون آفرینی کا جو رستہ نکلا، ایسا نکلا جس پر لوگ قدم بھی بمشکل رکھ سکتے ہیں۔ منزل مقصود کو پہنچنا تو بڑی بات ہے اور ساتھ اس مشکل پسندی کے عام پسند اس قدر کہ ہر شخص اس پر دالہ و شیدا۔ سب سے پہلے ڈکشنری کی ایجاد کی۔ اس رنگ نے وہ مقبولیت حاصل کی کہ اس وقت کے کل رنگ پھیکے پڑ گئے اور اکثروں نے جوشِ پسندیدگی میں اس کی تقلید کرنی چاہی لیکن آخر وہی مثل ہوئی کہ "بھاری پتھر تھا چوم کر چھوڑا۔"

خیالات آزاد، کے تقریباً ڈیڑھ سو صفحات خطوط کے لئے وقف ہیں۔ یہ خطوط آزاد کی شوخی و ظرافت، رنگِ خاص اور محض طرزِ تحریر کے آئینہ دار ہیں۔ جو نہایت پُر کیف پُر لطف اور دلچسپ و دلکش ہیں یہ خوبی بھی قابل تعریف ہے کہ انداز تحریر نہایت شوخ بے تکلف اور رنگین ہونے کے باوجود طنز و مزاح کا کوئی فقرہ یا ٹکڑا کہیں ناہموار مخرب اخلاق یا خلاف تہذیب نہیں بلکہ جو فقرہ ہے نہایت چست و مہذب جو ٹکڑا ہے نہایت بامحاورہ اور تہذیب و اخلاق کے لئے سبق آموز عبرت ناک۔ جو عبارت ہے دل کش جو مضمون ہے اعلیٰ صنائع کا بہترین نمونہ۔

یہ واقعہ ہے کہ آزاد نے سرزمین بنگال میں آنکھیں کھولیں اور یہیں سپرد خاک ہوئے۔ ولایت اور یورپ تو کیا غالباً دہلی و لکھنؤ کے علاوہ کہیں اور جانے کا اتفاق نہیں ہوا۔ لیکن اُن کے وہ فرضی خطوط جو ایک ہندوستانی تعلیم یافتہ نوجوان نے ولایت سے بھیجے و لکھنے سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انگلستان میں بیٹھ کر لکھے گئے۔

اور اس نوجوان نے وہاں کے حالات و کوائف ماحول و فضا سے متاثر ہو کر اپنے سچے جذبات کی ترجمانی کی ہے۔ آزاد کی یہ خصوصیت تحریر نہ صرف باعثِ حیرت ہے بلکہ ان کے کمالِ فن انشاء پردازی پر دال ہے جس کی مثال ادب اردو میں خال خال ہے۔ بطور نمونہ خط کا اقتباس پیش کیا جاتا ہے۔

" مائی ڈیر عفت بیگم! میرا پہلے پہل بسم اللہ مجریہا و مرسیہا کہہ کر دریائے فراق میں کشتی ڈالنا اور بندر بمبئی سے جہاز

دُخانی پر چڑھا کہ تمہاری نفرقت مجھ پر سوار ہوئی۔ اکثر راتوں کو جہاز میں تمہارے گیسوئے مشکیں، موباف سرخ اور گرئی ململیے دوپٹے کا خیال مجھے ستایا کرتا تھا۔ مگر جب سے اس طلسماتی شہر لندن میں میں نے قدم رکھا۔ روز بروز صدمہ مفارقت گھٹتا گیا اور درد جدائی کی تکلیف کم ہوتی گئی اب بخدا تمہاری محبت اسی قدر اور اسی طرح مجھے ہے جیسے کسی کو اپنی پالی ہوئی چڑیا کی۔ پیارے جانور کی محبت اور یاد ہوتی ہے۔ اس کے یہ معنی نہیں کہ میں تم کو بھول گیا ہوں یا تمہاری محبت بالکل میرے دل سے مٹ گئی ہے بلکہ تمہاری حالت کا جب میں اس ملک کی حور نژاد عورتوں سے مقابلہ کرتا ہوں تو بالکل ایک نیم وحشی چارپایہ بن کر میرے دیدۂ تصوّر کے سامنے آتی ہو اور میں اس بات سے نہایت پچھتاتا ہوں کہ میری پیدائش ہندوستان میں ہوئی کیوں نیم وحشی گوشت کے دائمی عیش و آرام و پرورش کا میں ضامن ٹھہرا واقعی اس سے زیادہ بدنصیب دنیا میں کوئی نہیں جو اس مردم سوز خطۂ غیر مہذب ہندوستان میں پیدا ہوا ہوں۔

کوہ قاف، سبز پری، لال پری، زرد پری۔ نیلم پری، پکھراج پری، کے قصے لڑکپن سے سنا کرتا تھا اور ان قصوں کو خیالی باتیں جانتا تھا۔ مگر تمہاری جان کی قسم پریوں کا ملک یہی ہے یہاں کی عورتیں آزادی کی ہوا کھا کر جیتی ہیں۔ ہر قسم کی تعلیم پاتی ہیں۔ ہر مجلس و محفل میں بے تکلف جاتی ہیں۔ گاتی ہیں بجاتی ہیں۔ ناچتی ہیں۔ ہر قسم کے مردوں کو خوش کرتی ہیں عمدہ سے عمدہ شرابیں پیتی ہیں۔ متوالی بنی بنی ہیں سواریوں پر سیر کو نکلتی ہیں۔ لباس صاف پریوں کا سا ہے۔"

شائق نام خواجہ فیض الدین عرف حیدر جہاں ۔ تخلص شائق مولد و مسکن شہر ڈھاکہ. باپ کا نام خواجہ خلیل اللہ

سرزمین بنگالہ میں جن ارباب ذوق کو مرزا اسد اللہ خاں غالب دہلوی جیسے یگانۂ روزگار استاد کے دامنِ فیض سے وابستگی کا فخر حاصل تھا۔ ان میں نواب سید محمود آزاد کی طرح حیدر جہاں شائق بھی ایک تھے۔ گو شائق کو محمود آزاد کی طرح دہلی جانے کا اتفاق نہیں ہو. لیکن بذریعہ ڈاک اپنی غزلیں اور نظمیں بھیجا کرتے اور مرزا غالب بڑے شوق و محبت سے ان کی اصلاح فرماکر واپس کر دیا کرتے تھے۔ شائق نہ صرف اردو بلکہ فارسی زبان میں بھی شعر کہنے کے شائق تھے فارسی میں اکثر کلام غالب کا تتبع کرتے۔ غالب نے ان کے فارسی کلام پر بھی اپنی اصلاح دی ہے۔ شائق صاحب دیوان تھے۔ بطور نمونہ انجر والے چند اشعار ہدیۂ ناظرین ہیں۔ بقولِ نساخ۔
"اشعار ان کے پر درد ہوتے ہیں[1]"۔

اسی نے کیا ہم کو رسوائے عالم — کہ جس نے تجھے عالم آرا بنایا
یہاں نالۂ بے اثر ہم کو بخشا — وہاں دل ترا سنگِ خارا بنایا
دیا اور وہم کو وہ گردوں نے شائق — کہ تدبیر جس کی نہ چارا بنایا
جس کی ٹھوکر سے جی اٹھے مردے — اس کی رفتار نے ہمیں مارا
خون دل پیتے ہیں غم کھاتے ہیں — دل لگانے کا مزا پاتے ہیں
تیرے دھوکے سے چمن میں اکثر — سرو کو جا کے لپٹ جاتے ہیں

---

[1] تذکرہ سخن شعرا۔

شہباز

پروفیسر سید محمد عبد الغفور متخلص بہ شہباز ساکن کلکتہ بنگال کے اُن چند اہل علم و فضل نفوس میں سے تھے جن کی قابلیت اور خدمات کا اعتراف زمانے کی بے قدری کے باوجود ان کی زندگی ہی میں کیا جاچکا ہے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب کلکتہ کے مشہور اخبار "دارالسلطنت" اور اُردو گائیڈ "، میں مستقل طور پر ان کے علمی، ادبی، مذہبی و دیگر موضوعات پر معرکہ آرا مضامین شائع ہوا کرتے تھے۔ ان کی نظمیں بھی کلکتہ اور ڈھاکہ کے مختلف جرائد کے علاوہ ہند و پاک کے دیگر رسائل و اخبارات میں بھی آیا کرتی تھیں ایسے اخباروں میں "اودھ پنچ لکھنؤ" خاص طور پر قابل ذکر ہے۔

بیک وقت کئی زبانوں انگریزی، اُردو، بنگلہ، فارسی اور عربی پر کامل دستگاہ رکھتے تھے۔ انگریزی ادب سے بھی خاص دلچسپی تھی۔ بنگال کے قابل ترین انگریزی دانوں میں ان کا شمار ہوتا تھا۔ مشرقی ادب سے جس قدر متاثر تھے وہ تو ظاہر ہے۔ لیکن مغربی ادب سے بطور خاص استفادہ کیا تھا اور اس ادب کی بعض مفید چیزیں اردو ادب میں شامل کیں۔ انگریزی کے مشہور شاعر فطرت، ولیم ورڈز ورتھ کے اس خیال کی تائید میں کہ حقیر سے حقیر یا معمولی سے معمولی موضوع بھی شاعر کے لئے باعث اظہار خیال بن سکتا ہے اسے نظر انداز کرنا شانِ شاعری کے منافی ہے۔ چنانچہ شہباز نے بھی انگریز شاعروں کی طرح ایسے موضوعات مثلاً مکھی، مکڑی، جلیبی، وفادار کتا، ڈکشنری وغیرہ پر بھی طبع آزمائی کی اور بڑے کمال کے ساتھ کامیاب رہے۔ خشک سے خشک موضوعات پر بھی نظمیں کہیں اور شعریت، حسنِ بیان لطفِ زبان

کی خوبیوں کو ہاتھ سے جانے نہ دیا ۔

شہاب کے نواسے سیدؔ اختر حسین اختر ایم۔ اے انکم ٹیکس آفیسر (حال ڈھاکہ) نے ان کی بعض نظموں کو ۱۹۴۲ء یعنی دوسری عالم گیر جنگ کے ہلاکت خیز و انسانیت سوز زمانے میں حاجی محمد عبدالقیوم تاجر کتب و لیلی اسٹریٹ کلکتہ سے شائع کرایا۔ اس مجموعے میں شہباز کی ان نظموں کے علاوہ جن کا ذکر اوپر کیا جا چکا ہے متعدد موضوعات پر نظمیں ملتی ہیں "تفریح القلوب" اس مجموعہ کا ایسا نام ہے جو پوری کتاب کے دیباچہ کا حکم رکھتا ہے یعنی گلہائے زنگارنگ کا ایک ایسا پُر بہار حیات بخش، زندگی آمیز، مسرت خیز اور سبق آموز گلدستہ ہے جس کے پڑھنے سے واقعی تفریح قلب اور شگفتگی روح محسوس ہوتی ہے۔ دیباچہ سر شیخ عبدالقادر مرحوم بیرسٹر ایٹ لا۔ ایڈیٹر مخزن لاہور۔ اور پروفیسر علامہ رضا علی وحشت جیسے نقادان ادب و اکابر سخن نے لکھ کر اس کتاب کی اہمیت میں چار چاند لگا دیئے ہیں۔

شہباز کا ایک قابل قدر کارنامہ جو ان کی انگریزی دانی کا ثبوت ہے ایک عدیم المثال انگریزی نظم "آپش رروڈ" کا کامیاب ترجمہ ہے۔ یہ مغرب کے مشہور شاعر سدے کی نہایت زبردست مقفیٰ نظم ہے۔

ان کی وہ دلآ ویز نظمیں جو اودھ پنچ میں شائع ہوتی تھیں۔ خیالات شہباز کے نام سے نظامی پریس بدایوں سے کتابی شکل میں چھپ کر ارباب

لہ اختر حسین اختر بھی عصر حاضر کے جواں سال شاعروں میں ممتاز ہیں۔ زبان و ادب پر اچھی نظر رکھتے ہیں۔ بہت کم کہتے ہیں مگر جو کچھ کہتے ہیں بہت سوچ سمجھ کر کہتے ہیں۔ افسوس ان کے مزید حالات و کلام دستیاب نہ ہونے کے باعث شریک اشاعت نہ ہو سکے۔

نقد و نظر سے خراج تحسین حاصل کر چکی ہیں۔ ان کی ایک تصنیف زندگانی بے نظیر جس میں نظیر اکبر آبادی کے حالات و کلام پر فاضلانہ تبصرہ ہے۔ شائع ہو چکی ہے علمی قابلیت کے باعث نبگال سے وکن بلائے گئے جہاں مدت دراز تک علم طبیعات کے پروفیسر رہے۔

شہباز نثر بھی لکھتے تھے۔ شعر بھی کہتے تھے دونوں کا معیار بلند و اعلیٰ ہے۔ ان کا کلام متعدد اصنافِ سخن مثلاً نظم، غزل، مسدس، مخمس، قطعات رباعی وغیرہ پر حاوی ہے۔ رباعیات شہباز رباعی کہنے میں بھی ید طولیٰ رکھتے تھے رباعیوں کا مجموعہ زیورِ اشاعت سے آراستہ ہو چکا ہے۔ فرسودہ خیالات اور پامال مضمون سے ان کا کلام پاک ہے۔ رفتارِ زمانہ کے لحاظ سے بعض مغربی استعارات و تشبیہات کا استعمال بھی بڑی خوبی سے کیا ہے ایک شعر اور ایک رباعی بطور نمونۂ کلام پیش کرتا ہوں ؎

شعر

قول سے پہلے ہے اثر مطلوب
آہ سے پہلے ہے اثر کی تلاش

رباعی

کیونکر کوئی اسرارِ الٰہی جانے
کیا تاب کہ انسان کماہی جانے
آنکھوں سے حجاب وہم اٹھنا معلوم
باتیں یہ خدا کی ہیں خدا ہی جانے

اختر

نساخ نے تذکرۂ سخن شعرا میں اختر کے متعلق یہ چند سطریں سپرد قلم کی ہیں۔

• خواجہ عبدالغفار رئیس اعظم شہر ڈھاکہ خلف خواجہ عبدالغفور مرحوم، شاگرد حافظ اکرام احمد ضیغم متوطن کشمیر، ان کا مولد و مسکن ڈھاکہ۔ اشعار فارسی و اردو خوب کہتے ہیں۔ راقم کے دوستوں میں ہیں۔ یہ شعر اس تذکرے کے واسطے

بھیجے تھے ؎

حیرت ہے اس کے آنے پہ کیا پیش کش کروں
سینے میں دل رہا ہے نہ جاں اپنے تن میں ہے

پھولا ہوا خوشی سے ہر اک گُل ہے اے نسیم
کس نوبہارِ حُسن کی آمد چمن میں ہے

شمع روشن نہ سیہ خانۂ عاشق میں ہوئی
جلوہ گر وہ نہ ہوا کلبۂ اخزاں میں کبھی

ڈاکٹر عندلیب شادانی اپنے ایک مقالہ[1] میں رقم طراز ہیں
عبدالغفار اختر مرحوم نہ صرف نثر نگار تھے بلکہ مشاق شاعر بھی ریختی میں اختر اور ریختی میں نزاکت تخلص کرتے تھے۔ مرزا غالب کے آخری حصہ عمر میں ان کا عنفوانِ شباب تھا۔

داد غالب بھی تجھے دیں گے زباندانی کی
لے کے اختر جو یہ دلّی میں غزل جائے گا

اس مقطع کی بدولت مرزا مرحوم سے شاگردی کا شرف حاصل کیا تھا نثر میں بھی کئی قلمی نسخے موجود ہیں۔ یہ اختر وہی ہیں جو خواجہ نواب احسن اللہ شاہین کے ماموں اور استادِ سخن مشہور ہیں۔

اختر نے نزاکت کے تخلص سے جو ریختیاں کہی ہیں ان کا ایک نمونہ ملاحظہ فرمائیے ؎

آخری ہے چارشنبہ میں نئی تیاریاں
جانی دریا پر نہانے دیکھو لے ساریاں

---

[1] مشرقی پاکستان کے اُردو ادیب

گھولتی بیبن ہے کوئی تسلے میں کوئی کھلی
کھولتی ہے کوئی اپنے کپڑوں کی الماریاں
زعفراں کوئی لئے ہے ہاتھ میں کوئی شہاب
ہو رہی ہیں چار سو ہر رنگ کی گلکاریاں
آئی ہیں گنو ہیاں الٰہی جان وآبادی یہاں
جمع اس جانب ہوئی ہیں کتنی آفت ماریاں
شفقلیں یہ ہیں نگوڑی شوخ اس درجہ کی ہیں
کس کو طاقت ہے یہاں انکی کرے جو خواریاں
بس نزاکت ریختی میں تو بھی ان ہی کی طرح
خوب دکھلانے لگی ہے اپنی اب پرکاریاں
نیک ساعت ہے دعا کو ہاتھ اٹھا خالق سے کہہ
یا خدا تو اپنی رحمت کی دکھا دے باریاں

صبا اس دور میں خواجہ عبدالرحیم صبا بھی نامور شعراء میں سے تھے۔ بنجن شعراء میں ان کے حسب ذیل حالات ملتے ہیں۔

صبا تخلص خواجہ عبدالرحیم خلف الرشید خواجہ سلیم اللہ داماد و برادر زادہ خواجہ علیم اللہ مرحوم رئیس اعظم ڈھاکہ۔ ہر دو زبان میں شعر خوب کہتے ہیں۔ راقم کے دوستوں میں ہیں۔ یہ شعر اس تذکرے کے لئے دیئے تھے۔ ۱۲۸۸ھ میں انتقال کیا۔

جائیے آپ اس گلی میں صبا ہم یہیں سے سلام کرتے ہیں
دزدیدہ اُن نگاہوں کے مضموں کا فیض ہے
سب کو گماں جو سرقہ کا میرے سخن میں ہے

جو کہ دیکھا خواب ہے اور جو سنا افسانہ ہے
اس سے یہ ثابت ہوا دنیا قمار خانہ ہے

ہاں بے عذر آخرش مستانہ آنے میں آ سے
اور یہاں لبریز اپنی عمر کا پیمانہ ہے

دیکھ کر کثرت دلوں کی تار تار زلف ہیں
آئینہ حیرت میں ہے اور کشمکش میں شانہ ہے

یہ تو ہو مضمون وہ عاشق زہے نیرنگِ عشق
ایک ہی آتش سے جلتی شمع اور پروانہ ہے

شیدا خواجہ عتیق اللہ شیدا عرف شہزادے صاحب خلف خواجہ عبدالمنان، خواجہ احسن اللہ شاہین کے سمدھی اور خواجہ علیم اللہ کاشمیری کے عزیز تھے۔ شیدا میر امن امیر نہایت بلند اخلاق، مرنجانِ مرنج انسان اور اخلاص و مروت کے مجسمہ۔ دوست نوازی، مہمان نوازی۔ غریب پروری اور علم دوستی میں عدیم المثال تھے۔ علم و ادب، ستفر موسیقی سے فطری دلچسپی تھی۔ اردو فارسی۔ انگریزی زبانوں کے ادب پاروں سے خاص شغف تھا اور اہل علم و فضل کی قدر دانی میں اپنی مثال نہ رکھتے تھے، شاعری سے فطری مناسبت تھی۔ تمام اصناف سخن میں ان کا کلام موجود ہے ہندی بحروں اور ہندی اوزان میں بھی طبع آزمائی کرتے تھے۔

شیدا ایک اچھے انشاء پرداز بھی تھے اور مشہور ناول نگار بھی ان کا شہرت یافتہ ناول "عبرت" دلی اور لکھنؤ جیسی زبان کی خصوصیت کے لحاظ سے ایک شاہکار ہے۔ بطورِ نمونہ اس کی آخری سطریں ملاحظہ فرمایئے:-

اس قصے سے سب کو یہ نتیجہ نکالنا چاہیئے کہ برے کاموں کا نتیجہ برا ہوتا ہے۔ بے سمجھے بوجھے لوگوں سے دوستی کرنا اور اس پر اعتماد بھی عقل و دانش سے بعید ہے۔ اگر غلام پیر صاحب ان باتوں کا خیال کر کے بڑے بوڑھوں سے مشورہ کر لیتے تو اتنا نقصان اٹھاتے نہ مقدمہ کی زحمت۔ حدیث نبوی ہے کہ پہلے مشورہ کرو پھر عمل۔ اس طرح انشاء اللہ کوئی خطا ہوگی نہ غلطی "

شیدا نے کئی جاسوسی ناول بھی لکھے۔ ان میں "دیوی چودھرائن" اور "خدا کی شان" میں وہ تمام خوبیاں پائی جاتی ہیں جو کامیاب ناول میں ہونی چاہئیں۔ انھوں نے ستر سال کی عمر میں ۲۹-۱۹۲۸ء میں بمقام ڈھاکہ قضا کی۔

شیدا کے چھوٹے بھائی جو بھولے صاحب کے نام سے پکارے جاتے تھے اپنے زمانے کے مشہور افسانہ نگار تھے ان کے مختلف افسانے اس دور کے رسائل و جرائد میں شائع ہوا کرتے تھے۔

اشرف خواجہ محمد اشرف خواجہ ناظم الدین سابق گورنر جنرل پاکستان کے خسر تھے مشہور انشاء پرداز اور ناول نویس۔ ان کا ایک ناول "خوبیٔ قسمت" کے نام سے بہت مشہور ہے۔ مزید حالات معلوم نہ ہو سکے۔

آشفتہ تذکرہ سخن شعراء میں آشفتہ کے حسب ذیل حالات و نمونۂ کلام شامل ہیں۔

آشفتہ تخلص۔ حاجی منشی عبداللہ باشندۂ سلہٹ، خلف عبدالحمید شاگرد حافظ ضیغم۔ فارسی اردو میں خوب کہتے ہیں۔ راقم کے دوستوں میں ہیں ؎

دیکھنا شوقِ شہادت عاشقِ دلگیر کا
کیا تڑپ کر چوم لیتا ہے گلا شمشیر کا

قبر کچّی کیوں بناتے ہیں عبث حیران ہوں
کیا تن بے جاں کو بھی ہے حوصلہ تعمیر کا

آج کل مائل اِدھر ہے دل بتِ بے پیر کا
یہ اثر کب تھا الٰہی نالہ شبگیر کا

وادیٔ وحشت میں ایسا پاؤں پھیلا کر مرا
دیدۂ غول بیاباں حلقہ ہے زنجیر کا

منشی عبدالرحیم آشوب ان کے قابل ترین شاگرد اور حکیم حبیب الرحمٰن ان کے نوجوان دوست تھے۔

عیش نام مرزا محمد عسکری۔ تخلص عیش۔ ان کے والد ماجد مرزا علی (؟) نقی دہلی کے رہنے والے تھے اور مرشد آباد میں سکونت اختیار کر لی تھی۔ ڈھاکہ میں شہر امین تھے۔ عیش قدرت اللہ قدرت کے تلمیذ ارشد تھے۔ نمونۂ کلام یہ ہے ؎

بات اب امتحان پر آئی قصہ کوتاہ جان پر آئی

ہے دل کو میرے راہ ترے دل سے خبردار
لگ جائے مبادا نہ کہیں دل بہ دل آتش

کیا ہے یہ قطرہ قطرہ مئے ساقی ایک بار ہی تو بھر کے جام کہیں
اس شب وصل کی سحر اے چرخ لیجیو مجھ سے انتقام کہیں
یہ غزل عیش ہے تصدق سوز مجھ سے ہوتی ہے انصرام کہیں

تمکین نام مولوی غلام خاں تخلص تمکین ۔ والد کا نام خاں بہادر مولوی غلام رسول جو تحسین تخلص کرتے تھے اور اردو فارسی ہر دو زبانوں میں شعر کہتے تھے ۔

تحسین صدر الصدور ضلع ڈھاکہ کے رہنے والے تھے ۔ ان کا کلام زیادہ تر ظریفانہ اور مزاحیہ ہوتا تھا ۔

غلام خاں تمکین صدر میں ضلع بیربھوم (مغربی بنگال) میں اقامت پذیر تھے ۔ شعر و شاعری کا بچپن ہی سے شوق تھا ۔ کلام ریختی سے بھرا پڑا ہے ۔ نساخ سے دوستانہ تعلقات اور خاص مراسم تھے ۔ ۱۲۸۸ھ میں رحلت کی ۔ نمونہ کلام ؎

لن ترانی کے سوا اس کی زباں پر کچھ نہیں
اس ستمگر نے سنا ہے جب سے قصہ طور کا

کوئے جاناں کم نہیں کعبہ سے عاشق کیلئے
دید حق سے کم نہیں دید رخ نیکوے دوست

لاف کرتی ہے اب اس چشم سے بیجا نرگس
کہیئے ان آنکھوں کے آگے ہے بھلا کیا نرگس

مہرباں ہم پہ بھی ہے اور جفا کار بھی ہے
لطف اور پیار بھی ہے قصہ و تکرار بھی ہے

تمنا نام اور حالات معلوم نہ ہو سکے ۔ تمنا کے نام سے مشہور تھے کلکتہ کے رہنے والے تھے ۔ ان کا یہ شعر مشہور ہے ؎

صبا یہ کہنا خدا بچائے نقط ہیں اب آخری سنبھالے
گذرتے ہیں ناز اٹھانے والے جو دیکھنا ہو تو آکے دیکھو

تیسرا دور

۱۸۷۵ء تا ۱۹۱۰ء

شمس النسخ اور خالد کا زمانہ

تمہید یہ وہ دور تھا جب لکھنؤ میں وزیر، رند، صبا کے پیرو کثیر جماعت میں موجود تھے۔ داغ نہ صرف اپنی زندگی بلکہ شاعری کے بھی آخری دور سے گذر رہے تھے۔ ان کی استادی کا لوہا منوایا جا چکا تھا۔ بنگال کے گوشہ گوشہ میں ان کے شاگرد موجود تھے، نساخ، محمود آزاد ضیغم، قدرت وغیرہ کے شاگردوں کا دور دورہ تھا۔ واجد علی شاہ اختر اور ان کے دامن فیض و ثروت سے وابستہ شعراء، علماء و فضلاء کے چشمہ فیض سے صدہا سخن فہم و سخن سنج بنگال کے طول و عرض میں پیدا

ہو چکے تھے۔

مٹیا برج اور کلکتہ کی گلی گلی میں لکھنوی مذاق رس بس چکا تھا۔ یہاں تک کہ عوام کی بول چال، علمی مجلسوں، ادبی محفلوں میں بھی لکھنوی تہذیب، تمدن زبان اور محاورے اپنا رنگ جما چکے تھے۔ خصوصاً بنگال کے شعراء وادباء بیساختہ طور پر لکھنؤ کی شیرینی ولطیف زبان بولنے کے عادی نظر آنے لگے اور ان کی تحریر وتقریر میں بھی لکھنؤ کے الفاظ کثرت سے استعمال ہونے لگے۔ ذیل میں اُس عہد کے شعراء ادباء کے حالات مع نمونۂ کلام ہدیۂ قارئین ہیں۔

افضل

خواجہ محمد افضل کا سن ولادت ۱۸۷۵ء بمقام ڈھاکہ ہے۔ فارسی اور انگریزی کی تعلیم ڈھاکہ میں حاصل کی۔

شاعرانہ مزاج اور علمی رجحان فطری تھا۔ ڈھاکہ میں اس زمانے میں اور کئی کہنہ مشق وقادرالکلام شعراء موجود تھے لیکن وہ سید محمد آزاد کے کلام کے ایسے گرویدہ تھے کہ انھیں کے آگے زانوئے تلمذ تہ کیا۔ علم عروض وزبان دانی پر کافی مہارت تھی۔ غزل بھی کہتے تھے اور نظم بھی لیکن صنف تاریخ گوئی میں ید طولیٰ رکھتے تھے۔ بات بات پر قطعۂ تاریخ موزوں کر ڈالتے۔ غالباً یہی وجہ ہے کہ مجموعی طور پر ان کے کلام میں قطعات تاریخ کی زیادہ تعداد ہے۔ مجموعۂ تواریخ تین ضخیم جلدوں میں موجود ہیں۔ نواب مرزا خاں داغ دہلوی کی وفات حسرت آیات پر ۱۰ تاریخیں اور نواب سر احسن اللہ خاں مرحوم کے انتقال پر ملال پر ۱۳ قطعات کہے۔ ایک تصنیف "غم ماہ پیکر" ان کے کمال تاریخ گوئی کا بہترین نمونہ ہے۔ یہ ان قطعات تاریخ کا مجموعہ ہے جو نواب بیگم سر احسن اللہ خاں کی رحلت سے متاثر ہو کر لکھے گئے تھے۔ اس کی یہ خصوصیت بھی قابل تعریف ہے کہ یہ سب قطعات صرف

ایک ہفتے کے اندر لکھے گئے تھے۔ جوان کی مشق، مہارت اور قادر الکلامی پر دال ہے۔ تاریخ گوئی کی وجہ سے "افضل المورخین" اور ناسخ ثانی" کے القاب سے مشہور ہیں۔

اپنے استاد کی طرح فارسی شاعری کے دلدادہ تھے۔ فارسی کلام کا ایک دیوان ان کی فارسی دانی کا شاہد ہے۔ اردو میں کم گوئی کے باوجود بھی اتنا کہا کہ ایک دیوان مرتب ہو سکتا ہے۔

کلام میں تاثیر بھی ہے زور بھی۔ بطور نمونہ اردو غزلوں میں سے چند اشعار ناظرین کی ضیافت طبع کے لئے پیش کئے جاتے ہیں ؎

سوال ایک بوسۂ لب کا جو ہم کرتے ہیں رو رو کر
وہ ہنس ہنس کر یہ کہتے ہیں یہ کہنا ہم نہ مانیں گے

صبحدم ماہ جبیں گھر کو چلا ماہ کے ساتھ
دامنِ صبح ہوا چاک سحر گاہ کے ساتھ

پاس ضد کا ہے تری ورنہ مرا پر نالہ
لئے آغوش میں تاثیر کو ہے آہ کے ساتھ

ماہ غشب جو مرے ماہ جبیں کو دیکھے
بیخودی میں کوئی جھانکا کرے سوچاؤ کے ساتھ

تارے گن وائیگی شب بھر تری افشاں مجھ کو
تکے چنوائیگاں سوے مکر اے جاں مجھ کو

جوشِ سودا میں ہوا گھر مرا زنداں مجھ کو
طوقِ ہنسلی ہے سلاسل رگ شریاں مجھ کو

دردنداں کے تصور میں جو میں روتا ہوں

گوہر آسودہ نظر آتا ہے درماں مجھ کو

انسخ نام چودھری عظمت اللہ تخلص آنسخ۔ تلمیذ نساخ۔ پنڈوا کے رہنے والے تھے اور وہاں کے خوشحال زمیندار تھے۔ تعلیم و تربیت کے مرحلے وہیں کلکتہ میں طے کئے اور عمر کا زیادہ حصہ وہیں گذرا۔ شعر و شاعری ان کا دلچسپ مشغلہ تھی۔ خود شاعر تھے اور شاعروں کی دل سے قدر کیا کرتے اس لئے شعراء و ادباء کی مجلسیں ان کے ہاں جمی رہتیں۔ چنانچہ سلہٹ کے خواجہ جیموز کے عزیز اندہ کلکتہ کے شاگرد وغیرہ جیسے ارباب ذوق ان کے چشمہ فیض سے مستفیض ہوئے۔

شمس نام ابوالقاسم محمد۔ تاریخی نام "مظہر الحق" یہ تاریخی نام حسب ذیل قطعۂ تاریخ سے نکلتا ہے جو ان کے والد بزرگوار عبدالغفور خان بہادر نساخ کی فکر کا نتیجہ ہے ؎

ناد فرزندم و زو بدارش | شد دلم شاد و چشم من روشن
نام تاریخیش کہ می جستم | مظہر الحق بگفت عقل بہ من

۱۲۸۴ھ

شمس بنگال کے ایک جلیل القدر شاعر اور مستند استاد تھے۔ ناسخ کے صاحبزادے تھے۔ ظاہر ہے کہ گہوارۂ شعر و ادب میں پرورش پائی۔ سن ولادت ۱۸۶۱ء بمقام فریدپور (مشرقی بنگال) ہے۔ اردو فارسی اور انگریزی میں کامل قدرت تھی۔ شاعری کی طرف ایام طفولیت سے مائل تھے۔ باپ کی کڑی نگرانی اور تعلیمی پابندیوں کے باعث بیٹے کو جراٴت نہ ہوتی کہ وہ کبھی اپنے شاعر باپ کے سامنے اپنے ذوق شعر گوئی کا راز ظاہر کرتا۔ لہذا شروع شروع میں اپنے والد سے نگاہ بچا بچا کر ان کے

شاگرد ناسخ سے اصلاح سخن لیا کرتے ۔ جب ذہنی شعور بیدار ہوا تو داغ سے شرفِ تلمذ حاصل کیا ۔ اب یہ وہ وقت تھا کہ ناسخ کو دیکھ کر خوشی ہوتی کہ شمس کو لائق باپ کی لائق اولاد ہونے میں کوئی کلام نہیں رہا ۔ شمس اپنے والد کے بجائے داغ کے کلام سے بیحد متاثر ہوئے اور اسی لئے ان کے کلام میں داغ کا رنگ صاف طور پر نمایاں ہے ۔ جرأت کے رنگ میں بھی اکثر اشعار کہے ۔ چست بندشیں مضمون میں گھلاوٹ ، زبان میں حلاوت و شیرینی ۔ کلام کی نمایاں خصوصیات ہیں ۔ داغ دہلوی نے اپنے ایک مکتوب میں شمس کے کلام کی یوں توصیف کی ہے ۔

" تم اچھے تمہاری بات اچھی ، تمہاری زبان اچھی "

ایک کامیاب شاعر کی زبان دانی کی اس سے بہتر جامع و مانع سند کہیں نہیں مل سکتی ۔

ایک دفعہ شمس نے ایک غزل داغ کے پاس بغرض اصلاح بھیجی تو داغ نے بڑی تعریف کی اور یہ لکھ کر من وعن واپس کر دی ۔ " داغ اس سے بہتر نہیں کہہ سکتا ۔ " اس غزل کا مطلع ہے ؎

خفتگانِ خاک سے ہیں سلسلے ٹوٹے ہوئے
قافلے والوں سے ہیں بچھڑے ہوئے چھوٹے ہوئے

داغ عظیم آباد اور کلکتہ اکثر جایا کرتے تھے عظیم آباد میں ایک غزل کہی تھی جو بہت مشہور ہے ؎

بھویں تنی ہیں خنجر ہاتھ میں ہے تن کے بیٹھے ہیں
کسی سے آج بگڑی ہے جو وہ یوں بن کے بیٹھے ہیں
کوئی چھینٹا پڑے تو داغ کلکتے چلے جائیں
عظیم آباد میں ہم منتظر ساون کے بیٹھے ہیں

اس زمین میں امیرؔ لکھنؤ نے بھی غزل کہی تھی ؎

امیرؔ اچھی غزل ہے داغؔ کی جس کا یہ مطلع ہے

بھویں تنی ہیں خنجر ہاتھ میں ہے تن کے بیٹھے ہیں

شمسؔ نے اُستاد کی زمین میں غزل کہی۔ مقطع ہے ؎

اگر اللہ نے چاہا تو اس کافر کو شمسؔ اک دن

مسلماں کر کے اُٹھیں گے برہمن بن کے بیٹھے ہیں

داغؔ نے اس شعر کو سنکر کہا تھا کہ میں اس سے بہتر نہیں کہہ سکتا[1]"

رضا علی وحشتؔ کا ارشاد ہے "یہ میرے اُستاد کا بہترین شعر ہے۔"

معشوق کے حسن کا عالم بیان کرنا شاعر کی قدرت سے باہر ہے وہ حیران ہو کے رہ جاتا ہے اور کہتا ہے ؎

شکل وہ شکل کہ تصویر کو بھی سکتہ ہو

حسُن وہ حسن کہ رہ جایئے حیران ہو کر

جستجو لطف سے خالی نہیں ہے اگرچہ حصول مقصد محال ہے۔ یہ مضمون یوں ادا کیا گیا ہے ؎

مزے کی زیست ہے اُمیدوارانِ محبت کی

بہت اچھے ہیں وہ جو سعئی لاحاصل میں رہتے ہیں

غالبؔ نے کہا ہے ؎

تو دوست کسی کا بھی ستمگر نہ ہوا تھا

اوروں پہ ہے وہ ظلم جو مجھ پر نہ ہوا تھا

---

[1] مقالاتِ وحشتؔ

شمسؔ اس سے پہلے اپنے لئے ایک تسلی کی صورت نکال لیتے ہیں ؎

کافی ہے یہ خیال تسلی کے واسطے ۔ نالاں ان سے ایک جہاں ایک ہمیں نہیں

غالبؔ نے کہا تھا۔

واعظ نہ تم پیو نہ کسی کو پلا سکو ۔ کیا بات ہے تمھارے شراب طہور کی

شمسؔ نے اس سے یہ مضمون پیدا کیا ؎

میں جس کو پی رہا ہوں وہ حاضر ہے واعظو

تم جس کو کہہ رہے ہو وہ کیسی شراب ہے؟

شمسؔ نے ۱۹۰۵ء میں رحلت کی ان کے ہمعصروں میں مرشد آباد کے نواب نصیر الملک عارف اور عبد الحلیم عصیم یہ دو نامور شعراء تھے۔ اول الذکر خوش فکر شاعر تھے اور شعر و ادب کے بہت بڑے محسن و سرپرست آخر الذکر نالۂ عصیم، اور دیگر کئی کتابوں کے مصنف ہونے کے علاوہ اپنے زمانے کے بہترین صحافیوں میں سے تھے۔ زمانہ کانپور بہت عرصہ تک ان کی ادارت میں ہفت روزہ کی صورت میں نکلتا رہا۔ ان کے بعد پنڈت دیا نرائن نگم نے اس کی کرسئ ادارت سنبھالی۔

شمسؔ کے تلامذہ میں وحشتؔ، صولتؔ اور اکملؔ جیسے نکتہ سنج و ارباب ذوق آسمانِ ادب کے آفتاب عالمتاب بن کر چمکے جن کا تذکرہ چوتھے دور کے باب میں شامل کیا جائے گا۔

صرق میر حسین مرزا المتخلص۔ صرقؔ رئیس ڈھاکہ میر اشرف علی کے نواسے تھے۔ میر امیر علی آشنا مرشد آبادی اور غلام حیدر مجیبؔ سے کسب فیض کیا۔ ۱۸۷۱ء میں جب نساخ کا تذکرہ محسن الشعراء" زیر تصنیف تھا۔ اس وقت یہ جوان تھے۔ سخن الشعراء میں بھی ان کا حال ملتا ہے ؎

طبیعت اچھی پائی تھی۔ کلام سے شاعرانہ عظمت نمایاں ہے ؎

بخدا ترکِ آرزو کے سوا — دل میں گر کوئی آرزو بھی ہو

تمھیں صورت کا غرہ ہے تو یہاں دل کی محبت ہے

تمہارا حسن مہنگا ہے تو کس کی جان سستی ہے

ایک بندہ کی بھی جاں بخشی نہ کی — اے بتو تم سے خدائی ہو چکی

حسرت نام منشی ولیل الدین احمد تخلص حسرت۔ ان کے والد مولوی محمد فیض بخش کا وطن ڈھاکہ (جہانگیر نگر) تھا۔

حسرت ۱۸۷۸ء میں کلکتہ میں پیدا ہوئے۔ اوائل عمر سے شعر و سخن کی طرف مائل ہوئے۔ شروع میں نساخ سے اکتساب فن کیا پھر ان کے بیٹے شمس سے باقاعدہ اصلاح لی۔ اپنے استاد (شمس) کے کلام سے متاثر ہوئے اور انھیں کے رنگ میں بیشتر اشعار کہے۔

بنگال کے علاوہ انھیں متحدہ ہندوستان کے مشہور مقامات اور حیدرآباد دکن، مدراس، دہلی، وغیرہ جیسے بڑے بڑے شہروں کی سیر و سیاحت کا خوب موقع ملا۔ اور اپنے عہد کے مشاہیر ادب و اکابر سخن کی صحبتوں سے مستفید و فیضیاب ہوئے۔

فورٹ ولیم کالج میں انگریزوں کو اردو اور ہندوستانی کی تعلیم بھی دیتے رہے۔ نمونہ کلام ملاحظہ ہو ؎

کہیں تھے بادیہ پیما کہیں تھے سلسلہ جنباں

جہاں پہنچے ہمارے پاؤں میں چکر ہی چکر تھا

تری رنگین اداؤں کا وہ عالم گیر نقشہ ہے

کہ ہر ذرے سے کثرت کے عیاں ہے نور وحدت کا

بے نیازی کا ہے دعوے بیکار ایک کا ایک ہے انساں محتاج
چشم بلبل ہیں انتظار ہوں میں آمدِ موسمِ بہار ہوں میں
کیوں میں نکلوں تمہاری محفل سے دل دشمن کا کیا نجار ہوں میں

جوہر نام منشی محمد سیف اللہ خاں۔ تخلص جوہر۔ وطن و مسکن اسلام آباد منشی امیر اللہ تسلیم جو اپنے زمانے کے خوش فکر شاعر اور جید عالم تھے۔ کی ذاتِ گرامی سے بطور خاص استفادہ کیا۔ نمونۂ کلام ؎

رکتا نہیں ہے پاؤں زمیں پر غرور سے
اس رشک حور کا ہے دماغ آسمان پر
خوش نگاہوں کا نگاہوں میں سمانا ہے غضب
دیکھتے دیکھتے دل صاف چرا لیتے ہیں
ہاں سن کے مضطرب کہیں وہ فتنہ گر نہ ہو
فریاد بھی وہ کیجیے جس میں اثر نہ ہو
قتل کرنے کے لئے کیا کم ہے یہ ترچھی نظر
رکھ دے قاتل خنجر فولاد اپنے ہاتھ سے

شاہین نواب احسن اللہ شاہین کے آبا واجداد نے کشمیر سے آکر ڈھاکہ میں رہائش اختیار کرلی تھی جو قالین اور شال وغیرہ کے بہت مالدار تاجر تھے۔ شاہین کے والد خواجہ نواب عبدالغنی لاکھوں روپے کے مالک تھے۔ انھوں نے شاہین کی تعلیم کا خاص بندوبست کیا۔ انگریزی زبان کی تعلیم کے لئے ایک انگلستانی اتالیق کا ایک ہزار روپیہ ماہوار پر تقرر کیا۔ عربی و فارسی کی تعلیم کے لئے ہندوستان کے مختلف مقامات سے جید عالم و فاضل اساتذہ کو بڑی بڑی تنخواہوں پر مقرر کیا

اُردو زبان ان کے گھر کی زبان تھی اور گھر کا ماحول قطعیٔ شاعرانہ تھا۔ شاہین نہایت علم دوست اور عالموں کے دل سے قدر دان تھے۔ چنانچہ دور دراز سے اہل کمال ان کے یہاں ٹھہرتے تھے اور ان کے چشمۂ علم و دولت سے فیضیاب ہوتے تھے۔ شاہین اُردو میں بھی شعر کہتے تھے اور ہندی میں بھی گو ہندی کلام کی تعداد بہت کم ہے۔ ٹھمری، دادرے اور گیت وغیرہ میں بھی طبع آزمائی کی۔ کئی تصانیف ان کی یادگار سے ہیں جو غیر مطبوعہ ہے۔

انتقال دسمبر ۱۹۰۱ء میں ہوا ۔

کہا زخم جگر کو دیکھ کر میرے مسیحا نے
نہیں کچھ جان ہے اسمیں فقط دم شماری ہے

جو پوچھا اُس سے میں نے کیوں بھلایہ شرط الفت ہے
تو بولا کیا کریں ہنس کر یہی عادت ہماری ہے

ڈراتا کیا ہے مجھ کو ناصحا تو خوف محشر سے
اُسے جاکر نصیحت کر جسے یہ جان پیاری ہے

قربان قمر ہے ترے عارض کی ضیا پر
خورشید خدا جدّ بھی کی ضیا پر

رکھتی ہے لگا منہ ترے رخسار سے ہر دم
رشک آئے مجھے کیوں نہ تری زلف دوتا پر

شاہین اپنے ماموں عبدالغفار اختر کی شاعرانہ عظمت کے معتقد تھے اور انھیں کو اپنا کلام دکھالیا کرتے تھے۔

آشنا

نام عبدالکریم ۔ تخلص آشنا۔ کلکتہ کے رہنے والے تھے مزید حالات معلوم نہ ہوسکے ۔

ضبطِ نالاں باعثِ چاکِ گریباں ہو گیا
کام یوں دستِ جنوں کا آپ آساں ہو گیا

حمید حاجی حافظ مولوی عبدالحمید حمید کلکتہ کے نہایت قابل قدر شاعر، مجموعۂ کمالات ممتنع الصفات بزرگ اور بنگال کے دلدادگان سخن کے لئے ایک عزیز القدر نعمت تھے۔

حمید، نساخ کے تلامذہ ارشد میں سے تھے۔ کچھ دنوں انسخ کو بھی بغرض اصلاح اپنی غزلیں دکھائیں طبیعت میں بلا کی روانی اور موزونیت پائی تھی۔ سخن پر قادر تھے۔ زبان پر اچھی نظر اور فنِ عروض پر اچھی مہارت تھی۔ ان کی بدیہہ گوئی کا یہ عالم تھا کہ راستہ چلتے چلتے بات بات پر حسب حال و موقع اشعار کہا کرتے۔ بطور نمونہ چند اشعار ملاحظہ فرمایئے ؎

درد سے چارۂ دردِ دلِ شیدا ہو گا
جوشِ حرماں سببِ ترکِ تمنا ہو گا

پاس میرے بھی کبھی آیئے گا
تابکے دور سے ترسایئے گا

ہو گیا ہے عشق دل کو اُس بُتِ طناز کا
یاالٰہی ہو بخیر انجام اس آغاز کا

حیدر نام مصطفےٰ حیدر اور تخلص حیدر۔ ان کے والد مولوی غلام حیدر، مدرس مدرسہ عالیہ کلکتہ اور سررشتۂ فورٹ ولیم کالج تھے۔ حیدر کا مولد و وطن چاٹگام اور مسکن کلکتہ تھا۔ تعلیم و تربیت ان کے والد کے زیر نگرانی ہوئی۔ جب شاعری کا شوق دامنگیر ہوا تو نساخ کے شاگرد ہوئے۔ نمونہ کلام یہ ہے ؎

دل لے کے مرا صاف مُکر جاتے ہیں | جب مانگو تو جھنجھلا کے یہ کہتے ہیں کیا؟
ادھر تو دیکھو نہ بولو ذرا سنو تو سہی | شب وصال ہیں کیسی حیا سنو تو سہی
بس قتلِ عاشقاں پہ نہ بیڑا اٹھایئے | لاکھوں کا خون ہوگا نہ لکھا جمایئے

حمید قاضی حمید الدین حمید۔ علی پور نواح کلکتہ کے باشندے تھے۔ مزید حالات دستیاب نہ ہو سکے۔ ایک غزل کے تین اشعار مندرجۂ ذیل ہیں ؎

غمزہ یہ کہہ رہا ہے کسی کی نگاہ سے
بچ کر نہ جانے پائے کوئی جلوہ گاہ سے
آنکھوں میں ہے خمار پریشاں ہیں موے سر
نکلا ہے کس ادا سے کوئی خواب گاہ سے
پیر مغاں کے وصف سنائیں گے بادہ خوار
کیا پوچھتے ہو زاہد گم کردہ راہ سے

حیدر منشی حیدر علی۔ حیدر۔ خلف منشی غلام نبی باشندگان ہگلی میں سے تھے۔ نہایت خوش مزاج اور ظریف طبع شخص تھے۔ مزاحیہ کلام کہتے تھے اور خوب کہتے تھے۔ ان کا ایک شعر ہے ؎

حال دل گر کہوں تو کہتا ہے | شوق مجھ کو نہیں کہانی کا

شاکر منشی عبدالسبحان شاکر علی قاضی اکبر علی کے صاحبزادے کلکتہ کے رہنے والے، اور مولوی عظمت اللہ انیغ تلمیذ ناسخ کے شاگرد تھے۔ نمونۂ کلام ملاحظہ ہو ؎

تڑپتے ہیں ترے کوچے میں قاتل نیم جاں کیا کیا
تماشے مرغِ بسمل کے دکھاتے ہیں جواں کیا کیا

قطعہ

کاہیدگیٔ جسم کا ممنون کیوں نہ ہوں
پہونچا ہے کوئے یار میں بادِ صبا کے ساتھ
وہ دن ہیں حال آپ کا کچھ اور ہو گیا
کیا خوب ہم سے پیش تم آئے وفا کے ساتھ

شوکت منشی محمد اسمٰعیل خاں نام ۔ شوکت تخلص ۔ ساکنِ کلکتہ ناسخ کے لائق شاگردوں میں سے تھے ۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں ؎

گلہ کس سے کروں دردِ جگر کا
ہوا ہے ناک میں دم چارہ گر کا
پھر بہار آئی ہوا پھر جوشِ سودا کا فزوں
دوڑتا ہے ہاتھ پھر اپنا گریباں کی طرف

عزیز عبدالعزیز المتخلص بہ عزیز منشی کرامت اللہ رئیس کلکتہ کے خلفِ اکبر تھے ۔ اوائل عمر سے شعر کہتے تھے ۔ اصلاح کلام ناسخ سے لیتے تھے ۔ اکثر و بیشتر اشعار رنگِ قدیم میں پائے جاتے ہیں ۔ مگر صاف ، شگفتہ اور بعض بلند ہیں ۔ خیالات کی جامع بندش و مضمون آفرینی نمایاں خصوصیات ہیں ۔ اس قدر پُرگو اور زود گو تھے کہ عنفوانِ شباب ہی میں ایک ضخیم دیوان مرتب

ہوگیا جو کلکتہ سے شائع ہوا۔ کلام میں رعنائی و دلکشی کا فقدان ہے ان کے دیوان سے چند اشعار نقل کئے جاتے ہیں ؎

ذرہ افشاں یہ نہیں ہے زلف عنبر خام میں
تارے چھٹکے ہیں مقرر یہ سود شام میں

کرتے ہیں یوں مریض محبت کا وہ علاج
دیتے ہیں زہر گھول کے مجھ کو دوا کے ساتھ

خواب میں ہمکنار دلربا تھا
مجھ کو ہے ہے جگا دیا کس نے

آج خنجر بتاں سے جدا ہوتا ہے
مجھ پہ قاتل کا جو احساں تھا ادا ہوتا ہے

نادر سید انجم الدین حسین ولد سید قمر الدین متوطن میمن سنگھ مقیم ٹالی گنج نواح کلکتہ علم وطب و رمل میں ماہر تھے۔ نمونہ کلام حسب ذیل ہے ؎

ضبط کر رکھتا ہوں آہوں کو دل غمناک میں
ورنہ اس چرخ ستمگر کو ملا دوں خاک میں

جو نیند آگئی تم کو تو ہاں سمجھ لوں گا
"نہیں نہیں" یہ تمہاری مجھے پسند نہیں

نامی میر وزیر علی ابن میر حسن علی آغاز شاعری میں آغا جو شرف لکھنوی مقیم مٹیا برج کلکتہ سے استفادہ کیا۔ بعدہٗ سید محمود آزاد ساکن ڈھاکہ سے مشورۂ سخن کیا۔ ۱۳۲۷ھ میں ۶۰ سال کی عمر میں رحلت کی۔

نمونۂ کلام یہ ہے ؎

نشۂ حسن میں ہو چور رکھو ہوش میں پاؤں
شیشۂ دل کے ہیں ٹکڑے حذف راہ کیا تھ

سنتے ہیں غیر غیر کا حال آئے دوڑے وہ　　آنکھیں پرآب زلف پریشاں کئے ہوئے

بیدار نام خواجہ محمد بیدار بخت، تخلص بیدار۔ ان کے والد ماجد کے نام خواجہ محمد اکبر نقشبندی تھا۔ سن ولادت ۱۰ر مارچ ۱۸۸۴ء بمقام ڈھاکہ ہے انگریزی - فارسی - عربی و اُردو میں استعداد کامل تھی۔ بیدار نے ۱۰ سال کی عمر میں جو پہلی غزل کہی اس کا مطلع سُنئے ؂

جو اس بت پر آئی تو کیا ہے کسی کا　　طبیعت پہ بھی بس چلا ہے کسی کا

سرزمین بنگال میں جن شعراء کو مرزا نواب خاں داغ دہلوی سے شرفِ تلمذ حاصل تھا ان میں شمس کی طرح بیدار کا نام بھی خصوصیت کے ساتھ لیا جا سکتا ہے۔ داغ سے بذریعہ خط و کتابت اصلاح لیتے تھے اُردو ادب میں گرانقدر سرمایہ کی حیثیت رکھتے ہیں۔

بیدار کلام داغ سے بیحد متاثر تھے۔ اور ان کا کلام خصوصیت کیساتھ مزے لے لے کر بڑھا کرتے ہر شعر کے فنی و معنوی پہلوؤں پر غور و فکر کرتے اور ان سے استفادہ کرنے کی کوشش کرتے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے افکار بھی خصوصیات داغ سے مملو ہیں۔ دہلی کی زبان و محاورے ان کی شاعری میں بدرجہ اتم موجود ہیں۔

ڈاکٹر عندلیب شادانی اپنے ایک قابل قدر مقالہ[۱] میں تحریر فرماتے ہیں بیدار مرحوم کے کلام کے متعلق یہ بات خاص طور پر قابل ذکر ہے کہ جو غزلیں وہ استاد کے پاس اصلاح کی غرض سے بھیجا کرتے تھے ان میں بہت کم اصلاح کی گنجائش ہوتی تھی چنانچہ ان چار غزلوں میں سے ایک غزل کے

---

[۱] مشرقی پاکستان کے اُردو ادیب

متعلق استاد (داغ) نے لکھا ہے ۔ " آپ نے غزل خوب کہی ۔ مجھے بہت پسند آئی ۔" اور پانچ شعروں پر صاد بنا دیا ہے جو خصوصیت کے ساتھ پسندیدگی کی علامت ہے ۔ ان میں سے دو شعر سنیئے ؎

ہمارے گھر بھی وہ آئے، گئے غیروں کے بھی گھر میں
مگر تھا فرق یہ ٹھہرے کہیں دم بھر کہیں برسوں

بجا ہے تم تو وعدے کے بڑے سچے ہو کیا کہنا
ہمیں جھوٹے ہیں دم دیتے رہے تم کو ہمیں برسوں

اس شعر میں استاد کا رنگ کس درجہ نمایاں ہے ۔ مقطع سنیئے ؎

نہیں پہچانتے تم کون وہ محفل میں بیٹھا ہے
وہی بیدار ہے جو رہ چکا ہے دلنشیں برسوں

ایک اور غزل کے متعلق استاد نے فرمایا ہے ۔ " خواجہ صاحب آفریں ہے کیا غزل کہی ہے ۔" اس کے چند شعر سُنیئے :؎

چار دن بھی نہ رکھا چرخ نے شاداں مجھ کو
دیدیا درد و غم و رنج فراواں مجھ کو

طور بے طور ہیں دو دن میں وہ کھُل کھیلیں گے
اب نظر آتے ہیں کچھ اور ہی ساماں مجھ کو

شکوۂ جور پہ محشر میں یہ ان کا کہنا
جمع عام میں کیجئے نہ پشیماں مجھ کو

بت پرستی میں تو بیدار کٹی ساری عمر
لوگ کیا دیکھ کے کہتے ہیں مسلماں مجھ کو

بیدار کا ایک مقطع تھا ؎

وہ عاشقِ جانباز وہ شیدائی تمھارا
بیدارؔ جو تھا مر گیا کچھ تم نے سنا بھی

اس مقطع کے متعلق استاد کا ریمارک اور اصلاح نہایت دلچسپ ہے فرماتے ہیں ؎

"ایسا منحوس مقطع سننا گوارا نہیں کرتا۔ اس وجہ سے ناگوار ہوا۔ اور اس کو بدل دیا۔"

اُستاد کی اصلاح کے بعد مقطع کی یہ صورت ہو گئی ؎

وہ عاشقِ دلدادہ وہ جانباز تمہارا
بیدارؔ کسی اور سے اٹکا ہے سنا بھی

واقعہ یہ ہے کہ اس اصلاح کے بعد مقطع بہت خوب ہو گیا اور استاد کا خاص رنگ بھی اس میں پیدا ہو گیا جو انھیں کا حصہ ہے۔

بیدارؔ کا یہ مقطع بھی خوب ہے ؎

کٹی آنکھوں میں شب غم نہ بر آئی اُمید
میں ہوں بیدارؔ مگر بخت تو بیدار نہیں

اعظمؔ | خاں بہادر خواجہ محمد اعظم خواجہ عتیق اللہ شیداؔ کے بڑے صاحبزادے ہیں۔ اُردو شعر و ادب کا مذاق ورثے میں ملا ہے۔ نثر سے خاصی دلچسپی ہے ان کا ناول "بڑی بہو" جو دراصل بنگلہ زبان سے ترجمہ ہے قابل ستائش ہے۔

احسنؔ | مشرقی بنگال میں شفاء الملک حکیم حبیب الرحمن المتخلص بہ احسنؔ کی خدمات قابل قدر ہیں اپنے زمانے کے بلند پایۂ انشاء پرداز اور باکمال شاعر تھے۔ حکیم صاحب کے آباؤ اجداد پشاور کے رہنے والے تھے۔

ان کے والد ماجد پشاور سے دیو بند آگئے اور وہیں فارغ التحصیل ہوئے۔ مولانا اشرف علی تھانوی ان کے ہم سبق تھے۔ اس کے بعد ڈھاکہ میں آئے اور یہیں کے ہو رہے۔

بنگال کے عربی داں لوگوں میں علم طب کے فروغ دینے اور غربا کی طبی امداد کی غرض سے ڈھاکہ میں ۱۹۳۳ء میں " طبیہ حبیبیہ کالج " کی بنیاد ڈالی یہ کالج آج تک قائم ہے گو پہلے کی نسبت زیادہ ترقی پذیر نہیں۔

حکیم حبیب الرحمن کی ولادت ۱۸۸۱ء اور وفات ۱۹۴۷ء بمقام ڈھاکہ ہوئی۔ ڈھاکہ میں مشرقی پاکستان کا سب سے پہلا اخبار " المشرق " ۱۹۰۶ء میں انھیں کی ادارت میں نکلا تھا۔ " الفاروق " " حیاتِ سقراط " کے علاوہ ۱۹۳۳ء میں ماہنامہ جادو ڈھاکہ جاری کیا ان کی تصانیف میں " ثلاثہ غبار " " آسودگانِ ڈھاکہ " " مساجد ڈھاکہ " " ڈھاکہ اب سے پچاس برس پہلے " " کچھ اپنی باتیں " " ڈھاکہ کی تاریخی عمارتیں " وغیرہ قابلِ ذکر ہیں۔

بچپن سے شعر کہتے تھے۔ لکھنؤ۔ دہلی، آگرہ اور کانپور کی خوب خوب سیر کی اور وہیں دینیات و طب کے درس سے سبکدوش ہوئے۔ بڑے بڑے مشاعروں میں بھی برابر شرکت کی۔ مرحوم شعر بہت کم کہتے تھے ؎

زاہدِ خستہ تنبانے کے نہیں ہم تجھ کو
کعبہ یا دیر غرض ہم نے کہیں دیکھ لیا

جھک پڑا سجدہ بت کے لئے توبہ توبہ
ہم نے احسنؔ ترا ایمان ترا دین دیکھ لیا

خالد

محمود الرب صدیقی جو ادبی دنیا میں خالد بنگالی کے نام سے مشہور ہیں۔ ضلع میمن سنگھ (مشرقی بنگال) کے بولائی نامی

ایک گاؤں کے رہنے والے تھے مولانا عبدالحی اختر جو تقریباً پچاس سے زائد کتابوں کے مصنف تھے۔ خالد کے والد ماجد تھے۔ خالد نبگالی کا شمار بیسویں صدی کے اولیں دور کے مایہ ناز وجلیل القدر انشاء پرداز اور ممتاز و باکمال شاعروں میں ہوتا ہے۔ آج سے تقریباً پچیس تیس سال قبل خالد کے علمی مضامین اور نظمیں نبگال اور بیرونِ نبگال کے رسائل وجرائد مثلاً نقاد آگرہ، حرم میلی بھیت (یو۔ پی)، عالمگیر لاہور، جدید اُردو کلکتہ وغیرہ میں برابر شائع ہوا کرتے۔

۱۹۲۴ء میں خالد نبگالی نے بولائی جیسے مقام سے ماہنامہ اختر جیسا کامیاب اور معیاری صحیفہ جاری کر کے اُردو زبان سے والہانہ محبت اور ادب کی بے لوث خدمت کا جو ثبوت دیا۔ اس کی مثال اُردو کی تاریخ میں خال خال ہے اس پرچہ کی مقبولیت کا اندازہ اس امر سے بخوبی ہو سکتا ہے کہ اس کے اوراق ملک کے مشاہیر اہل قلم وحشت کلکتوی، ناطق لکھنوی۔ آرزو لکھنوی۔ نیاز فتحپوری۔ دل گیر الہ آبادی۔ مائل الہ آبادی وغیرہ کے رشحات لطیف وجمیل سے مزین ہوتے۔

خالد نے اختر کے سب سے پہلے شمارے میں جو اداریہ لکھا اس کی چند سطریں ملاحظہ فرمایئے اور اندازہ کیجیے کہ نبگال کے ایک گمنام دور افتادہ چھوٹے سے دیہات میں بھی اُردو زبان سے کس قدر دلچسپی تھی صرف یہی نہیں بلکہ یہ مضمون اُردو ادب میں ایک شاہکار کی حیثیت رکھتا ہے۔

" اختر ایک اُردو رسالہ ہے اور مجھے اس سے انکار نہیں کہ اس کی اشاعت ایک ایسے مقام سے ہو رہی ہے جہاں اس رسالہ کی زبان (یعنی اردو) بعض بعض حلقوں میں صرف سمجھی جاتی ہے۔ اُردو سے اس قدر بے گانہ

وثی دیکھتے ہوئے بھی مجھے خوب معلوم ہے کہ بنگال کے اکثر مسلمان گھرانے جن کی مادری زبان آج بنگالی ہے ان لوگوں کی نسلیں ہیں جو عربی، فارسی یا اردو کے بولنے والے تھے۔ واقعاتِ تاریخی ایک طرف اس امر کی بین شہادت خود ان گھرانوں کی زبان ہی جس میں مذکورہ زبانوں کے ہوبہو اور بعض کی قدر تبدیل مخارج کے ساتھ بہ کثرت پائے جاتے ہیں۔ اس لئے ان میں اشاعتِ اردو کی دشواری کسی طرح میری سمجھ میں نہیں آتی۔

اردو وہ زبان ہے جس کی ہمہ گیری اور مقبولیت آج تاریخ السنۂ عالم کا زریں واقعہ اور نہایت درخشاں کارنامہ ہے۔ مشرقی بنگال میں جن لوگوں کو آج مذاق اردو سے بیگانۂ محض پاتا ہوں اور جن حالتوں میں اشاعت اردو کی سعی کرتے ہوئے ایک سے زائد اسباب کی بناء پر مجھے پس و پیش ہے یہ ان اسلاف کی یادگار ہیں ان بزرگوں کی اولادیں ہیں جن کی صحبتوں میں آکر مصر، بغداد، اور اصفہان و شیراز کے سیاح بولئے انھیں پالئے اور تھوڑی دیر کے لئے اپنے مرز بوم کی یاد فراموش کر بیٹھے تھے۔

مصنف نصیر الدین حیدر مرحوم مولف "سہیل یمن"، جن کی غیر مطبوعہ مثنوی "بکاؤلی" اردو کے دور اول کی قابلِ رشک مثال کہی جا سکتی ہے دونوں اسی بنگالہ کے رہنے والے تھے۔ اور دونوں نے اس سرزمین میں رہ کر پرورش پائی تھی۔ جس کے ذرے آج آپ کی بدذوقی اور جمود فطرت پر نالاں ہیں۔"

خالد کی نثر نگاری کے بہت سے نادر نمونے پیش کئے جا سکتے ہیں مگر طوالتِ ضخامت کے خوف سے قاصر ہوں۔ خالد کے مکاتیب بھی اردو ادب میں شاہکار کی حیثیت رکھتے ہیں۔ جو غالب اور سرسید احمد خاں

کے مکتوبات سے ہرگز کم نہیں۔

خالدؔ بنگالی نہ صرف بنگلہ بلکہ فارسی اُردو، عربی زبانوں پر بھی حاوی تھے اور ہر زبان کی جملہ اصناف پر اہلِ زبان جیسی قدرت رکھتے تھے ان کی تالیفات وتصنیفات میں "واقعاتِ پدر دلپسر" قابلِ ذکر ہیں انھوں نے ہر صنفِ سخن پر طبع آزمائی کی ان کا کلام ہر رنگ وہر خوبی سے مملو ہے غزلوں اور نظموں کی تعداد بے شمار ہیں۔ میرے پاس ان کی کئی غیر مطبوعہ نظمیں موجود ہیں جو تقسیم ملک سے پہلے کلکتہ میں ابوالکارم سلیم اللہ فہمیؔ کے توسط سے دستیاب ہوئی تھیں جی چاہتا ہے کہ سب کی سب نقل کر ڈالوں مگر یہاں اس کی گنجائش نہیں۔ ضخامت میں ناگوار حد تک اضافہ ہو جائے گا۔ پھر نظم جب تک پوری کی پوری نقل نہ کی جائے لطف نہیں آتا۔ بقول سلیم اللہ فہمی — زبان پر بے پناہ قدرت، محاورات اور روزمرہ کے استعمال میں یدطولیٰ۔ ان خوبیوں نے ان کے کلام کو بڑا مقبول بنا دیا ہے۔ مضبوط اور ریختہ زبان میں تصوف اور فلسفہ کی چیزیں اپنا بلند مقام رکھتی ہیں۔ غزلوں میں محبت کی چاشنی کا رنگ خاص ہے۔ جذبات انداز بیان، ترنم اور زبان کا لطف انکے کلام کو بہت ممتاز بنا دیتا ہے۔

بطور نمونہ از خروارے ایک نعت پیش کرتا ہوں جو اپنی گوناگوں خوبیوں کے باعث خالدؔ کو حیات جاودانی بخشتی ہے اردو ادب میں نعت کی ایسی نادر مثال شاذ و نادر ہی ملتی ہے ؎

صلی اللہ علیہ وسلم

خسروِ سرمد تخت نہ مسند، فخرابِ وجد یعنی محمدؐ

نورِ ممجد، روحِ معنبر صلی اللہ علیہ وسلم

گوہر وحدت، آیہ رحمت، کان فتوحات بحر نبوت
عاشق امت، شافع محشر، صلی اللہ علیہ وسلم

جانِ دو عالم، حق کے مکرم، اپنے رب کی شانِ معظم
لطفِ مجسم، خاصۂ داور، صلی اللہ علیہ وسلم

یاد نبی ہے یمین سے مملو، روز شفاعت ثقلِ ترازو
جسم کی خوشبو! عطر سے بڑھ کر صلی اللہ علیہ وسلم

نور سے جس کے طور ہوں سینے، بغض ہو دل میں اور نہ کینے
جاؤ مدینے گر نہیں باور، صلی اللہ علیہ وسلم

مجد شمائل، وصف میں کامل، اقصیٰ جن کی پہلی منزل
سیّد عادل، فقر کے باور صلی اللہ علیہ وسلم

نیر بطحیٰ، انجم طٰہٰ، ماہ دنیٰ اور مہر تدلّیٰ
زینت کعبہ رونق ممبر صلی اللہ علیہ وسلم

امنِ ایماں، ملجا، عرفاں، سایہ یزداں، رکن عزیز
حسن کے ارماں، عشق کے دلجو، صلی اللہ علیہ وسلم

ہیبتِ حقہ، نکبت باطل، شوکتِ عظمیٰ، قدرت کامل
حکمت فاضل، حرکت رہبر صلی اللہ علیہ وسلم

جلوۂ عارض، شکل احد میں، صبح ازل ہیں، نور صمد میں
شام ابد میں، ظلمت گیسو صلی اللہ علیہ وسلم

جاہِ سکندر، حشمتِ کسریٰ۔ گرد سواری اللہ اللہ
عرش پہ تکیہ فرش پہ قابو، صلی اللہ علیہ وسلم

حسن سے روشن کعبۂ یزداں، رشک سے گلشنِ معبدِ گبراں
لُطف سے شاداں جبریل امیں صلی اللہ علیہ وسلم
ہونٹوں پہ شیدا، حسن تکلم، کیف کی جنت وجہ تبسم
جز و تنعم، آبروئے دیں صلی اللہ علیہ وسلم

۱۔ ایک غزل کے چند اشعار بھی سن لیجئے ۔
ہنی منطق اب ہوئی رہ نما، وہ پرانی طرز سخن گئی
یہ سرود بربط نو سنو کہ نوائے سازِ کہن گئی
غم عمر خضر جنہیں رہا یہ بتائیں دہر سے کیا ملا
نہ نصیب غایت خرمنی نہ وہ فکر گور و کفن گئی
مجھے خالد اب نہیں اس کا غم نہیں مجھ پہ وہ نگہِ کرم
میں دل اپنا ان سے طلب کروں کہیں جان پر جو بن گئی

ان کے شاگردوں میں محمودؔ بنگالی، احمد خضر بولانیؔ اور حبیبؔ بنگالی پرگو اور ممتاز شاعر ہیں ۔

عبدالکریم

مولانا عبدالکریم سلہٹی بی اے۔ ایم۔ ایل سی بنگال کی ان معدودے چند قابل قدر ہستیوں میں سے تھے جنھوں نے انگریزی و اردو زبان کی تعلیم و ترقی کی غرض سے دامے، درمے، قلمے، سخنے بے لوث خدمات انجام دی ہیں۔ پروفیسر عبدالرحیم ایم۔ اے (علیگ۔ ڈھاکہ) کے بڑے بھائی تھے۔ عبدالکریم شاعر نہ تھے۔ مگر اس کے سوا بہت کچھ تھے، نامور سیاست داں، قوم و ملک کے سچے بہی خواہ و ہمدرد، اردو، فارسی، عربی و انگریزی ادب کے ماہر، مشہور صحافی اور بے شمار کتابوں کے مصنف تھے۔

۱۸۸۵ء میں بی اے پاس کرنے کے بعد کلکتہ سے ایک روزانہ

اخبار " دارالسلطنت" نکالا اس زمانے میں یہ اخبار کلکتہ کا واحد مقبول عام وخاص اخبار تھا۔ مضامین کا حصّہ اس اعتبار سے کافی بلند اور اچھوتا ہوتا تھا کہ اس کے مضامین انگریزی پر لکھے جاتے تھے۔ اس کا یہ کارنامہ بھی قابل ستائش ہے کہ انھوں نے بنگال میں لارڈ اردن کے عہد میں اردو زبان کی حمایت میں سب سے پہلے ورنا کیولر پریس ایکٹ VERNACULAR PRESS-ACT جاری کرایا تھا۔

ان کی متعدد علمی، ادبی، مذہبی، تاریخی اور سیاسی تصانیف کی صراحت حسب ذیل ہے۔

۱۔ تاریخ ہند ۔ اردو اور انگریزی میں ۔ HISTO OF INDIA ہسٹری آف انڈیا فار بگینرز، FOR BEGINNERS کے نام سے شائع ہوئی ۔ بنگال اور بہار کے علاوہ حیدرآباد دکن کے اسکولوں میں بھی منظورشدہ تھی ۔ اخبارات وجرائد مثلاً زمانہ کانپور، الہلال، کلکتہ (جس کے ایڈیٹر مولانا ابوالکلام آزاد تھے) وغیرہ میں تحسین آمیز تبصرے شائع ہوئے تھے۔ علامہ شبلی نعمانی۔ مولانا الطاف حسین حالی ۔ شمس العلماء سید امداد امام شاد عظیم آبادی وغیرہ جیسے یگانۂ روزگار مورخ و اہل علم وعمل نے بھی اس کتاب کی بیحد تعریف کی ۔ مشاہیر کی آراء سے قطع نظر یہ امر اس کی انتہائی مقبولیت کا ثبوت ہے کہ سات بار اس کی اشاعتیں ہوئیں (۱۸۹۶ء تا ۱۹۳۶ء)

(۲) بھارت برشیر اتیھاکش ــــ بنگالی اور ہندی زبان میں ۲۷ ایڈیشن شائع ہوئے ۔

آخری ایڈیشن کا سن اشاعت ۱۹۳۰ء ہے یہ کتاب بھی کلکتہ

اور بہار کی یونیورسٹی کے نصاب میں داخل ہے۔

۳۔ اسلام اور عروج سائنس و تمدن

اس کے علاوہ متعدد کتابیں انگریزی زبان میں لکھیں۔ جن کے ترجمے اردو اور بنگلہ زبانوں میں ہو چکے ہیں۔ ڈاکٹر رابندر ناتھ ٹیگور جیسے شہرہ آفاق فن کار نے آخرالذکر کتاب کی بہت تعریف کی تھی۔

عبدالکریم کے سوانح حیات اور کارنامے انگریزی زبان میں LIFE OF ABDUL KARIM کے نام سے طبع ہو چکے ہیں

مندرجہ بالا کتابیں خاکسار مولف کے ذاتی کتب خانے میں محفوظ ہیں جو ان کے بھائی پروفیسر عبدالرحیم صاحب کی عطیہ ہیں۔

چوتھا دور

سنہ ۱۹۱۰ء تا سنہ ۱۹۵۴ء

آزاد، وحشت، ناطق و آرزو کا زمانہ

تمہید چوتھا دور، یعنی دورِ حاضرہ، کو ترقی و ارتقاء کے دور سے منسوب کیا جاسکتا ہے۔ بیسویں صدی میں اُردو ادب جس ترقی و عروج کی منزل پر گامزن ہے وہ اظہر من الشمس ہے۔ گذشتہ چالیس سال سے اُردو نظم و نثر میں گراں قدر قابلِ رشک اضافہ ہوتا رہا ہے برِصغیر ہند و پاک کے دیگر مقامات میں جہاں آثر لکھنوی، جوش ملیح آبادی

نیاز فتحپوری ۔ حسرت موہانی مرحوم ۔ صفی لکھنوی مرحوم ، نوح ناروی مرحوم سیماب اکبر آبادی مرحوم ، محوی صدیقی ۔ بیخود دہلوی وغیرہ جیسے اساتذہ فن وسخن کا طوطی بول رہا ہے ۔ وہاں مشرقی و مغربی بنگال میں ابوالکلام آزاد ۔ رضا علی وحشت ، ناطق لکھنوی مرحوم ۔ آرزو لکھنوی مرحوم ۔ شرف الحسین شرف ۔ عندلیب شادانی کیفی چڑیا کوٹی تمنا عمادی پھلواروی ، اثر رودولوی وغیرہ جیسے یکتائے روزگار سخن سنج و مشاہیر ادب کی شمع تخلیقات سے محفل شعر و ادب جگمگا رہی ہے ۔

زندگی کی جن قدروں کے تحت ملک کے دو ٹکڑے ہوئے ان کا اثر ہمارے ادب ، زبان ، کلچر ، تمدن ، ثقافت اور ہر شعبۂ حیات پر پڑنا لازمی تھا ۔ تقسیم ہند کے ساتھ ساتھ ادب اور زندگی کا بھی بٹوارہ ہو گیا زندگی نے نئی کروٹیں بدلیں اور ادب نے نیا راستہ اختیار کیا ۔ ہمارے فن کار اس انقلابِ عظیم سے کس قدر متاثر ہوئے اس کا اندازہ ان کی موجودہ تخلیقات سے لگایا جا سکتا ہے ۔

۱۹۴۷ء میں تقسیم بنگال کے زیر اثر اکثر ارباب علم و ادب مغربی بنگال سے مشرقی بنگال کے ڈھاکہ ، چاٹگام ، سلہٹ ۔ کھلنا اور دیگر مقامات میں منتقل ہو چکے ہیں ۔ کلکتہ کے ارباب ذوق کے علاوہ بہار اور یو ، پی کے اکثر مشہور اور ہونہار شعراء و ادباء نے بھی مشرقی بنگال میں سکونت اختیار کر لی ہے ۔ جو اپنے اپنے طور پر اردو زبان کی ترقی و ترویج اور توسیع و اشاعت میں مصروف ہیں سچ تو یہ ہے کہ انھیں کی بدولت مشرقی بنگال میں اردو زبان و ادب کے ایک نئے دور کا آغاز ہو چکا ہے ۔ خصوصاً ڈھاکہ کی موجودہ ادبی سرگرمیاں اس بات

کی ضامن ہیں کہ وہ دن دور نہیں جب ڈھاکہ بھی اپنی روایاتی شان کی طرح اردو کے بڑے مرکزوں میں شمار ہونے لگے گا۔

چوتھا دور، عصر حاضر کے شعراء و ادباء پر مشتمل ہے جنھیں حسب ذیل چار گروپ میں بلحاظِ عمر، مشقِ سخن و معیار شاعری تقسیم کیا گیا ہے۔

پہلا گروپ — دور حاضر کے اساتذہ کا حال مثلاً رضا علی وحشتؔ، ابوالکلام آزادؔ، ناطقؔ لکھنوی، عندلیب شادانی ——— شرف الحسین شرفؔ وغیرہ۔

دوسرا گروپ — وہ شعرائے کرام جو موجودہ دور کے اساتذہ کے بعد صفِ اول میں جگہ پانے کے مستحق ہیں۔ مثلاً جمیل مظہری، آصفؔ واصفؔ پروفیسر نجود وغیرہ۔

تیسرا گروپ — ان شاعروں اور ادیبوں کا تذکرہ ہے جن کی مشقِ سخن تقریباً بیس، پچیس ۲۰،۲۵ سال سے جاری ہے۔

چوتھا گروپ — ابھرتے ہوئے نوجوان شعراء وانشاء پرداز کا مختصر حال جن کی ادبی عمر کم ازکم دس سال اور زیادہ سے زیادہ پندرہ سال ہے۔

پہلا گروپ

چوتھا دور

آزاد محی الدین احمد نام ابو الکلام کنیت، آزاد تخلص۔ امام الہند لقب۔ آبائی وطن دہلی۔ آزاد کے والد ماجد مولانا خیر الدین مرحوم ۱۸۵۷ء کے غدر دہلی کے بعد سرزمین حجاز تشریف لے گئے۔ اور مولانا ابو الکلام آزاد کی ولادت باسعادت بمقام مقدس مکہ معظمہ ۱۸۸۸ء میں ہوئی۔ اوائل عمر میں ہندوستان تشریف لائے اور سرزمین بنگال کے شہر کلکتہ میں مستقل بود و باش اختیار کرلی۔ مولانا آزاد اپنے نام اور ولادت سے متعلق خود تحریر فرماتے ہیں:[1]

یہ غریب الدیار عہد ناآشنائے عصر، بیگانۂ خویش و نمک پروردہ

---

[1] تذکرہ آزاد ص ۲۹۷

ریش معمورۂ تمنا و خرابۂ حسرت کہ موسوم بہ احمد و مدعو با بی ابو الکلام ہے ــــ
۱۸۸۸ء مطابق ذوالحجہ ۱۳۰۵ھ میں ہستی عدم سے اس عدم ہستی نما میں
وارد ہوا اور تہمتِ حیات سے متہم الناس نیام، اذا ماتوا فانتبھوا

شورے شد واز خواب عدم چشم کشودیم
دیدیم کہ باقیست شب فتنہ غنودیم

والد مرحوم نے تاریخی نام "فیروز بخت" رکھا تھا۔ اور مصرعہ ذیل
سے ہجری سال کا استخراج کیا تھا۔

"جواں بخت وجواں طالع، جواں بادا!"

مولانا آزاد کی تعلیم و تربیت، شہرت و عزت علمی و سیاسی زندگی کلکتہ
کی آغوش میں پروان چڑھی۔ ان کی اکثر تصانیف بھی یہیں پایۂ تکمیل کو پہنچیں
مولانا نے اکثر کلکتہ کو اپنے وطن سے تعبیر کیا ہے۔ چنانچہ لکھتے ہیں

۲۳ مارچ ۱۹۱۶ء کو گورنمنٹ بنگال نے ڈیفنس ایکٹ کی دفعہ۳
کی بنا پر حکم دیا ہے کہ ایک ہفتہ کے اندر حدود بنگال سے باہر چلا جاؤں۔
اِن الحکم الا للہ!

رونا کہاں ہوا مجھے دل کھول کر نصیب
دو آنسوؤں میں نوح کا طوفان آگیا۔

۳۰ مارچ کو کلکتہ سے کہ سالہا
سال کے مستقل قیام کی بنا پر بجا نہیں۔ اگر وطن کہوں نکلا اور رانچی پہنچا۔

نگم نقب ہمی زد بہ نہاں خانۂ دل
مژدہ باد اہل دیارا کہ زمینداں رفتم

۲؎ تذکرۂ آزاد ص ۳۱۵

اس میں شبہ نہیں کہ سیاست نے ایک چوٹی کے سیاست داں کی حیثیت سے مولانا آزاد کو دنیائے ادب سے دور رکھا۔ لیکن مولانا کی فقہ، حدیث، علوم اسلامی، ادبیات، اُردو، عربی و فارسی میں بے پناہ قدرت اور بے نظیر قابلیت نہ صرف مسلم بلکہ رہتی دنیا تک زندہ جاوید رہیگی۔ مولانا کی عدیم المثال بے شمار تصانیف دنیائے علم مذہب و ادب کے لیے مشعل راہ کی حیثیت رکھتی ہیں۔ مولانا جتنے بڑے عالم اور مشہور مصنف ہیں۔ ویسے ہی عدیم المثال مقرر بھی۔ اور صحیح معنوں میں ابوالکلام ہیں۔ ان کی تحریر و تقریر میں خطیبانہ جوش اور عالمانہ وقار ہوتا ہے۔ طرز تحریر بالکل نیا اور اچھوتا ہے۔ جس انداز میں وہ لکھتے ہیں اُس میں اُن سے پہلے کسی نے نہیں لکھا تھا اور نہ آج تک کوئی شخص ان کے طرز نگارش کی کامیابی کے ساتھ نقل یا تقلید کر سکا۔ مولانا کو انتخاب الفاظ میں بڑا کمال حاصل ہے عربی کے دقیق سے دقیق الفاظ، فارسی کی لطیف سے لطیف ترکیبیں اور اُردو کے دلچسپ سے دلچسپ محاورے ایسی خوبی، بے ساختگی اور لطافت کے ساتھ استعمال کرتے ہیں کہ اپنا جواب نہیں رکھتے۔ موقع و محل کے لحاظ سے اُردو، فارسی و عربی زبان کے اشعار بھی جا بجا اس موزونیت اور کثرت سے استعمال کرتے ہیں کہ اسلوبِ نگارش میں چار چاند لگ جاتے ہیں۔ غرضکہ آزاد اُردو ادب میں اپنی انفرادیت کے اعتبار سے بہت بلند مقام پر نظر آتے ہیں۔

مولانا ابوالکلام آزاد کی تصنیف لاتعداد ہیں۔ ان کا بہترین کارنامہ قرآن مجید کا ترجمہ اور تفسیر ہے موجودہ علوم مشرقی و مغربی کے پیش نظر یہ ترجمہ اور تفسیر قرآن اپنی مثال آپ ہے۔

جنگ طرابلس کے زمانے میں مولانا نے کلکتہ سے ایک ہفتہ وار اخبار "الہلال" جاری کیا۔ الہلال کے ساتھ ان کی سیاسی زندگی کا آغاز ہوتا ہے الہلال کے بعد البلاغ کا اجرا ہوا لیکن یہ زیادہ دنوں زندہ نہ رہ سکا۔

وحشت

سید رضا علی نام، وحشت تخلص، ۱۹۳۱ء میں سرکار برطانیہ کی طرف سے خطاب "خان بہادر" تفویض ہوا۔

خان بہادر پروفیسر سید رضا علی وحشت کے جدامجد حکیم غالب علی مرحوم نے اپنے آبائی وطن دہلی سے نکل کر ہوگلی (جو بنگال میں شہر کلکتہ کے قریب ہے) سکونت اختیار کی۔ آپ کے پدر بزرگوار حکیم مولوی شمشاد علی ہوگلی کے رہنے والے تھے۔ حکیم صاحب بھی شعر و سخن کا ذوق رکھتے تھے فارسی اور اردو دونوں میں طبع آزمائی فرماتے تھے۔

وحشت کی تاریخ پیدائش ۱۸ نومبر ۱۸۸۱ء بمقام کلکتہ ہے۔

۱۹۰۸ء میں مدرسہ عالیہ کلکتہ سے انٹرنس پاس کیا۔ اگرچہ یونیورسٹی کی کوئی سند نہیں رکھتے۔ لیکن بطور خود مطالعہ کتب سے ایک امتیازی استعداد و قابلیت حاصل کرلی۔ انگریزی لٹریچر سے بھی خاصی دلچسپی رہی ہے۔ اس زبان میں ان کی کئی درسی کتابیں انگریزوں کو اردو سیکھنے میں بڑی مددگار ثابت ہوئیں۔ علمی و ادبی مضامین "مسلم انسٹی ٹیوٹ ریویو" اور دیگر انگریزی کے معیاری جرائد کے ذریعہ منظر عام پر آچکے ہیں۔

کچھ عرصہ تک پرشین آفس امپریل ڈیپارٹمنٹ میں چیف مولوی کے

لہ الہلال پر تبصرہ "بنگال میں اردو صحافت" کے باب میں ملاحظہ فرمائیے۔

عہدے پر فائز رہے۔ ۱۹۲۶ء میں جب اسلامیہ کالج کلکتہ عالم وجود میں آیا تو اُردو و فارسی کے پروفیسر مقرر ہوئے۔ پنشن کے بعد دوبارہ ۱۹۴۱ء تا ۱۹۴۷ء لیڈی رابورن کالج کے عہدۂ پروفیسری پر مامور رہے۔ آج کل ڈھاکہ (مشرقی پاکستان) میں قیام فرما ہیں۔

وحشتؔ، علامہ اقبال، حسرت موہانی، سیماب اکبر آبادی، جوشؔ ملیح آبادی۔ بیخودؔ دہلوی اور آثرؔ لکھنوی کے ہم عصر ہیں۔ عصرِ حاضر کی شاعری میں ان کا شمار ان مغتنم نفوس میں ہوتا ہے جن کے دم سے اعتبارِ فن باقی اور حُسنِ تغزل زندہ ہے۔

۱۸۹۶ء یعنی ۱۵ سال کی عمر سے شعر و سخن کی طرف مائل ہوئے ابوالقاسم محمد مظہر الحق شمس مرحوم کے شاگرد ہیں۔ ۱۹۰۵ء میں جب شمسؔ نے رحلت فرمائی تو بجز ذوقِ سلیم ان کا کوئی رہنما نہ رہا۔ موزونیٔ طبع بھی رہبرِ صادق کا کام کرتی ہے۔ جس کا ثبوت یہ ہے کہ وحشتؔ نے اپنے استاد کی روش کو چھوڑ کر مرزا غالبؔ کے اندازِ بیان کو پسند کیا اور تتبع فرمانے لگے۔ اس تتبع میں کس درجہ کامیاب ہوئے۔ وہ کلام کے مطالعہ سے ظاہر ہے۔ طبیعت کا میلان اُردو سے زیادہ فارسی کی جانب تھا مگر چونکہ اس زبان میں کوئی ہمعصر نہ رہا اس لئے فارسی گوئی کم کردی۔ ابتداً طبیعت کسی قدر دقت پسند تھی لیکن اب اس روش سے اجتناب ہے۔ قدیم تغزل کے دلدادہ ہیں۔ فارسی ترکیبوں سے اکثر کام لیتے ہیں۔ جس سے کلام میں ایک دل کشی اور رعنائی پیدا ہوگئی ہے۔ اس خاص روش میں انہیں وہ کمال حاصل ہے جو غالب کے بعد کسی کو نصیب نہیں ہوا۔ ماہنامہ "نگار"، لکھنؤ کے فاضل مدیر حضرت نیازؔ فتحپوری اپنے ۱۹۴۱ء کے خاص نمبر "بزمِ نگار" کے زیرِ عنوان عہدِ حاضر

کے مستند اساتذۂ سخن پر اظہار خیال کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔

وحشتؔ بڑے کہنہ مشق شاعر ہیں۔ اُردو تغزل میں فارسی ترکیبوں کو گوارا اور خوشنما صورت سے استعمال کرنا۔ وفاؔ رام پوری کی طرح ان کا خاص کارنامہ ہے۔ پڑھا لکھا آدمی جب غزل میں اپنی قابلیت پر آجاتا ہے تو غزل بالکل برباد کر دیتا ہے۔ لیکن وحشتؔ کی خوش ذوقی نے کبھی یہ نقص اپنے کلام میں پیدا ہونے نہیں دیا۔ ان کے یہاں پر یہ سب کچھ بہت توازن اور سلامت روی کے ساتھ پایا جاتا ہے اور اس میں شک نہیں کہ وہ اس حیثیت سے بڑی عزت کے مستحق ہیں۔"

حیات کی سچی نقاشی اور تاثرات کی مکمل صورت گری کا نام شاعری ہے اور یہی معیار فدمار کا تھا اور وحشتؔ نے اسی کو پیش نظر رکھا ہے۔ ان کے کلام میں کہیں کہیں پیچیدہ بیانی کی مثالیں ملتی ہیں۔ مگر انھوں نے عموماً لطفِ بیان کو مضمون آفرینی پر ترجیح دی ہے۔ غور سے دیکھنے والا باآسانی سمجھ سکتا ہے کہ ہر ایک شعر میں مکمل مضمون ادا کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ ان کا دیوان ندرتِ مضامین، پروازِ تخیل، اور حسین استعارہ کے دلفریب نقوش کی فراوانی سے نگارخانۂ چین بنا ہوا ہے اور بقول شمس العلماء علامہ شبلی نعمانی مرحوم —— آپ کے کلام میں حیث الاغلب، جدت، ندرت اور سختگی ہوتی ہے۔ غالبؔ اور مومنؔ کی ترکیبیں اور طرز ادا آپ سے خوب بن پڑتی ہیں۔

وحشتؔ کی فطری متانت کا اثر ان کے کلام میں بھی نمایاں ہے۔ کلام ایسے جذبات سے جو تہذیب و شائستگی کے خلاف تصور کیے جاتے ہیں بالکل پاک ہے۔

۱۹۱۰ء میں وحشت کا پہلا دیوان شائع ہوا۔ جس میں اکثر غزلیں ابتدائی مشق کے زمانے کی ہیں۔ دیوان کے آخر میں فارسی کلام بھی ہے۔ اُردو فارسی دونوں کا مجموعہ اکثر اصنافِ سخن پر حاوی ہے۔ جس سے وحشت کی ہمہ گیر طبیعت کا اندازہ ہوتا ہے۔ جب دیوان وحشت، چھپکر منظر عام پر آیا تو مولانا حالی، مولانا شبلی، علامہ اقبال، اکبر الہ آبادی، حسرت موہانی، شرر لکھنوی۔ وفا رام پوری، نظم طباطبائی، ظہیر دہلوی، شاد عظیم آبادی، صفی لکھنوی، آزاد عظیم آبادی، عزیز لکھنوی، محشر لکھنوی جیسے ماہرین فن اور نقادانِ سخن نے وحشت کے نام تحسین آمیز مکتوب لکھے۔

ذیل میں چند اقوال واشعار کا اقتباس نقل کیا جاتا ہے جن میں تتبع غالب کی طرف اشارہ ہے۔

مولانا صفی لکھنوی فرماتے ہیں ؎

شاعرِ بے مثل و نظیر آمدہ ‌ ‌ ‌ ‌ بروش غالب و میر آمدہ
فارسیش غازۂ اردوئے او ‌ ‌ ‌ ‌ از اثر طبع سخن گوئے او

حضرتِ ظہیر دہلوی (یادگار ذوق) کا خیال ہے۔

"آپ کے غالب ثانی ہونے میں کوئی کلام نہیں۔"

مولانا شوق قدوائی لکھنوی لکھتے ہیں:۔

آج کل ہندوستان میں حضرت غالب اور میر کی تقلید کرنے والے زبان کے دعوے سے اکثر پائے جاتے ہیں مگر کلام کے رنگ سے کم۔ میں نے کم کا لفظ اس بنا پر لکھا کہ پوری تقلید حضرت غالب کے رنگ کی حضرت وحشت ہی نے کی ہے۔ اور ان کی ذاتِ واحد ہی کم کے لفظ کی مصداق

ہو سکتی ہے۔

(مخزن مئی سنہ ۱۹۱۰ء)

حضرت محشر لکھنوی رقم طراز ہیں:-

تقلید مرزا غالب مرحوم میں جس قدر مشق کی اس کی خوبصورتی اور حسین تصویریں صفحات دیوان پر جابجا پائی جاتی ہیں۔ فارسی ترکیبوں کے صرف میں خداداد طبیعت کو سلیقہ خاص عطا ہوا ہے۔ سب سے بالاتر اور لائق تحسین یہ امر ہے بلکہ اس کو مشق کمال باکمال مشق کہنا چاہیئے کہ فارسی بندشوں میں ادائے خیال کے وقت کسی مقام میں کہیں الجھن نہیں جو مضمون ہے۔ موتی کی طرح صاف جو تخیل ہے وہ بالکل پاک اور پاکیزہ۔ یہی طریقہ بلاغت کی جان اور یہی انداز فصاحت کی روح ہے

(معیار لکھنؤ مئی سنہ ۱۹۱۰ء)

آج سے تقریباً پچاس سال پیشتر جبکہ وحشت نے تتبع غالب میں طبع آزمائی شروع کی تھی۔ اپنے متعلق یہ پیشین گوئی کی تھی اور واقعات مابعد نے ثابت کر دیا کہ پیشین گوئی کا ایک ایک حرف صحیح تھا ؎

ترے اندازِ سخن سے ہے یہ ظاہر وحشتؔ
کہ مقدر ہے ترا غالبِ دوراں ہونا

غالب کا انداز بیان اس قدر مرغوب خاطر ہے اور اس کے تتبع میں اس قدر محو ہیں کہ اس حقیقت کا اظہار فخر سے فرماتے ہیں۔

نکتہ پردازی میں وحشتؔ پیرو غالب ہوں میں
سرمہ کو کہتا ہوں دودِ شعلۂ آواز ہے

اس راہ کی دشواری پیشِ نظر ہے پھر بھی آرزو کی خلش توسنِ

طبع کیلئے مہمیز ہے ؎

وحشتؔ ہمیں تتبع غالبؔ ہے آرزو
دشوار تو یہی ہے کہ دشوار بھی نہیں

بایں عہد دشواری اللہ نے ان کی آرزو پوری کی اور ہم دیکھتے ہیں کہ ان کے کلام میں غالبؔ کا رنگ بحد کمال غالب ہے اور تتبع غالب کا حق ادا کر دیا ہے۔ مرزا اسد اللہ خاں غالبؔ کے شاگرد رشید مولانا الطاف حسین حالیؔ دیوانِ وحشتؔ پر تبصرہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔

جب مرزا غالبؔ مرحوم اپنی موروثی پنشن کے متعلق گورنمنٹ ہند میں استغاثہ کرنے کی غرض سے کلکتہ گئے تھے۔ اس وقت اہل کلکتہ نے ان کے فارسی کلام پر اعتراض کیا مگر آپ نے مرزا کے تتبع کا پورا پورا حق ادا کر کے ثابت کر دیا کہ سچائی کا مقابلہ کیسی ہی سختی کے ساتھ کیا جائے آخر کار نہ اپنا نقش لوگوں کے دلوں پر جمائے بغیر نہیں رہتی۔ اگر انصاف سے دیکھئے تو مرزا کا تتبع کرنا درحقیقت ہم لوگوں کا حق تھا۔ مگر آپ نے ہمارا یہ حق ہم سے چھین لیا۔ سچ ہے۔

دوران باخبر در حضور نزدیکاں بے بصر دور

تکلف برطرف اگر مرزا صاحب کے ان بلند اور اچھوت خیالات کو جن میں وہ اپنے تمام معاصرین میں ممتاز تھے مستثنیٰ کر دیا جائے تو آپ کے اردو دیوان کو بلا شائبہ تصنع ان کے کلام کا نمونہ قرار دینا ہرگز داخل مبالغہ نہیں ہو سکتا۔

ذیل میں مرزا غالبؔ اور مولانا وحشتؔ کے کچھ اشعار پیش کئے جاتے ہیں۔ جن سے اہل ذوق بخوبی اندازہ کر سکتے ہیں کہ وحشتؔ کا کلام تتبع غالبؔ

میں کیا مرتبہ رکھتا ہے۔ تخیل اور حسن بیان کا نہایت کامیاب نمونہ ملاحظہ ہو ؎

آئینۂ خیال تھا عکس پذیر راز کا
طور شہید ہو گیا جلوۂ دلنواز کا

اس مطلع کے ہر ٹکڑے پر غور کیجئے پھر شعر پر مجموعی حیثیت سے نظر ڈالئے

خستگیٔ کلیم نے نکتۂ عجب سمجھا دیا!
ورنہ حریف میں بھی تھا اس مژۂ دراز کا

حضرت غالب اس واقعہ کو کسی اور ہی نقطہ نظر سے دیکھتے ہیں ؎

کیا فرض ہے کہ سب کو ملے ایک سا جواب
آؤ نہ ہم بھی سیر کریں کوہ طور کی
دیر ملا تھا راہ میں کعبہ کو ہم نکل گئے
جذبۂ شوق میں دماغ کس کو ہو امتیاز کا

ہمارے صبر سے پیدا تھا ایک عنوان بیتابی
کبھی سر کی بھی لیتا تھا خبر جو ہاتھ دل پر تھا

نہایت فطری و پر اثر تخیل ہے صبر کہاں بیتابی صبر نمایاں ہو سکتی ہے۔

مبارک ہو مجھے موقع فریب تازہ کھانے کا
کہا ہے پھر مرے پیماں شکن نے وعدہ آنے کا

کتنی پُر حسرت مبارکباد ہے "! میرے پیماں شکن" سے جو بات پیدا ہو گئی ہے وہ لفظوں میں بیان نہیں ہو سکتی۔

محیط عشق میں ہم شور طوفاں بن کے اٹھے ہیں
ہمیں آتا نہیں انداز راز دل چھپانے کا

جگہ ایسی نہیں کی تھی خیال یار نے دل میں

خیال آ تا   جو کچھ زانوے غم کو سر اٹھانے کا

واقعی خیال یار کی دل فریبی ایسی ہی ہوتی ہے۔ شیخ علی حزیں مرحوم کا ایک شعر ہے ؎

شب داشتیم بزم خوشے با خیال تو
ہوشم خراب لذتِ گفت و شنید بود

میر کا یہ مطلع بہت مشہور ہے

غم رہا جب تک کہ دم میں دم رہا
دم کے جانے کا نہایت غم رہا

اس مطلع کا جواب نہیں ہو سکتا مگر وحشتؔ نے بھی خوب مطلع کہا ہے ؎

غیر ہی کا غم ترا ہمدم رہا   وائے وہ دل جس میں تیرا غم رہا
ہائے تیری آشنا بیگانگی   مدتوں میں بھی ترا محرم رہا

معشوق کی بیگانہ خوبی کا مضمون کس درجہ سلیس پیرایہ میں ادا کیا گیا ہے ؎

ہائے وہ عالم کسی کے حسن کا
دیدنی تھا مجھ پہ جو عالم رہا

حسن کا عالم بیان نہیں ہو سکتا۔ اس لئے شاعر صرف یہی کہہ کے رہ جاتا ہے کہ "دیدنی تھا مجھ پہ جو عالم رہا" مگر دیدنی کی لذت بھی تو بیان نہیں ہو سکتی۔ اس لئے شاعر کہتا ہے۔ مجھ پہ جو عالم رہا "دیدنی تھا۔" شاعر بطور خود کچھ نہیں کہتا۔ مگر سمجھنے والا سمجھ جاتا ہے کہ یہ شعر نہیں عالم حیرت کی تصویر ہے۔

جان دینے سے مجھے دادِ وفا تھی مطلوب
بیوفا چار گھڑی بھی تو پشیماں نہ رہا

جان سی پیاری چیز دے کر عاشق صرف دادِ دینا چاہتا ہے مگر معشوق کو پشیمانی تک نہیں۔

کس قدر پُر حسرت شعر ہے ؎

شوق کا عالم مرا تو نے نہیں دیکھا ہنوز
بے حیا تجھ کو حیا کا امتحاں ہو جائے گا

وحشتؔ فرماتے ہیں ؎

بیکسی پردہ دارِ درد ہوئی
خیر گزری کہ اپنا گھر نہ ہوا

غالبؔ کا مشہور شعر ہے ؎

مارا دیارِ غیر میں مجھ کو وطن سے دور
رکھ لی مرے خدا نے مری بیکسی کی شرم

غالبؔ غربت کی موت پردہ پوش بیکسی فرماتے ہیں اور وحشتؔ خود بیکسی کو "پردہ دارِ درد" فرماتے ہیں۔ انداز بیان میں دونوں کے ندرت اور برجستگی ہے۔

دل کہ آب عمر ترا میکدۂ ناز رہا
ہائے اس خانہ آباد کا ویراں ہونا

میکدۂ ناز، کس قدر کیف انگیز ترکیب ہے

اللہ اللہ یہ کافر نظری کا عالم
زیب دیتا ہے تجھے دشمن ایماں ہونا

کافر نظری، کی ترکیب اور دوسرے مصرع کی برجستگی قابل داد ہے۔

مندرجۂ ذیل اشعار تو بالکل غالبؔ کے رنگ میں رنگے ہوئے ہیں ؎

دل کو مرغوب ہدف تیر کا تیرے بننا ... سر کو منظور تری تیغ کے قرباں ہونا
کیا نظر آئے اسے حسن کو نظر آیا ہو ... تیرے رُخ پر تری زلفوں کا پریشاں ہونا

میرؔ کی زبان اور تخیل کا نمونہ ملاحظہ فرمائیے ؎

بہت حسرت افزا ہے شمع مزار ... بجھایا مجھے جب جلایا چراغ

بگڑے جو اپنی بات تو قسمت سے کیا بنے
آئے کسی پہ دل تو طبیعت ہے کیا کروں

ہاں نہ دنیا فرصتِ نظارہائے شانِ جمال
ہوش کھونے ہی کیخاطر ہوش میں آتا ہوں میں

ان کے آنے کا بھروسہ ہو نہ ہو ... راہ ہم ان کی مگر دیکھا کریں

محویتِ شوق کی انتہائی کیفیت کو حیرت انگیز انداز بیان فرمایا اور دونوں شعروں کا سوز و گداز اور ترنم ملاحظہ فرمائیے۔ سبحان اللہ کا لطف آئے گا۔

خوشی کی تجھے زندگانی مبارک ... مجھے زندگی سے خفا کرنے والے
نہ ہو رنج سے میرے افسردہ خاطر ... مجھے رنج میں مبتلا کرنے والے

اس صید ناتواں کو جو چھوٹا ہو دام سے
آزاد کیوں کہوں کہ گرفتار بھی تو ہے

حضرت مبارک عظیم آبادی نے اس مضمون کو یوں ادا کیا ہے ؎

تو نے صیاد کچھ اس طرح سے آزاد کیا
جو چلے چھٹ کے نقش سو وہ گرفتار چلے

غالبؔ کا شعر ہے ؎

کل کیلئے آج نہ خست شراب میں ... یہ سوئے ظن ہے ساقی کوثر کے باب میں

وحشت فرماتے ہیں ؎

زباں کو آشنا کر آج ذوقِ آتش تر سے
کہ لذت یاب ہونا ہے تجھے کل آبِ کوثر سے

مرزا کے شعر میں کس قدر پیچیدگی لیکن برجستگی ہے اور مولانا کے شعر میں صفائی اور زورِ استدلال ہے۔

آجکل ہماری نظم و نثر میں فارسی ترکیبوں کی بھرمار ہے مگر ان میں غالب کا رنگ کہاں برعکس اس کے کلام وحشت ملاحظہ فرمایئے۔ اسلوب بیان میں وہی برجستگی۔ بندشوں میں وہی چستگی اور ترکیبوں میں وہی بانکپن اور برجستگی۔ الفاظ کی نشست اس قدر بے تکلف اور مناسب ہے کہ روح کو بالیدگی ہوتی ہے۔ جو مصرعہ ہے ڈھلا ہوا۔ جو شعر ہے اعلیٰ صناعی کا مکمل نمونہ، دور از کار مبالغوں فرسودہ تخیلات اور مذموم اشارات سے آپ نے اپنے دامن کو آسودہ ہونے نہ دیا۔

وحشت غزل گوئی کے علاوہ اصنافِ رباعی، مسدس، مخمس، قصیدہ اور طرز جدید کی فلم میں بھی کامل قدرت رکھتے ہیں چنانچہ ہر صنفِ سخن میں انکی پختہ مشقی اور استادانہ رنگ پورے طور پر کارفرما ہوتا ہے۔ ایک نظم کے دو بند پیش کرتا ہوں۔

مرزا غالب کی یاد میں فرماتے ہیں ؎

ظہوری ہو کہ طالب تیرے دل کا راز کیا سمجھے
ادا دانی کو تیری عرفی شیراز کیا سمجھے
حزیں یہ شیوۂ فکر چمن پرداز کیا سمجھے
تری ترکیب کیا جانے ترے انداز کیا سمجھے

ہوا ہے اشک افزائے عجم ہندوستاں تجھ سے
بنی یہ سرزمیں دلی کی گویا اصفہان تجھ سے
عبارت تیری کیا ہے سرمۂ تضمین ہے گویا
کلام جانفزا اعجاز کی تقریر ہے گویا
سخن تیرا ہے کیا اک درد کی تصویر ہے گویا
جو تیرا نالہ ہے وہ نالے کی تاثیر ہے گویا
حکایت ہے ترے لب پر غم جانسوز ہجراں کی
اڑائی تیرے خامے نے ادا دلہائے نالاں کی

اُردو شاعری جسقدر وحشت کی رہین منت ہے وہ تو ظاہر ہے لیکن فارسی شاعری بھی آپ کے بار احسان سے سبکدوش نہیں۔ فارسی زبان اپنی جن خصوصیات کے لئے ممتاز ہے۔ وحشت کے کلام میں وہ خصوصیات بدرجۂ کمال موجود ہیں۔ فارسی میں شعر کہنا دشوار نہیں مگر فارسیت پیدا کرنا مشکل ہے۔ ہندوستانی فارسی شعراء کے کلام سے ہندیت کی بُو نہیں جاتی مگر وحشت کا شمار بلاشبہ ان فخر ہند شعراء میں ہے جن کا کلام اُس عیب سے پاک ہے ؎

دلم از مستی آں نرگس مستانہ می رقصد
کہ از ذوق سرودش کعبہ و بتخانہ می رقصد
نہ تنہا از نشاط مے ہمیں پیمانہ می رقصد
برقص آئینہ چوں ساغر کشاں میخانہ می رقصد
کدامیں گیسوے برہم مرا آراستن دارد
کہ یارب در کف مشاطہ اشب شانہ می رقصد

چو زاہد بگذرد سوز محبت اشک وا سوزد
بہ بزم سوختن پروانہ با پیمانہ می رقصد

ہمانا شوخیٔ نازش مرا تعلیم فرماشد
تپد در سینہ دل گوئی کہ بیتابانہ می رقصد

خوش آں محفل کہ روشن می کند شمع جمال رو
سپند آسا دراں جا وحشتؔ دیوانہ می رقصد

شیخ علی حزیںؔ، مولانا حالیؔ، مرزا غالبؔ، غنیمتؔ، ولیؔ دکنی، ملک الشعراء صادق خاں اخترؔ، سید محمود آزادؔ، عبدالغفور خاں نساخؔ، داغؔ دھلوی کے کلام پران کے محققانہ تبصرے گرانقدر ادبی مقالات کی حیثیت رکھتے ہیں سب کے سب اُردوئے معلی، دکن ریویو، مخزن، نقاد، وغیرہ جیسے بلندپایہ معیاری رسالوں میں چھپ کر مقبول ہو چکے ہیں۔

۱۹۵۲ء وحشت کا دوسرا دیوان "ترانہ وحشتؔ" لاہور سے شائع ہو چکا ہے۔

وحشتؔ کے شاگرد ہندو پاک کے طول و عرض میں پھیلے ہوئے ہیں۔ میجر مرزا جعفر کشفی ایم۔ اے، پروفیسر عبدالقیوم حسرتؔ نعمانی ایم۔ اے (مرحوم)، پروفیسر عباس علی خاں بیخودؔ ایم اے کیپٹن صدیقی (مرحوم)، ایم۔ اے۔ بی۔ ٹی امیران سلام ایم اے پروفیسر اختر حسین اختر ایم۔ اے۔ سید محمود طرزی قربان علی بصری، طاہر علی شاکر۔ ڈاکٹر طاہر، حافظ اسلم فطرت مرحوم (خمخانہ جاوید میں ان کا تذکرہ ہے)، واقف بہاری مرحوم ابوالمکارم سلیم اللہ فہمی، ایم۔ اے، بی۔ سی۔ ایس، علامہ جمیل مظہری ایم۔ اے مولانا محمود اسرائیلی لاہوری۔ پیر زادہ سید ظفر ہاشمی، کوکب مراد آبادی، بیدل

عظیم آبادی، عبدالرحمن آصف، محمد سلیمان واصف وغیرہ قابل ستائش ہیں۔ اور اُردو ادب میں خاص درجے کے مالک ہیں۔ ان میں اکثر معروف اور بعض غیر معروف ہیں

وحشت کے متعلق حضرت ناطق لکھنوی مرحوم کی صرف دو رباعیاں پیش کرتا ہوں جس کا ہر لفظ وحشت کے کمال اور ناطق کے خلوص کی ترجمانی کر رہا ہے۔ ہمعصروں اور ہم چشموں میں ایسا خلوص کم یاب ہوتا ہے[۱]

وہ جوہر پنہاں کہ جو مستور نہیں
وحشت کے سوا اوروں کا مقدور نہیں
اوصاف پہ ہے ان کے ہمیں ناز مگر
وہ اپنے کمالات پہ مغرور نہیں

اس شمع کے قربان ہوا ے پروانو
یہ جوہر قابل ہے اسے پہچانو
اس رنگ کے سرمست نہ پاؤ گے کہیں
وحشت کی کرو قدر اے دیوانو

ناطق نام حکیم سید[۲] ابو العلا سید احمد اور تخلص ناطق ہے۔ ناطق لکھنوی کا سنہ ولادت ۱۸۷۸ء بمقام لکھنؤ ہے۔ تعلیم و تربیت بھی لکھنؤ میں پائی۔ نحو مولانا محمد اکرام ابن مولانا محمد نعیم قدس سرہٗ ہے۔ فلسفہ و منطق سید ظہور الحسن مجتہد العصر ہے۔ ادب، مولانا عبدالباقی مہاجر مکی ہے۔ فقہ مولانا شیخ محمد صاحب نائب سے پڑھی۔ علم ہیئت میں شرح چغمی مولوی لطیف اللہ متوطن علی گڑھ سے مکرر پڑھی جو حیدر آباد دکن کے مفتی تھے۔ طب کی تعلیم

۱۔ سالنامہ جدید اُردو کلکتہ ۱۹۴۱ء

۲۔ ناطق لکھنوی کے حالات ان کی کتاب نغمہ اُردو سے ماخوذ ہیں

حکیم عبدالمجید خاں خلف اکبر حکیم محمود خاں سے حاصل کی۔ اٹھارہ سال کی عمر میں علوم متداولہ سے فارغ ہوئے۔ علاوہ علوم کے انھیں تصوف سے خاص مناسبت تھی اور نجوم و جفر میں بھی قابلیت رکھتے تھے۔ خوشنویسی میں کمال اور خط شفیعہ اور طغرا میں خاص ملکہ تھا۔

ابتدا میں تصنیف و تالیف کو ذریعہ معاش قرار دیا۔ اخبار نور الانوار مطبع نظامی کانپور کے ایڈیٹر رہے۔ پھر سر وقار الامرار اقبال الدولہ مرحوم نے حیدر آباد دکن میں اخبار ملک وملت کی ادارت کے لئے طلب کیا۔ یہ خدمت کئی سال تک انجام دیتے رہے۔

طالب علمی کے زمانے ہی سے فارسی عربی شعر کہنے کا شوق پیدا ہوا۔ نواب بہادر حسین خاں انجم نے اُردو شعر کہنے کا شوق دلایا۔ ہر صنف شاعری میں یکساں مناسبت رکھتے تھے۔ ادبیات کی نکتہ رسی میں بھی اپنا نظیر نہیں رکھتے تھے۔ تقریر و تحریر نظم و نثر پر یکساں قابو تھا۔

بقول حضرت اثر لکھنوی "جدید دور غزل گوئی کا سنگِ بنیاد حضرت ناطق نے رکھا اور وہ پہلے شخص ہیں جنھوں نے اُردو داں طبقہ کو فن نقد سے روشناس کیا۔"

ناطق لکھنوی نے ۱۹۵۱ء چاٹگام، مشرقی بنگال میں رحلت فرمائی۔ اس سے قبل بیس سال تک کلکتہ میں برابر مقیم رہے۔ حق تو یہ ہے کہ کلکتہ کا ادبی ماحول وحشت و آرزو کی طرح ناطق کی شیریں کلامی سے بھی ہمیشہ متاثر و فیضیاب رہا۔ وحشت اور ناطق کے تعلقات نہ صرف خاص بلکہ بہت گہرے تھے۔ ایک دوسرے سے اس قدر محبت فرماتے تھے کہ ہر محفل و بزم میں دونوں ایک ساتھ ہمنشیں و ہم رکاب نظر آتے اور ایک دوسرے کا ذکر نہایت محبت،

خلوص اور مسرت کے ساتھ کیا کرتے۔

ناطق کی شاعری کے محاسن پر روشنی ڈالنے کیلئے ایک مبسوط مضمون درکار ہے۔ لہذا صرف ایک غزل پیش کرتا ہوں۔ جو انھوں نے کلکتہ کے ایک مشاعرے میں پڑھی تھی ؎

اثر ہے سب پہ مے عشق کا جداگانہ — کسی کو نشہ نہیں ہے، کوئی ہے دیوانہ
تمہیں ہو بزم میں کیوں فکر شمع و پروانہ — یہ کیا کہیں گے ہمارا تمھارا افسانہ
نہ قطرہ کم ہے نہ کافی تمام میخانہ — جو ظرف جسکا ہے اس کا وہی ہے پیمانہ
کبھی جو آپ میں آیا بھی تیرا دیوانہ — تو جس طرح کوئی پردیس میں ہو بیگانہ
تجلیوں میں تقسیم خاک دل کیونکر — ہزار شمع فروزاں اور ایک پروانہ
بیان زخم جگر پر وہ مسکراتے ہیں — ہنسی ہنسی میں بدلتے ہیں رنگ فسانہ
کسی کا زخم کسی زخم سے نہیں ملتا — تری نگہ کے ہیں ہر رخ کس قدر جداگانہ
فروغ بزم وفا ہے بس ایک شرر دل کا — اسی کو شمع سمجھیے اسی کو پروانہ
ہر ایک ذرہ شرابی ہر ایک قطرہ شراب — تمام عالم امکاں ہے ایک میخانہ
جہاں تھا تو ہے ساقی تما تہیں ناطق — بدل کے لے گیا جمشید میرا پیمانہ

ناطق کا یہ شعر بہت مشہور اور بے نظیر ہے ؎

کہہ رہا ہے موج دریا سے سمندر کا سکوت
جس کا جتنا ظرف ہے اتنا ہی وہ خاموش ہے

ناطق لکھنوی نے مختلف علوم و فنون پر کتابیں لکھی ہیں۔ سید عبداللہ علم کانپوری اور محمد حافظ خاں نے کچھ تصانیف شائع کی ہیں۔ تاریخ جنگ ہفت روزہ افسانہ شہر آشوب لندن۔ بستان معرفت اسرار حقیقت ان کی تصانیف ہیں۔ علم الانساب میں نہایت محنت ایک شجرہ ترتیب دیا تھا۔

جس میں حضرت آدم سے اپنے زمانے تک جتنے مشاہیر گذرے ہیں سب کے نام مسلسل ہیں۔ آج تک ایسا عظیم الشان شجرہ نظر سے نہیں گذرا۔

"نظم اردو، ان کا بے نظیر، یگانۂ روزگار اور غیر فانی کارنامہ ہے۔ اس کی خصوصیت یہ ہے کہ مسدس کے ستاون بندوں میں اردو نظم و نثر کی پونے سات سو سال کی مکمل تاریخ منضبط ہے۔ کتاب کے شروع میں مولانا عبداللہ عمادی (جامعہ عثمانیہ)، محمد اسمٰعیل ہمدانی، زاہد القادری مولانا عبدالماجد دریا آبادی، بشیر احمد ایڈیٹر ہمایوں، ڈاکٹر ذاکر حسین۔ اثر لکھنوی، محوی صدیقی لکھنوی، خواجہ حسن نظامی، وحشت کلکتوی جیسے مشاہیر اردو کی گرانقدر آراء شامل ہیں اور یہ آرائے ناطق کی شاعرانہ عظمت، محققانہ قابلیت اور علمی صلاحیت کی آئینہ دار ہے

حضرت اثر لکھنوی فرماتے ہیں ؎

"متن کے علاوہ دو طرح کے حواشی ہیں ایک میں ان شاعروں کا نمونہ کلام ہے جن کے تذکرے سے کتاب مزین ہے اور دوسرے میں بیحد مفید اور تحقیقی تاریخی نوٹ ہیں یہ حاشیے بجائے خود ایک مبسوط اور قابل قدر کتاب کی حیثیت رکھتے ہیں لطف یہ ہے کہ نظم خشک اور پھیکی نہیں بلکہ شاعرانہ لطافتوں اور رنگینیوں سے مالا مال ہے۔ ایک ایک بند تاریخی اور لسانی نکات اور معلومات کا گلدستہ ہے، پوری نظم کا تجزیہ اُس کے مطالب کی ترتیب واقعات کا سلسلہ وار تاریخی ارتقا ان امور کی سرسری وضاحت کے لئے بھی ایک ضخیم کتاب درکار ہے"۔

بطور نمونہ دو بند ملاحظہ ہوں ؎

جستجو یہ ہے کہ ظاہر راز اردو کب ہوا ‌ ‌ گفتگو ناطق یہ ہے آغاز اردو کب ہوا

انجمن میں نغمہ آرا سا نارُودکب ہوا ساز بزمِ ہند ہم آواز اردو کب ہوا
ایک ہی دہن سنتے سنتے ہو گئے ہیں کان سُن
دعویٰ ایجاد ارُدو کی لگی ہے سب کو دھن
اس طرح کام اس کا چلتے چلتے ہر سو چل گیا نقش یوں بیٹھا او دھ میں نام اُردو چل گیا
تھے بہارے بزم دل خیران پہ قابو چل گیا حد یہ ہے بنگال پر بھی اس کا جادو چل گیا

حشر آغا محمد شاہ جو دنیائے علم و ادب میں آغا حشر کاشمیری کے نام سے مشہور ہیں آغا محمد غنی شاہ کے صاحبزادے تھے۔ ان کا آبائی وطن کشمیر تھا ان کی ولادت بروز جمعہ بتاریخ یکم اپریل ۱۸۷۹ء بمقام شہر بنارس ہوئی۔

آغا حشر کاشمیری کی ابتدائی تعلیم و تربیت اسلامی رسم و رواج کے مطابق ہوئی۔ قرآن مجید اور فارسی و عربی کا درس گھر پر مکمل کیا۔ بنارس کے جے نرائن ہائی اسکول، میں آٹھویں جماعت تک انگریزی کی تعلیم سے آراستہ ہوئے۔ اپنی خداداد ذہانت اور غیر معمولی ذوق و شوق کے باعث درسی کتابوں کے قید و بند سے آزاد ہو گئے اور بطور خود اتنا مطالعہ کیا کہ فارسی، عربی، اردو اور ہندی زبانوں پر یکساں قدرت حاصل کرلی۔ انگریزی لٹریچر سے بھی خاص شغف تھا جس کا ثبوت ان کے ترجمہ شدہ ڈراموں سے بخوبی ملتا ہے۔

آغا حشر اُردو زبان کے سب سے بڑے ڈرامہ نگار ہی نہ تھے ایک باکمال شاعر، عظیم فن کار، اور زبردست مقرر بھی تھے۔

حشر کا سب سے پہلا ڈرامہ "آفتاب محبت" ہے جو ۱۸۹۷ء

میں لکھا گیا ہے۔ عبدالکریم خان نامی پبلشر نے اس ڈرامے کے صرف مبلغ چودہ روپے کے عوض حق اشاعت خرید کر اسے شائع کر دیا جس کے منظر عام پر آتے ہی اسٹیج کی دنیا میں محشر بپا ہو گیا۔ اس کے بعد حشر کے جتنے ڈرامے اسٹیج اور اسکرین کے ذریعہ منظر عام پر آئے ان کی فہرست حسب ذیل ہے۔

مرید شک، اسیر حرص، صید ہوس، خوبصورت بلا، سفید خون بلوا منگل (سورداس)، بن دیوی، گنگا اوترن، یہودی کی لڑکی، آنکھ کا نشہ، ترکی حور، دھرتی بالک، دل کی پیاس، سیتا بن باس، پہلا پیار، ہندوستان، شردن کمار، بھارتی، بھیشم پرتگیا، شیریں فرہاد، عورت کا پیار، قسمت کا شکار، چنڈی داس، دل کی آگ، بھگت کبیر وغیرہ۔ آخری ڈرامہ رستم وسہراب ہے۔

حشر جب ۲۲ سال کے تھے تو سنہ ۱۹۰۱ء میں بمبئی آ گئے۔ اور وہاں کے اسٹیج کے لئے ڈرامے لکھتے رہے سنہ ۱۹۰۷ء سے ۱۹۲۷ء تک برابر کلکتہ میں مقیم رہے گویا ان کی زندگی کا بیشتر حصہ سرزمین بنگال میں گذرا کلکتہ میں الفریڈ تھیٹریکل کمپنی، کورنتھین تھیٹرز اور نیو تھیٹرز سے وابستہ رہے۔

حشر کی ذات نہایت رنگین اور دلچسپ تھی۔ انھوں نے اپنی تخلیقات سے بحیثیت ڈرامہ نویس اور ہدایت کار ______ اسٹیج کی بڑی اصلاح کی اور اردو ادب میں ڈرامہ نویسی کا ایک نیا راستہ نکالا۔ یہ امر بھی قابل ذکر ہے کہ حشر اپنی تخلیقات اپنے قلم سے شاذ و نادر ہی لکھا کرتے تھے بلکہ ان کا معمول تھا کہ وہ عالم بیخودی میں

ٹہل ٹہل کر بولتے جاتے اور ان کے منشی ضبط تحریر میں لائے جاتے۔

۱۹۳۴ء میں جب حشر کی صحت خراب رہنے لگی تو لاہور چلے گئے جہاں ۲۸ اپریل ۱۹۳۵ء کو ساڑھے چھ بجے شام کے وقت رحلت فرمائی۔

حشر کو شاعری سے بھی فطری مناسبت تھی۔ غزل۔ نظم اور گانے خوب لکھتے تھے۔ شاعری میں بھی ان کا مرتبہ بہت بلند ہے۔ فلسفہ۔ جمالیات، ان کا خاص موضوع تھا اور اس رنگ خاص میں ان کا کوئی حریف نہیں۔ غزلیں۔ اور نظمیں سوز و گداز، کیف و نشاط، تاثیر و دلکشی رعنائی و رنگینی اور جذبات و خیالات میں ڈوبی ہوئی ہیں۔ اور بقول چراغ حسن حسرت "آغا صاحب کو قدرت نے تغزل کا خاص ذوق عطا کیا تھا۔" بطور نمونہ چند اشعار ہدیہ قارئین ہیں ؎

کشاکش زندگی کی ارتباط جسم و جاں تک ہے
یہ سب ہنگامۂ محفل ہماری داستاں تک ہے

خبر ہے خشک ہو جائیں نہ آنسو سوزش دل سے
ترا غم گل بداماں دیدہ ہائے خونچکاں تک ہے

مٹا دے دل کو دل کی لذتِ ایذا نہ مٹنے دے
ہجوم کاروانِ شوق اس جنبش گراں تک ہے

لہو ہو جائے دل گھٹ گھٹ کے پر آنسو نہ ٹپکیں گے
کریں گے ضبط مجبور ستم طاقت جہاں تک ہے

یہی آکر لب شاعر پہ شعر گرم بنتا ہے
وہ سوزِ زندگی جو شعلہ زن دل سے زباں تک ہے

عندلیب نام وجاہت حسین تخلص عندلیب ولادت یکم مارچ ۱۹۰۴ء وطن رام پور یو، پی۔ انڈیا۔

سید اولاد حسین شاداں بلگرامی پروفیسر مدرسۂ عالیہ رام پور سے فارسی پڑھی اور ان ہی کے تخلص کی مناسبت سے اپنے آپ کو شادانی لکھنے لگے اور رفتہ رفتہ عندلیب شادانی کے نام سے مشہور ہو گئے۔ شاعری میں کسی کے شاگرد نہیں۔ غالباً رسم کی بنا پر لڑکپن ہی میں عندلیب تخلص اختیار کر لیا تھا۔ چونکہ غزلوں میں مقطع نہیں لکھتے اس لئے اشعار میں اس کے استعمال کی نوبت نہیں آئی۔

مدرسۂ عالیہ رامپور سے پنجاب یونیورسٹی کے امتحانات منشی عالم اور منشی فاضل ۱۹۲۰ء اور ۱۹۲۱ء میں علی الترتیب پاس کئے اور دونوں امتحانوں میں یونیورسٹی بھر میں اول رہے۔ ۱۹۲۱ء میں میٹریکولیشن ۱۹۲۳ء میں انٹرمیڈیٹ اور ۱۹۲۵ء میں بی اے کے امتحانات پرائیویٹ طور پر پنجاب یونیورسٹی سے پاس کئے۔ پنجاب یونیورسٹی سے فارسی میں ایم۔ اے کیا۔ ۱۹۳۴ء میں لندن یونیورسٹی سے فارسی میں پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگری لی۔

ملازمت۔ سب سے پہلے ۱۹۲۱ء میں چند ماہ خالصہ ہائی اسکول گرودوالہ ضلع ہشیار پور میں اور اس کے بعد کچھ مدت اسلامیہ اسکول بریلی میں ہیڈ مولوی رہے۔ ۱۹۲۴ء میں کچھ دنوں ایچی سن چیف کالج لاہور میں ملازمت کی ۱۹۲۵ء میں ریاست دجانہ ضلع رہتک پنجاب کے نابالغ نواب کے اتالیق اور ۱۹۲۶ء میں ہندو کالج دہلی میں اردو فارسی کے لکچرار مقرر ہوئے۔ ۱۹۲۸ء میں ڈھاکہ میں اردو اور

فارسی کے سینیر لکچرار ہو کر آئے۔ لکچرار سے ریڈر اور ریڈر سے پروفیسر بنائے گئے اور اب چند سال سے اسی عہدے پر مامور ہیں۔ دو مرتبہ ایران کی سیاحت کی پہلی بار ۱۹۳۰ء میں اور دوسری بار ۱۹۵۲ء میں۔

تصانیف :- ترجمہ انشائے ابوالفضل دفتر اول۔ ترجمہ چہار مقالہ۔ مقالۂ اول۔ ترجمہ رباعیات باباطاہر وغیرہ اور فارسی جدید کا لغت "نقش بدیع" یہ طالب علمی کے زمانے کی تالیفات ہیں۔

ایک مدت تک "پریم پجاری" کے روپ میں سچی کہانیاں لکھتے رہے جو ماہنامہ ساقی دہلی میں شائع ہوتی رہیں اور بیحد پسند کی گئیں۔ "سچی کہانیاں" مجموعی شکل میں بھی شائع ہو چکی ہیں۔

افسانوں اور مقالات کے مجموعے، نوش و نیش، جھوٹا خدا، تحقیقات، دورِ حاضر اور اردو غزل گوئی اور ایک مجموعۂ کلام نشاطِ رفتہ کے نام سے شائع ہو چکے ہیں۔ ان کے علاوہ اور بھی کئی کتابیں مکمل کر چکے ہیں جو اشاعت کی منتظر ہیں۔

ڈاکٹر شادانی ۲۶ سال سے ڈھاکہ میں مقیم ہیں۔ ان کے دم سے مشرقی پاکستان میں اردو نے بڑی ترقی کی ۱۹۴۷ء ایک روز نامہ "مشرقی پاکستان" اور ۱۹۵۲ء میں ماہنامہ خاور جاری کیا۔ اب دونوں بند ہو چکے ہیں۔

شاعری :- ڈاکٹر شادانی اپنی سرگذشتِ شاعری[1] یوں تحریر فرماتے ہیں۔

---

[1] تذکرۂ شعرستان، مرتبہ مظہر صدیقی صفحہ ۲۶۵

میری شاعری کی ابتدا نظم سے ہوئی اور "تصویر بہار" میری پہلی نظم ہے۔ جو دیال سنگھ کالج لاہور کی بزم ادب کے ایک جلسے میں ۲۹ جنوری ۱۹۲۴ء کو پڑھی گئی۔ سامعین کی بے اختیار داد و تحسین نے دل بڑھایا۔ اور میری دوسری نظم، شالامار، وجود میں آئی۔ اس نظم نے گمنام نوارد کو لاہور کے ادبی حلقوں سے اچھی طرح روشناس کرادیا۔

۲۵ مئی ۱۹۲۵ء کو "حقیقی زندگی" اور اس کے ساتھ ہی حقیقی شاعری کا آغاز ہوا۔ یہ شعر اسی زمانے کی یادگار ہے ؂

گو ہے ہوا ہی سے پردہ حریم ناز   دل یہی سمجھتا ہے شوق کارفرما ہے

میری شاعری کو دو دوروں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔ پہلا دور جنوری ۱۹۲۴ء سے لے کر اگست ۱۹۲۹ء تک اور دوسرا دور جنوری ۱۹۳۴ء سے لے کر آج تک دونوں دوروں کے درمیان تقریباً پانچ برس کا زمانہ بالکل خاموشی میں گزرا۔ ہاں دسمبر ۱۹۳۱ء میں ایک خاص واقعہ سے متاثر ہو کر ایک نظم "سی نوری تا" لندن میں کہی تھی۔ اس کے بعد پھر مکمل خاموشی رہی۔ ۱۹۳۴ء میں یکایک احساس نے انگڑائی لی اور یہ غزل وجود میں آئی۔

گزاری تھیں خوشی کی چند گھڑیاں   انھیں کی یاد میری زندگی ہے

میری شاعری تمام تر حال ہے، اور پہلے دور کی بعض نظموں کو چھوڑ کر وہ بھی بیان واقعہ سے خالی نہیں۔ میں نے زندگی میں ایک شعر بھی ایسا نہیں کہا جس پر آپ بیتی کا اطلاق نہ ہو سکے ؂

اوّل سے لے کر آخر تک رنگین ہے میرا افسانہ
کچھ اس کے لبوں کی سرخی ہے کچھ میرے لہو کی سرخی ہے

نمونہ کلام

چاندنی سے گلوں سے نغموں سے / جی بھر آتا ہے کیوں خدا جانے
بیٹھے بیٹھے اُمنڈ نے لگتا ہے / دل کو کیا ہو گیا خدا جانے
آہ کی قدر اشک کی قیمت / کوئی غم نا شناس کیا جانے
زخم دل کو چھپا رہا ہوں میں / کوئی میری ہنسی کو کیا جانے
چاندنی اور اداس تنہائی / غم ہو کس حال میں خدا جانے

بد گمانی ہے عبث میری خموشی سے ہمیں
کیا کبھی تار سے نغمہ بھی جدا ہوتا ہے
ایک شعلہ ہے کہ سینے میں لپکتا ہے مدام
شاید اتنا ہی محبت کا صلہ ہوتا ہے
جھانکنا چاند سے نغموں سے صدائیں دینا
اے میری روح کی تسکین یہ کیا ہوتا ہے

دل آج بے حد گھبرا رہا ہے
اے دوست ان کا کچھ تذکرہ کر

توڑ دیئے ہوں یاس نے جسکے تمام آسرے
آہ وہ نامراد پھر کیا کوئی آرزو کرے

بہت مختصر تھے محبت کے لمحے / مگر پھر بھی ہر لمحہ اک زندگی تھا
بے نیازانہ برابر سے گزرنے والے / تیز کچھ قلب کی رفتار ہوئی تھی کہ نہیں
محبت دونوں جانب سے محبت / نہ پوچھو آہ کیسی زندگی ہے
رشک کرتی ہے مجھ پر اک دنیا / شعر ہو نغمہ ہو بہار ہو تم
دل سے اک دھواں اُٹھا آنکھ ڈبڈبا آئی / انتظار کی آخر کوئی انتہا بھی ہے

کیفی، تمنا، اثر

تقسیم ہند کے زیر اثر اُردو کی جو بڑی ہستیاں بنگال کے حصے میں آئیں۔ ان میں علامہ کیفی چڑیا کوٹی، مولانا تمنا عمادی پھلواری اور اثر رودلوی بھی قابل ذکر ہیں۔ کیفی چڑیا کوٹی اعظم گڑھ یو، پی کے رہنے والے ہیں۔ تقسیم سے پہلے کلکتہ میں اکثر ان کا قیام رہا۔ وہاں سے انھوں نے کئی رسالے بھی جاری کئے تھے اب تقسیم کے بعد مشرقی بنگال ڈھاکہ میں مستقل سکونت اختیار کر لی ہے۔ تمنا عمادی کا وطن صوبہ بہار کے ایک مقام پھلواری شریف ضلع پٹنہ ہے۔ کلکتہ میں مدت تک ان کا قیام رہا۔ اب ڈھاکہ ان کا وطن ثانی ہے۔ اثر رودلوی تلمیذ حضرت امیر مینائی یادگار سلف بزرگ ہیں۔ پندرہ سال سے کلکتہ میں مستقل اقامت ہے۔ ان حضرات کے متعلق مزید معلومات حاصل نہ ہو سکی۔ ان کی ایک ایک غزل قارئین کرام کی ضیافت طبع کے لئے پیش ہے ؎

کیفی

میں دل بیچتا ہوں جگر بیچتا ہوں — محبت کے ہر دام پر بیچتا ہوں
دعا رسحر ہو اگر لینے والی — میں اشکوں کے اپنے گہر بیچتا ہوں
چکا دے کوئی دل کا سودا چکا دے — خریدار غم ہوں اثر بیچتا ہوں
ادھر دل دویں گے اے لینے والے — میں اب کچھ سر رہگذر بیچتا ہوں
قسم ہے قسم ناز خنجر کی مجھ کو — شہادت خرید و نگا سر بیچتا ہوں
خبر دل کی قیمت کی کیفی نہیں ہے
میں کم بخت کو بے خبر بیچتا ہوں

تمناؔ

یہ نہ سمجھو کہ نہ اب گل ہے نہ گلشن میرا
شاخ گل پر ابھی باقی ہے نشیمن میرا

پاس الفت کی قسم ہوں ہیں ہوا خواہ رقیب
آپ کا دوست تو ہے لاکھ ہو دشمن میرا

ہم تو چپ سنتے ہیں منھ دیکھ کے رہجاتے ہیں
کہتے ہیں مرغ قفس زاد بھی "گلشن میرا"

غنچہ و گل نہ سہی ۔ خار ہیں واقف مجھ سے
پاس جاؤں تو لگیں چومنے دامن میرا

اشک سے پوچھ لے اے دلولۂ جامہ دری
آستیں میری کوئی اب ہے نہ دامن میرا

اہل دل رکھتے ہیں سینہ میں تمنا مجھ کو
ہوگا پتھر کوئی جو دل نہیں مسکن میرا

اثرؔ

ہیں سرِ نہاں پیدا مستی صہبا سے — اک وجد کا عالم ہے ہر نغمۂ مینا سے
باز آ دلِ پُر حسرت جلوے کی تمنا سے — آئینہ ہے ناکامی بیہوشی موسیٰ سے
اللہ رے یہ وحشت یہ چاک گریبانی — وسعت کا میں طالب ہوں اب دامن صحرا سے
جس شے پہ نظر ڈالی دیکھی تری یکتائی — اسرار کی ریزش ہے ہر دیدۂ بینا سے
یوں گریہ کناں ہو کر رسوا ہمیں کردے گی — امید نہ تھی ہرگز یہ چشم تمنا سے
ہے جو، تغافل سے افزائش بیتابی — دل محو تسلی تھا طرز ستم آرا سے
ہے خاطر مضطر سے کیوں شکوۂ بیتابی — گستاخ کیا تم نے خود نازش بیجا سے

بے کار آثر سمجھو تم وہ سخن آرائی
الفاظ ہوں نامحرم گر شاہد معنیٰ سے

شرف نام سید ابوالفتح محمد شرف الدین اور تخلص شرف ہے۔ یہ تاریخی نام عبدالغفور خاں بہادر نساخ نے تجویز فرمایا تھا جس سے سن تاریخ ۱۲۹۵ھ نکلتا ہے۔ ادبی دنیا میں شرف الدین شرف کے نام سے مشہور ہیں۔ ان کے والد ماجد فقیہہ الدین حسین الحسینی مرحوم ڈھاکہ کے روسائے اعظم میں سے تھے۔ موصوف عربی و فارسی میں مدرسہ محسنیہ کے سندیافتہ تھے۔ اس مدرسہ کے پرنسپل مولانا عبیداللہ عبیدی جیسے شہرۂ آفاق عالم و فاضل تھے۔ شرف کے فرجد سید قیص الدین حسین الحسینی مرحوم نواب ناظم کے زمانے میں ڈھاکہ کے شہر کوتوال تھے۔

شرف الدین شرف نواب سید محمد خاں بہادر آزاد مصنفہ، خیالات آزاد، و نامہ نگار اودھ پنچ، اور نواب سید محمود خاں آزاد کے بھانجے ہیں۔

شرف کا سنِ ولادت باسعادت ۲۱ ماہ محرم ۱۲۹۵ھ بمقام ڈھاکہ ہے۔ ابتدائی تعلیم و تربیت ان کے والد مرحوم کے زیر نگرانی ہوئی ۱۳۰۹ھ میں جب ان کے پدر بزرگوار کا انتقال ہوا۔ تو عبدالغفور شہباز مرحوم کے دامن علم و فضل سے فیض یاب ہوئے۔

ڈھاکہ ڈیویژن کے کمشنر مسٹر ڈی انگلس نے شرف کے خاندانی اعزاز کا احترام کرتے ہوئے ۱۹۰۵ء میں انھیں اپنے دربار میں عہدۂ خاص عطا کیا۔ ۱۹۰۷ء سے ۲۲ سال تک ڈھاکہ ڈویژن کے آنریری مجسٹریٹ کے عہدۂ جلیلہ پہ فائز رہے۔ چودہ سال تک ڈھاکہ ڈسٹرکٹ بورڈ کے

رکن رہے۔ ۱۹۲۵ء سے اب تک گوشہ نشین ہیں۔

شعر و ادب میں عبدالغفور شہباز سے اکتسابِ فن کیا۔ اپنے ماموں نواب محمود آزاد اور آزاد لکھنوی جیسے اساتذہ سخن کے چشمۂ فیض سے بھی استفادہ کیا۔

شرف بزرگانِ سلف کی قابلِ قدر یادگار ہیں۔ ان کی ذات بابرکات سرزمینِ بنگال میں منفحات میں سے ہے۔ ڈھاکہ کے ایک باکمال شاعر اور مرنجانِ مرنج بزرگ ہیں۔

شرف کا پہلا دیوان ۱۹۳۷ء میں ستارۂ ہند پریس کلکتہ سے طبع ہوا۔ اگست ۱۹۵۲ء میں جب میں سندھ سے ڈھاکہ گیا تو حضرت سے شرفِ نیاز حاصل ہوا۔ انھوں نے ازراہ نوازش اپنے دیوان گلستان شرف" کا ایک نسخہ عنایت فرمایا تھا۔ "گلستانِ شرف" گلہائے رنگارنگ کا نہایت دلکش اور دلچسپ گلدستہ ہے جس کے مطالعہ سے شرف کے کمالات اور فطری قابلیت و صلاحیت کا اعتراف کرنا پڑتا ہے۔

"گلستان شرف" کے چند صفحات شہرۂ آفاق ادباء و جلیل القدر شعراء مثلاً اختر حسین بی اے (علیگ) پرنس محمد اکرم حسین مرحوم خلف الصدق واجد علی شاہ، سائل دہلوی۔ آرزو لکھنوی، بیخود دہلوی، وحشت کلکتوی مرزا فقیر محمد جہانگیر نگری، عبدالغنی دہلوی، صفدر علی دہلوی، ابرار دہلوی نکہت شاہجہانپوری وغیرہ کے تحسین آمیز تبصرے سے مزین ہیں۔

چند مستند ہستیوں کی آرائے گراں کا اقتباس اس خیال سے پیش کرتا ہوں کہ اہلِ دہلی و اہلِ لکھنؤ کی آراء بنگال کے ایک صاحبِ کمال سے متعلق ہیں سہ

آرزو لکھنوی:-

دیوان شرف میں غزلوں کے ترتیبی مجموعہ کے ساتھ ساتھ قصیدے، مقطع، مسدس، مثنویاں، رُباعیاں، سہرے، سلام، نوحے، تاریخیں غرضکہ سبھی کچھ موجود ہے جس سے صاف ظاہر ہے کہ مصنف کی طبیعت میں ہر صنف سخن سے مناسبت اور ہر رنگ میں ڈوبنے کی صلاحیت موجود ہے۔ کل کلام کے مطالعہ سے دو خوبیاں اور بھی ترشح ہوتی ہیں۔

۱۔ ادبی انقلابوں کے ساتھ ساتھ مصنف کی تبدیلیٔ مذاق گلستان شرق، میں عہد ماضی سے لے کر زمانہ حال تک کے سبھی رنگ موجود ہیں۔

۲۔ کلام کے فرق توازن سے تدریجی ترقی بھی اچھی طرح نمایاں ہو رہی ہے۔ غرضکہ دیوان مصنف کو ادبی قابلیت اور فطری مناسبت کا پورا پورا آئینہ دار ہے۔"

بیخود دھلوی

"اہل بنگال میں ایسی شستہ زبان کم نکلے گی۔ میرے نزدیک بنگال کے لئے ایسا شاعر بحیثیت زبان مُغتنمات سے ہے۔"

حکیم عبدالغنی خاں دھلوی:

"زبان شستہ اور تخیل بہت اعلیٰ ہے۔ ایک ہزار میل کے فاصلہ پر میں ہوں مگر سید صاحب کو ان کی خوبیوں کے ساتھ ہمیشہ یاد کرتا ہوں۔"

صفدر علی رضا دھلوی

زبان نہایت شستہ کلام صاف اور بیان پاکیزہ ہے۔ میں دعویٰ کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ ان کا کلام اور گفتگو ایسی ہے جو زبان

دانوں کی نہیں بلکہ اہل زبان کا حق ہے۔"

اب گلستان شرف سے چند اشعار آپ کی تفنن طبع کے لئے پیش کرتا ہوں ؎

سیاہی شب فرقت کا یہ ادنی کرشمہ تھا
کہ دود آہ دل ہمسر بنا ہے زلف پرخم کا

الٰہی آمد آمد پھر ہے کسی کے تیر کی دل میں
وہاں زخم سے جو غل ہے بر پا خیر مقدم کا

ایذا ہی کے خوگر ہیں سب حسن کے دیوانے
اُف بھی تو نہیں کرتے جلتے ہوئے پروانے

ہے ساز نشاط اپنا ٹھوکر میں زمانے کی
ٹوٹے ہوئے شیشہ ہیں پھوٹے ہوئے پیمانے

دل سے اغیار کو تو نے جو نکالا ہوتا
گھر میں بے شمع اندھیرے سی اجالا ہوتا

ادا مور کی خاک بہلائے دل کو
یہ کمبخت طرز آشنا ہے کسی کا

دونوں ہیں شوق قتل میں بیتاب و بیقرار
کچھ امتیاز بسمل و قاتل نہیں رہا

دولت پہ ہے گھمنڈ شرافت سے ننگ و عار
حال زمانہ کہنے کے قابل نہیں رہا

قتل گہہ میں تیغ کا پانی وہ طوفاں خیز تھا
بڑھتے بڑھتے موت کے دریا کا دھارا ہو گیا

تم صدا دو تو نکل آؤں ابھی تربت سے
میں تو بیدار ہوں قسمت ابھی بیدار نہیں

ڈاکٹر عندلیب شادانی نے شرف کے متعلق اپنی غزل کے مقطع میں فرمایا ہے۔

اک حضرتِ شرف کے سوا اب تو عندلیب
ڈھاکہ میں اور کوئی سخن داں نہیں رہا

محمود مولوی حافظ سید محمد محمود ابن مولوی حکیم سید زین العابدین ابن مولوی سید رحمت علی کا سن ولادت ۱۸۹۲ء اور جائے پیدائش موضع بارہ ضلع مونگیر مکافات بہار ہے۔

ابتدائی تعلیم گھر ہی پر مختلف اساتذہ سے پائی۔ حفظ قرآن کریم کا مرحلہ بھی وطن میں طے ہوا۔ پھر مدرسہ عالیہ کلکتہ میں داخل ہوئے پانچ سال اس خرمن علم کی خوشہ چینی کی۔ دوران تعلیم میں سرکار والا تبار کے وظیفہ خوار رہے مدرسہ کی تعلیم سے فارغ ہو کر بغرض تکمیل حدیث تفسیر و فقہ دیوبند گئے دو برس متعلم رہ کر علوم متذکرہ کی سند حاصل کی۔

دورانِ تعلیم میں ضمنی طور سے انگریزی زبان سے بھی شغف رہا۔ میٹرک کا امتحان تو دوران تعلیم میں دیا۔ آئی اے اور بی اے کے امتحانات دوران ملازمت میں پاس کئے۔ ایم۔ اے کا امتحان دینا چاہتے تھے لیکن کلکتہ یونیورسٹی نے شرکت امتحان کی اجازت نہ دی۔

دیوبند سے واپسی کے بعد بی ون کالج پٹنہ میں آئی اے کلاس میں تھے

کہ مسٹر ہارے پرنسپل مدرسہ عالیہ کی جوہر شناس نگاہوں نے انھیں اُردو اور فارسی کے مدرس کی حیثیت سے انتخاب کیا۔ چنانچہ ۱۹۱۹ء سے ۱۹۴۷ء تک مسلسل مدرسہ عالیہ میں بعہدہ ہیڈ مولوی بحسن وخوبی اور نیک نامی کے ساتھ خدمت انجام دیتے رہے اسی زمانے میں راقم الحروف کو بھی اپنے قابل ترین استاد اور شفیق بزرگ کی شاگردی کا فخر حاصل رہا۔ ۱۹۳۱ء سے ۱۹۴۷ء تک مدرسہ مذکورہ سے ملحقہ دارالاقامتہ ایسٹ ہوسٹل نامی میں اسسٹنٹ سپرنٹنڈنٹ رہے تقسیم کے بعد کھلنا ضلع اسکول میں ان کا تبادلہ ہو گیا اور یہاں دو برس خدمت انجام دینے کے بعد ۱۹۴۹ء میں پنشن خوار قرار پائے۔ آج کل کھلنا ہی میں مستقل قیام ہے۔ آفتاب اُردو اسکول میں اسسٹنٹ ہیڈ ماسٹر اور گرلس کالج میں لکچرار ہیں۔

مولوی حافظ محمود کی ذاتِ گرامی اس لحاظ سے بھی زیادہ قابل قدر اور ناقابل فراموش ہے کہ یہ ان گمنام اور خاموش ہستیوں میں سے ہیں جن کے اندر علوم وفنون کا ایک سمندر موجزن ہے جس سے بے شمار تشنگان علم اپنی تسکین کرتے ہیں اور جن کی ذاتِ بابرکات کے طفیل سے جادۂ علم وادب پر گامزن ہوتے اور ترقی کی منزل پر سب سے اونچے دکھائی دیتے ہیں۔ مگر ایسی ہستیوں کا نام نہ تو کبھی دنیا کے لبوں پر آتا ہے اور نہ تاریخ کے صفحات پر کلکتہ کے سیکڑوں کیا بلکہ ہزاروں علمبردارانِ ادب موصوف کے خوشہ چیں اور زیر تعلیم وتربیت رہے۔

تعلیم وتدریس کی مصروفیت کے باوجود انھوں نے تالیف وتصنیف کا جو کام کیا وہ قابل تحسین ہے۔ مطبوعہ کتابوں کی فہرست حسب ذیل ہے:۔

شمع نبی کے پروانے ــــــ صحابہ کرام کی جاں نثاری کے ولولہ انگیز واقعات صحیح احادیث سے جمع کئے گئے ہیں

جامع القواعد ــــــ یہ درحقیقت بابائے اردو مولٰینا عبدالحق صاحب کی مشہور کتاب قواعد اردو کی تلخیص کسی قدر اضافے کے ساتھ کی گئی ہے۔ تمام ضروری قواعد اس مختصر سی کتاب میں موجود ہیں

انتخاب ــــــ مشہور ارباب قلم کے مضامین کا انتخاب اور مستند شعرا کے اصناف سخن کا گلدستہ ہے۔ درسی نقطہ نظر سے لکھا گیا اور بعض مدارس میں داخل نصاب ہے۔

شعر وشاعری سے فطری ذوق ہے اردو، فارسی، دونوں زبانوں پر طبع آزمائی فرماتے ہیں لیکن باضابطہ شاعری کبھی نہیں کی۔ اس بے ضابطگی کا ایک نتیجہ یہ بھی ہوا کہ جو کچھ کہا وہ بھی محفوظ نہ رہا۔ پنج سالہ قیام کھلنا میں جو کچھ نکر کیا ہے وہ محفوظ ہے۔ اشعار ذیل کا انتخاب انھیں سے ہے۔

ارسطوی زمانہ اور سکندر جاہ ہوتا ہے
مگر ہوتا ہے دنیا میں کوئی انساں مشکل سے

بصیرت ہے تو اک اک ذرہ اک خورشید کامل ہے
بصارت گر نہیں حاصل ہے کیا خورشید کامل ہے

جو ہو ذوق عمل رہبر تو پھر آساں ہے ہر مشکل
وگرنہ ہوتا ہے آساں بھی آساں مشکل سے

نہیں مشکل زباں دینی کہ اک جنبش زباں کی ہے
مگر وعدے کے پکے ہوتے ہیں دنیا میں مشکل سے

شمع کی زندگی ہو پروانے کا ہو مرنا
جینا ہو ایسا جینا مرنا ہو ایسا مرنا

دو روزہ زندگی پر کیا جان دے رہا ہے
دو دن کی چاندنی ہے تاریک پھر زمانہ

جس کی سرشت جیسی تھی ویسا ہی وہ بنا
غفار وہ ہوا میں خطا کار ہو گیا

یہ لذّتِ گنہ نہ تھی عفو کی طلب
اک فرطِ شوق میں میں گنہگار ہو گیا

تیرے کرم نے کر دیا گستاخ اے کریم
جو شکوہ سنج میں دم گفتار ہو گیا

اکمل

اکمل علی اکمل ۱۸۷۶ء بمقام کلکتہ پیدا ہوئے اور ۱۹۳۲ء میں وفات پائی اکمل فارسی، اردو، انگریزی پر یکساں قدرت رکھتے تھے۔ ان کی ایک انگریزی تصنیف فرسٹ لیسن ان ہندوستانی گرامر FIRST LISSON IN HINDUSTANI GRAMMER انگریزی اور اردو طبقے میں بیحد مقبول ہوئی۔ شمس سے اصلاح سخن لینے اور کلام ذوق کا تتبع فرماتے رہے کلام میں داغ کی سی سادگی کے باوجود ذوق کا رنگ غالب ہے۔ نظم۔ غزل۔ قصیدہ۔ قطعہ۔ رباعی۔ مسدس۔ مخمس وغیرہ ہر صنف میں طبع آزمائی کی جو قابل تحسین ہے مجموعی حیثیت سے ان کے کلام کا سب سے زیادہ حصہ غزلوں پر مشتمل ہے۔ غزلوں میں بندش، سلاست، تخیل کی بلند پروازی پائی جاتی ہے سادگی و پرکاری کلام کی سب سے بڑی خصوصیت ہے۔ طبیعت میں بلا کی موزونیت اور غضب کی روانی تھی جس سے متاثر ہو کر علامہ رضا علی وحشت نے فرمایا تھا۔

ہمطرحی اکمل مجھے وحشت عبث ہے آرزو
اک شعر تو ہوتا نہیں کہنا غزل کا اک طرف

اکمل کے سارے مجموعۂ کلام فارسی و اُردو کو یکجا جمع کیا جائے تو دو ضخیم دیوان مرتب ہو سکتے ہیں۔ اب تک صرف ایک دیوان شمس پریس کلکتہ سے شائع ہو سکا ہے۔ نمونۂ کلام یہ ہے ؎

قابل قدر یا تو میں نہ رہا — یا کوئی صاحب نظر نہ ہوا
کی رہزنی اندیشۂ انجام نے اکمل — شوقِ دل مضطر ابھی رہبر ہوا تھا
جب سے وہ میرا شریک غم ہے اکمل کیا کہوں
کیا خوشی ہوتی ہے مجھ کو غم کی صورت دیکھ کر
جب پیار کی نظر سے وہ دل کو دیکھتے ہیں
ہم اپنی آنے والی مشکل کو دیکھتے ہیں
اک بزرگ اکمل یہ مجھ سے کہہ گئے — ہے خودی جب تک خدا ملتا نہیں

صولت حبیب النبی خاں صولت اپنے زمانے کے بہترین صحافیوں میں شمار کئے جاتے تھے۔ شاعری سے بھی فطری مناسبت تھی۔ ماہنامہ شمس جو شمس مرحوم کی یادگار میں شائع ہوتا تھا کے فاضل ایڈیٹر تھے۔ یہ وہ رسالہ ہے۔ جس میں علامہ اقبال۔ حسرت موہانی، وحشت کلکتوی جیسے نقادانِ ادب مستقل طور پر لکھا کرتے تھے۔ صولت نے شاعری میں شمس سے اکتساب فن کیا۔

عزیز عزیز النبی خاں المتخلص بہ عزیز صولت کے چھوٹے بھائی تھے۔ اور انھیں سے مشورہ سخن لیا کرتے تھے۔ سنہ ۱۹۵۰ء میں غالباً ۶۰۔ ۶۵ سال کی عمر میں انھوں نے قضا کی۔ اردو، انگریزی، عربی، فارسی

بنگلہ انہی زبانوں میں کامل دستگاہ رکھتے تھے۔ فورٹ ولیم کالج کلکتہ کے سینیئر لکچرار تھے۔ انھوں نے قرآن مجید کا ترجمہ بالکل نئے اور مفید انداز میں کیا۔ ہر ایک صفحہ پر عربی عبارت کا نہایت صاف و شستہ و سلیس ترجمہ بیک وقت دو زبانوں اردو اور بنگلہ میں نظر آتا ہے۔ ایک شخص ایک نظر میں تین زبانوں کا تجزیہ مطالعہ کر سکتا ہے یہ ان کا سب سے بڑا قابل قدر کارنامہ ہے۔ تقسیم ملک سے پہلے یعنی ۱۹۴۶ء میں جب راقم الحروف کا مسکن کلکتہ تھا۔ اس کتاب کا آخری حصہ زیر تکمیل تھا اب ان کی وفات کے بعد غالباً چھپنے سے رہ گئی۔

شاعری میں فارسی و عربی الفاظ کا استعمال بڑی خوبی سے کرتے۔ زبان سخت ضرور معلوم ہوتی ہے مگر علمی قابلیت اور شاعرانہ رفعت کا اعتراف کرنا ہی پڑتا ہے۔ کوئی دیوان اب تک شائع نہیں ہوا۔ تصوف و فلسفہ خاص رنگ ہے۔ جس سے کلام بھرا پڑا ہے۔ ایک قطعہ کے انھیں کے تین اشعار درج ذیل ہیں ؎

باعث خوشنودئ عالم ہے اصل جاوداں
رنج کے طائر کو ملتی ہے بہار بے خزاں

نطفۂ انسان میں اس کی جہد کا آغاز ہے
دیکھنا ہے دیدۂ دانا جوہر دم باز ہے

مرجع اشیائے کل ہوتا ہے بس اصل اصول
منہمک رہتا ہے اس میں ہر کوئی بہر حصول

سرور محمد سرور خاں سرور کلکتہ کے بڑے کہنہ مشق اور قادر الکلام شاعر ہیں ۱۸۹۰ء میں کلکتہ میں آنکھ کھولی ۱۹۱۵ء میں میٹریکولیشن اور ۱۹۱۶ء میں آئی اے پاس کیا۔ فن کتابت سے دلچسپی

ہی نہیں بلکہ مہارت رکھتے ہیں کلکتہ کے بہترین خوش نویسوں میں ان کا شمار ہوتا ہے۔ شمسؔ کے دو دیوان انھیں کے لکھے ہوئے ہیں۔ بفضل تعالیٰ بقید حیات ہیں۔ اور آج کل ڈھاکہ میں گوشہ نشینی کی زندگی گذار رہے ہیں۔ عرصہ تک لکھنؤ، خیرآباد، بسواں وغیرہ میں قیام رہا۔ جہاں مہدی حسین کمال، میرزا ذاکر حسین یاسؔ، فصاحت خلف امانتؔ، خواجہ عبدالرؤف عشرتؔ لکھنوی، منشی نوبت رائے نظرؔ، ریاض وکوثر خیر آبادی باسط بسوانی وغیرہ کے ساتھ معرکہ آرا مشاعروں میں شرکت کی اور خوب خوب داد حاصل کرتے رہے۔

شعروشاعری میں حاجی محمد بشیر پھلواروی جو بہار کے فارسی کے باکمال سخنور تھے کی ذات بابرکات سے استفادہ کیا۔ مہاراجہ نیپال کی قدردانی کے باعث کئی سال تک درباری شاعر بھی رہے، اُردو۔ فارسی دونوں زبانوں میں طبع آزمائی فرماتے ہیں۔ ان کا ایک فارسی دیوان لکھنؤ میں چھپ چکا ہے۔ فارسی کلام صائب شیرازی، غنیؔ کاشمیری، ناصر سرہندی کے رنگ میں ڈوبا ہوا ہے۔ اُردو کے متعدد ضخیم دواوین اور دیگر غیر مطبوعہ تصانیف ہیں۔ ان کے کلام کا رنگ وہی ہے جو امیر مینائیؒ، آتش وصبا لکھنوی کا ہے۔ رعایت لفظی، سلاست، فصاحت، روانی، صفائی، شگفتگی، درد و اثر، سوز و گداز کلام کی خصوصیات ہیں۔ ایک غزل ملاحظہ ہو ؎

چوکھٹ پہ فرشتے بھی پھٹکنے نہیں پاتے
گھر ان کا کہیں عرش معلیٰ تو نہیں ہے

وحشت کا ٹھکانا کروں اس میں کہ جنوں گا
اک دل ہے مرے سینہ میں صحرا تو نہیں ہے

یہ سنتا ہوں کہ برق سی چمکی تھی سرِ طور
یہ قصۂ بیہوشی، موسیٰ تو نہیں ہے

کیوں سامنا ہر وقت ہے اک تازہ ستم کا
عقبیٰ کہیں یا رب میری دنیا تو نہیں ہے

ممکن ہے نہ دل تھام کے رہ جائے وہ قاتل
بسمل کا تڑپنا ہے تماشا تو نہیں ہے

تجھے وہ بھی حسیں تیری طرح کیسے یقیں ہو
یوسف کو سنا ہم نے ہے دیکھا تو نہیں ہے

خالق کے سوا خلق کی منت نہ ہو سرور
سب بندے ہیں ان میں کوئی مولا تو نہیں ہے

فقیر محمد

مرزا فقیر محمد ڈھاکہ کے نواب خاندان کے چشم و چراغ ہیں اور مشرقی بنگال کے قابل قدر بزرگوں میں سے ایک ہیں۔ عمر کوئی ۸۵۔ ۹۰ کے لگ بھگ ہو گی۔ مرزا داغ دہلوی سے شرف تلمذ حاصل ہے۔ خوش فکر شاعر اور اچھے انشاء پرداز ہیں۔ تمام عمر مشرقی بنگال میں رہ کر اُردو زبان و ادب کی خاموشی مگر ناقابل فراموش خدمت انجام دیتے رہے۔ مشاہیر سے ان کو ہمیشہ راہ و رسم رہی اور بذریعہ خط و کتابت تعلقات کا سلسلہ قائم رہا۔ حضرت اکبر الہ آبادی کے رنگ خط کا اقتباس ذیل میں پیش کرتا ہوں جس سے اندازہ ہو جائے گا کہ نہ صرف اہل بنگال بلکہ سارے برصغیر کو اہل ہند نے ان کے طرز تحریر

کو بیحد پسند کیا ۔ یہ خط ۲۹ سال قبل لکھا گیا تھا ۔ اور اب نوادرِ ادب میں سے ایک ہے ؎

الہ آباد ۔ ۲۶ نومبر ۱۳ء

مکرمی السلام علیکم ورحمۃ اللہ

آپ کی تحریر ایسی اچھی ہے کہ اگر ناتوانی مانع نہ ہوتی تو داد دینے کو خود حاضر ہوتا اس طرز خیال اور زبان پر تو خود دہلی اور لکھنؤ کو ناز ہو سکتا ہے ۔ آپ کا دل و دماغ اور آپ کی زبان و طبیعت جہاں ہے وہ بنگالی نہیں ہے ۔ آپ نے میری قدر افزائی کی ہے ۔ خدا خوش رکھے میں اپنے آپکو اسکا مستحق نہیں سمجھتا ۔

دعائے خیر کا طالب
اکبر حسین

انتخاب کلام

عشق ہے عشق کی رسوائی ہے
سنگِ در ہے ترا سودائی ہے
ذرہ ذرہ حاملِ الہام ہے
پتّے پتّے پر تمہارا نام ہے

تیری خوشی کو ہم اپنی خوشی بنا نہ سکے
ہزار حیف کہ احساس غم مٹا نہ سکے
ہم آئینہ میں عکس نظر دیکھتے رہے
کس رُخ کو دیکھنا تھا کدھر دیکھتے رہے
ہے اختیار اشکوں کا مطلب گلہ نہیں
ناحق خفا ہوئے کہ تو کچھ بھی کہا نہیں
اٹھتے ہی نقاب آج بیخود ہوئے دیوانے

لو شمع نظر آئی گرنے لگے پروانے

اے جوش جنوں تو نے دنیا ہی بدل ڈالی
خاک اُڑتی ہے بستی میں آباد ہیں ویرانے

اس نور مجسم کی تصویر کے دوزخ ہیں
ظاہر کو تو ہم سمجھے باطن کو خدا جانے

عبدالمقتدر خان بہادر عبدالمقتدر ایم۔اے، پروفیسر احمد اشک ایم اے کے پدر بزرگوار تھے انتقال غالباً ۶۰ سال کی عمر میں ۱۳۵۱ھ ۱۹۳۲ء میں ہوا۔ کلکتہ کے ایک باوقار و علم دوست رئیس تھے۔

کچھ عرصہ تک کٹک (اڑلیسہ) میں پروفیسر رہے پھر خدا بخش خاں کے کتب خانے میں کٹلوگر کا فرض آخری عمر تک انجام دیتے رہے۔ ان کی ساری زندگی تحقیق و تفتیش اور حدیث علم و ادب میں گذری۔ برسوں کی کاوش کے بعد فارسی کتابوں کی نہایت جامع فہرست مرتب کی تھی جو کتابی شکل میں چھپی تھی۔ ہندوستان ہی میں نہیں بلکہ یورپ کے مستشرقین نکتہ رس نے بھی اس کتاب کے متعلق تحسین آمیز خیالات کا اظہار کیا تھا۔ جن سے محاسن کتاب کا اندازہ ہوتا ہے۔ انتجر علمی کے باوجود خلق، انکسار، محبت اور مروت کے مجسمہ تھے۔

نذرالاسلام قاضی نذرالاسلام ۲۳ مئی ۱۸۹۹ء میں مغربی بنگال کے ایک گاؤں نبام چرولیا ضلع بردوان میں پیدا ہوئے بحیثیت شاعر انقلاب بنگالی ادب میں نذرالاسلام کا مقام بہت بلند ہے۔ ہر چند ان کی تمامتر شہرت و عظمت ان کی بنگلہ شاعری اور انشاء

پردازی تک محدود ہے۔ لیکن بہت کم لوگ اس حقیقت سے واقف ہیں۔ کہ وہ اردو، فارسی، عربی، زبانوں پر بھی اتنی ہی قدرت رکھتے ہیں جتنی کہ اُردو کا ایک مجموعۂ کمال شاعر۔ ان کی یہ خصوصیت بھی نظر انداز نہیں کی جاسکتی کہ انھوں نے اُردو کی بڑی خدمت کی وہ بنگالی ادب کے سب سے پہلے شاعر ہیں جنھوں نے اردو، فارسی کی طرح بنگالی زبان میں صنفِ غزلگوئی کی بنا ڈالی۔ ان کی شاعری اردو فارسی کی حسین و دلکش ترکیبوں اور استعاروں سے مالامال ہے۔ آج جن بنگالی زبان کے شعراء کے کلام میں اُردو، فارسی کے الفاظ اور غزلوں کا سرمایہ ملتا ہے۔ یہ محض نذرالاسلام کی اُردو نوازی کی رہینِ منت ہے۔ نذرالاسلام نے حافظ کی رباعیوں کا بنگلہ زبان میں ترجمہ کیا "عم پارہ" کا مکمل ترجمہ بنگالی نظم میں کیا۔ ان کی ساری تصانیف کو پڑھ جایئے اور دیکھئے انھوں نے ہمیشہ یہ کوشش جاری رکھی کہ بنگالی سے سنسکرت کے ثقیل اور غیر مانوس الفاظ کو متروک کر کے عام فہم اور آسان الفاظ استعمال کیئے جائیں۔ اس تحریک سے ہندو، مسلمان دونوں جماعتوں میں ایک عجیب ہل چل مچ گئی تھی اخبارات و رسائل میں ان کے خلاف مضامین شائع ہونے لگے کہ نذرالاسلام اُردو اور فارسی الفاظ کے بیجا استعمال سے بنگالی زبان کو مٹانا چاہتا ہے۔ لیکن مخالفت جوں جوں بڑھتی گئی بنگالی ادب میں نکھار پیدا ہوتا گیا نذرالاسلام کی بیشتر نظمیں یا گیت ایسے ہیں جن کا پورا پورا شعر اُردو فارسی کے الفاظ سے بھرا پڑا ہے جس کے مطالعہ سے اس امر کا بھی پتہ چلتا ہے کہ انھیں نہ صرف اُردو شاعری بلکہ اس کے ردلیف، قافیہ، عروض اور دیگر اصول پر بھی مکمل عبور حاصل ہے۔ مثال کے طور پر ان کے ایک بنگالی

گیت کے دو بند پیش کرتا ہوں جس سے اندازہ ہو جائے گا کہ بنگالی زبان کا یہ آتش نوا شاعر اُردو، ہندی، اور فارسی زبانوں پر بھی کس قدر حاوی ہے۔ واضح رہے کہ یہ گیت کوئی ترجمہ نہیں بلکہ بنگالی رسم الخط سے اردو حروف میں منتقل کر دیا گیا ہے ؎

نرگس باگ (باغ) میں بہار کی آگ میں
بھرے دل داگ (داغ) میں کہاں میرے پیارے آؤ آؤ پیارے
دردِ دل زور رنگیلا کوثر
شراباً طہورا لاؤ ساقی بھر پیالہ تو بھر دے مستانہ کر دے

نشتر و بدر

اُن اساتذہ کے علاوہ جن کا تذکرہ اوپر ہو چکا ہے، عبدالکریم نشتر اور بدرالزماں بدر کی خدمات بھی ناقابلِ فراموش ہیں نشتر ایک پُرگو شاعر اور رضا علی وحشت کے تلمیذ ارشد تھے۔ ان کا ایک مجموعہ کلام "دیوان نشتر" تقریباً پندرہ سال قبل شائع ہو چکا ہے۔ ان کا انتقال غالباً ۱۹۴۹ء میں ہوا۔ موصوف کی پیدائش صوبۂ بہار چھپرے میں ہوئی تھی مگر ان کی زندگی و موت کا فیصلہ کلکتہ کے زمین و آسمان نے کیا۔

بدرالزماں بدر بیک وقت خوش فکر شاعر بھی تھے اور بہت اچھے ناول نویس بھی۔ ان کا ایک ناول "احسن" مقبول عام و خاص ہے اور بنگال کے ہر کتب خانہ میں محفوظ ہے۔ شاعری میں علامہ وحشت سے مشورہ کرتے تھے ان کا مولد و مسکن شہر کلکتہ ہے۔ نشتر سے کئی سال قبل ان کی وفات ہوئی۔

❖ ❖ ❖

چوتھا دور

دوسرا گروپ

جمیلؔ نام سید کاظم علی کاظمی۔ تخلص جمیلؔ۔ دنیائے ادب میں جمیلؔ مظہری کے نام سے مشہور ہیں۔ ۱۹۰۵ء بمقام عظیم آباد (صوبۂ بہار) پیدا ہوئے۔ بچپن ہی میں اپنے والد ماجد مولانا خورشید حسین کاظمی کے ہمراہ کلکتہ چلے آئے اور ہمیشہ یہیں رہے۔ اعلیٰ تعلیم کی منزلیں کلکتہ ہی میں طے کیں اور کلکتہ یونیورسٹی سے ایم۔ اے کیا۔

عرصہ تک ان کا تعلق روزانہ "عصر جدید" کلکتہ سے رہا اور اس میں "کوچہ گرد" کے لقب سے "مہملات" کے عنوان پر فکاہیہ لکھتے رہے۔ جسے کلکتہ کے ارباب ذوق بڑے شوق سے پڑھتے تھے۔ کچھ دنوں فلمی دنیا سے بھی منسلک رہے۔ یہ شیکسپیئر ہند آغا حشر کاشمیری مرحوم سے ارتباط خاص کا نتیجہ تھا۔ ۱۹۲۷ء میں حکومت بہار کے شعبۂ اردو سے بحیثیت

پبلسٹی آفیسر منسلک رہے۔ اسی دوران میں سیاسی ہنگامے کے موقع پر کچھ دنوں قید فرنگ میں بھی گذارے ہیں۔ رہائی کے بعد پونا حضرت جوش ملیح آبادی سے ملنے گئے اور وہیں کلکتہ کی ایک فلم کمپنی کے جوہر شناس مالک نے اس لعل گرانمایہ کو اپنا لیا۔ ۱۹۴۷ء میں بہار گورنمنٹ نے انہیں ڈپٹی ڈائرکٹر پبلسٹی ڈیپارٹمنٹ کے منصب پر فائز کیا لیکن اس عہدے سے بھی مستعفی ہو گئے آج کل پٹنہ یونیورسٹی میں اردو فارسی کے پروفیسر ہیں۔

جمیل مظہری سیاست میں آزاد پسند ہیں امام الہند حضرت مولانا ابوالکلام آزاد کی صحبت سے مدت تک فیض حاصل کرنے کا موقع ملا۔

ابتداء میں اپنے والد سے مشورۂ سخن لیتے رہے پھر اسلامیہ کالج کلکتہ کے زمانۂ طالب علمی میں علامہ وحشت کلکتوی کی طرف رجوع کرنے کا خیال ہوا اور ایک قطعہ کہہ کر علامہ موصوف کی خدمت میں پیش کیا۔ جس کے ابتدائی اشعار یہ ہیں ؎

پیچیدہ رسم در راہ سخن دیکھ کر جمیل
مدت سے آرزو تھی کوئی راہبر ملے
وحشت بھی ہیں طریقۂ غالب پہ گامزن
یعنی جناب خضر مجھے ہمسفر ملے

علامہ وحشت جوہر قابل دیکھ کر بہت خوش ہوئے اور دو چار غزلوں کی اصلاح کے بعد کلام کو اصلاح سے بے نیاز سمجھ کر یہ رقعہ لکھ دیا۔

" عزیزی! آئندہ سے آپ اپنی طبع سلیم پر اعتبار کریں آپ کے کلام میں وہ بات پائی جاتی ہے جو مشاہیر شعرائے ہندوستان کے کلام میں نہیں

میں نہیں پائی جاتی۔" تاہم فخریہ خود کو شاگردانِ وحشتؔ میں شمار کرتے ہیں اور اکثر اپنے اشعار میں انتہائی عقیدت کا اظہار فرماتے ہیں سے

اُسے تتبعِ وحشتؔ کا حق نہیں ہے جمیلؔ
جسے کہ دردِ جگر میں مزا نہیں ملتا

مطرب خلد سے سنی وحشتؔ خستہ کی غزل
آگیا کچھ مزا جمیلؔ زمزمۂ حجاز میں

جمیلؔ مظہری دورِ حاضرہ میں اُردو ادب کے اُن ممتاز و مشہور انشاء پرداز اور شاعروں میں سے ایک ہیں جو تمام اصناف پر کامل قدرت رکھتے ہیں اور جن کی نظم و نثر بیک وقت قدیم و جدید رنگ کے حسین و دلکش امتزاج کی حامل ہوتی ہیں۔ جمیلؔ ادب میں نئے رجحانات کے پیدا کرنے کے دلدادہ لیکن اس روش میں سختی سے جادۂ اعتدال پر قائم رہنے کے پابند ہیں۔ سیاسی، انقلابی، اقتصادی، جذباتی، علمی، ادبی، فلسفیانہ، تاریخی، مزاحیہ مضامین، افسانے، ڈرامے اور نظمیں وغیرہ ان کے قلم سے نکلیں جو ہند و پاکستان کے مشہور اور بلند معیار پرچوں میں چھپتی اور بار بار نقل کی جاتی ہیں۔

جمیلؔ کی شاعری کا ایک خاص رنگ ہے جو انفرادیت کا ضامن ہے۔ لفظوں کا انتخاب، بندش کی چستی، اسلوبِ بیان کی قدرت، طرزِ تحریر کی جدت و ندرت، زبان کی بے ساختگی و شگفتگی وہ خصوصیات ہیں جو جمیلؔ کو موجودہ دور کے اکثر شعراء سے ممیز کرتی ہیں۔ بقول نیاز فتحپوری ـــــ وہ نہایت خوش گو شاعر اور خوش فکر ادیب ہیں اور خیال کی رعنائی، اسلوبِ بیان کی گہرائی ان کے افکار نثر و نظم کی

خصوصیت خاصہ ہے۔"

جمیلؔ کا ایک مجموعۂ کلام موسوم بہ "نقشِ جمیل" مکتبۂ ادب پٹنہ کے تحت شائع ہو چکا ہے جس کی ضخامت ۲۵۶ صفحات ہیں۔ اس مجموعے میں ان کی سیاسی، انقلابی، رومانی نظمیں شامل ہیں۔ اس میں سے ایک شعر نقل کرتا ہوں جو ان کی عشقیہ شاعری کے لئے ایک دیباچہ کا حکم رکھتا ہے ؎

شاعری اب دلِ مرحوم کا ماتم ہے جمیل
میرے شعروں کو مبارک مرا نالاں ہونا

بخوفِ طوالت یہاں نمونۂ نظم پیش کرنے سے قاصر ہوں لہذا ان کی متعدد غزلوں کے چند اشعار قارئین کی ضیافتِ طبع کے لئے نقل کرتا ہوں ؎

بقدرِ پیمانۂ تخیل سرور ہر دل میں ہے خودی کا
اگر نہ ہو یہ فریبِ پیہم دم نکل جائے آدمی کا

ہے روح تاریکیوں میں حیراں بجھا ہوا ہے چراغِ منزل
کہیں سرِ راہ یہ مسافر پٹک نہ دے بوجھ زندگی کا

یہ کوئی بات نہیں ہے کہ ہوا کے رُخ پر
چھوڑ دوں دل کا سفینہ کہ جہاں تک پہنچے

جمیلؔ اس دل کی بانسری میں ہزاروں نغمے بھرے ہوئے ہیں
جسے سنانے کی تھی تمنا اُسی نے اب تک سنا نہیں ہے

میں شبِ فراق کا خوابِ خوش ہوں جہانِ نازو نیاز میں
مری زندگی نے حقیقتوں کو بدل دیا ہے مجاز میں

جو یہی مزاج ہے حسن کا تو کسے ہو عشق کا حوصلہ
نظر آ رہا ہے کسی کا دل مجھے شمعؔ تیرے گداز میں
جلانے والے جلاتے ہی ہیں چراغ آخر
یہ کیا کہا کہ ہوا تیز ہے زمانے کی
مجھے جلنا نہیں ہے کچھ سمجھ کر دور بیٹھا ہوں
مرا مقصد فقط کسب ضیا ہے شمع محفل سے
دنیا ہے محبت سے خالی اور دل ہے محبت کا جویا
صحرا میں مسافر پیاسا ہو ملتا نہیں پانی کیا کہیے

جمیلؔ مظہری کا ایک مسلسل افسانہ فتح و شکست کے نام سے سنہ ۱۹۵۰ء میں مکتبۂ ارتقاء کی طرف سے شائع ہو کر خراج تحسین حاصل کر چکا ہے اس فسانہ کی مقبولیت کا اندازہ صرف اس امر سے لگایا جا سکتا ہے کہ اس کا پہلا ایڈیشن دو تین ماہ کے اندر ہاتھوں ہاتھ فروخت ہو گیا اور دوسرا ایڈیشن اسی سال میں طبع ہوا۔ یہ افسانہ اس سے قبل سنہ ۱۹۴۰ء میں ماہنامہ ندیم پٹنہ کے بہار نمبر میں "فرض کی قربان گاہ پر" کے عنوان سے اشاعت پذیر ہو کر جمیلؔ کی انفرادی شخصیت کا لوہا منوا چکا تھا۔ یہ افسانہ ہمارے افسانوی ادب میں بالکل نئی اور اچھوتی چیز ہے۔ کہانی نہ صرف دلچسپ اور دلکش ہے بلکہ انداز بیان، اسلوب گفتار، انشاء پردازی و فلسفہ طرازی میں کچھ ایسا اچھوتا پن اور بانکپن ہے کہ اس کی مثال اردو نثر میں نہیں ملتی اس میں فرض و محبت کی کشمکش اور اس کے مختلف مرحلوں میں غیر شعوری نفسیاتی احساسات و جذبات کی حقیقی ترجمانی کو جس طور پر قلمبند کیا گیا ہے وہ اپنی مثال آپ ہے۔ زبان کی شیرینی اور طرز ادا

کی قدرت سے مطالعہ کے وقت اکثر زبان سے بے ساختہ داد تحسین نکلتی ہے

آصف عبدالرحمن نام۔ آصف تخلص۔ والد کا نام مولوی عبدالشکور بنارس کے محلے چاہ مہماں میں ۱۹۰۲ء میں پیدا ہوئے۔ ہنوز ۷ سال کے نہ تھے کہ والدین کے ساتھ کلکتہ آئے۔ شروع ہی سے ذہانت کا یہ عالم تھا کہ بغدادی قاعدہ پڑھتے تھے اور سن کر سورتیں انہیں یاد ہوگئیں تھیں کہ قرآن کے متعلم کو غلطی پر ٹوک دیتے تھے اور بتایا کرتے تھے۔ انگریزی میں میٹرک پاس ہیں۔

۱۹۲۰ء حصول فن شاعری کے لئے پہلے انسب مرحوم اور اس کے بعد علامہ وحشت کلکتوی کے حلقۂ تلامذہ میں داخل ہوئے وحشت کے ارشد تلامذہ میں انہیں ممتاز درجہ حاصل ہے بلکہ وحشت کو ان پر ناز ہے۔ آصف کا مقام اب بجائے خود استاد کا ہے حلقۂ تلامذہ بہت وسیع ہے۔ شاگردوں میں ہندو مسلمان سب ہی انکے چشمۂ فیض سے فیضیاب ہوتے رہے ہیں۔ کلکتہ کے مارواڑی ہندو نژاد اور دوسرے اردو سے دور افتادہ طبقہ میں اردو سے محبت اور شعر و شاعری کا شوق آصف آصف ہی کے دم سے ابھرا۔ ان کے شاگردوں کی فہرست حسب ذیل ہیں۔

پروفیسر اختر ایم۔ اے، اختر پشاوری۔ افضل ایم۔ اے ڈاکٹر شبید ادہلوی۔ پردیسی چکوالی، ساغر چینوٹی، شفقت کلکتوی عطاالرحمن عطا، قدوس صدیقی، کلیم جونپوری، لچھمن نرائن، سوروچ مدن لال آباد مایا لعل درد۔ بسمل۔ جگن جینی، عارف، کاشف، شاکر

ذاکر، رضا ابن آصف، محمد اسمٰعیل فائز، عزم بازید پوری، اختر ماہ پوری، مولانا شفیق اطہر وغیرہ۔

آصف تقسیم بنگال کے بعد ۱۹۵۰ء سے ڈھاکہ (مشرقی بنگال) میں مقیم ہیں کلام نہایت پختہ، اور حسن تغزل کا اعلیٰ نمونہ ہے۔ فن عروض پر کامل مہارت ہونے کی وجہ سے اشعار جس قدر فنی عیوب سے پاک ہیں شاعرانہ اعتبار سے اتنے ہی بلند ہیں۔ نمونۂ کلام :-

بیچ سے سلسلۂ قصۂ غم توڑ دیا
تیرے عاشق نے جوانی ہی میں دم توڑ دیا

مے تھرائی، ساغر مئے کانپنے لگی
آنکھیں کھلیں نہ میرے کف رعشہ دار کی

اس سادگی کو کہتے ہیں ایا نکی سادگی
کرنے چلے ہیں بت کا گلہ برہمن سے ہم

خودی کے واسطے موزوں نہ بیخودی کے لیے
یہ بندہ ہونا مصیبت ہے آدمی کے لیے

ذوق مرا صحیح نہ تھا شوق کی حد نہ بن سکی
دل کو سکوں نہ مل سکا کعبہ و سومنات میں

جوانی میں پینے سے انکار آصف
یہ کفران نعمت مسلماں ہو کر

عمر بھر گوشۂ مسجد میں ادا کی ہے نماز
پا لے ساقی پہ بھی اک سجدۂ شکرانہ سہی

تصادم خس والفت کا تو فطرت کا تقاضا تھا
یہ تہمت مفت کی کیسی الٰہی میرے سر آئی

بل ڈالے حیا نے ہیں جو یہ بال بال میں
قربان جاؤں کس کو پھنسائے گے جال میں

میکدے میں آ گئے یہ ہو مان لو ساقی کی بات
توبہ کر لیجیے تو آصف روکتا کوئی نہیں

واصف

محمد سلیمان نام ۔ واصف تخلص ۔ ۱۹۰۴ء میں بنارس میں ولادت ہوئی ۔ آصف کے چھوٹے بھائی ہیں ۔ والدین کے ہمراہ طفلی ہی میں کلکتہ چلے آئے اور وہیں پروان چڑھے اور تعلیمی منزلیں طے کیں ۔ ۱۹۲۰ء نثر نگاری شروع کی ۔ ایک ناول "نخچیر محبت" ۱۶۰ صفحے پر مشتمل لکھا جو طبع ہوکر ۲ - ۳ سال کے اندر نایاب ہوگیا ۔ "عصر جدید" کلکتہ میں اعزازی طور پر مضامین لکھتے رہے "۔ افکار پریشاں" کے تحت جتنے بھی مضامین شائع ہوئے واصف ہی کے طبع زاد تھے ۔ یہ مضامین مستقل طور پر ایک زمانہ تک فکاحی کالم میں نکلتے رہے "کوچہ گرد" کی نقاب ڈال کر علامہ جمیل مظہری عصر جدید کے فکاحی کالم کے لئے مضامین لکھا کرتے تھے لیکن جب موصوف کو یہ نقاب کسی دوسرے کے چہرے پر ڈالنے کی ضرورت ہوتی تھی تو غریب اصف ہی کا چہرہ کچھ موزوں معلوم ہوتا تھا ۔ قرعۂ فال بنام من دیوانہ زدند ۔۔ کاروباری مصروفیت ہمیشہ مضمون نگاری میں سد راہ رہی لیکن شائق احمد عثمانی مالک ایڈیٹر عصر جدید سے تنگ آکر مضامین لکھتے تھے ۔ اکثر و بیشتر ایسا ہوتا کہ ایڈیٹر سر پہ سوار ہوکر مضامین لکھواتے اور لیجاتے ۔

مزاحیہ مضامین ۔ افسانے ڈرامے مقالات ، غزلیں نظمیں آپ کی قلم کاریوں کا اچھا خاصا نمونہ ہیں ۔ ان کے افکار نظم و نثر کی ایک نامکمل سی فہرست درج ذیل ہے :۔

مزاحیہ مضامین

"ہمارا سفر دارجلنگ"	عصر جدید کلکتہ میں متعدد قسطوں میں شائع ہوا
بنارس سے بہار تک	" "
کیوپڈ کا مجسمہ اور میں	" "
کے سالنامے	

شکار پارٹی — خادم کلکتہ خاص نمبر میں شائع ہوا۔
سوراج کے بعد — " "
عید یا امریکہ — عصر جدید — خاص نمبر میں
عجو نواب — نکات رنگون — ماہنامہ "
چچا نخرد — سرپنچ لکھنؤ سالنامہ بدست نسیم الہ آبادی صاحب
افسانے — حملہ سے عشق — عالم گیر لاہور
آدم خوار "

علمی و تاریخی مضامین:۔ سیدنا حسین کی قربانی ۔ ہندوستان کی لنگوا فرنیکا اور اس کا رسم الخط جرم و تعدیل ۔ تنقیدات نیاز فتح پوری پر تنقید۔

تصانیف:۔ نخچیر محبت یا حسن پارتی (ناول) پرتھوی راج۔ پاکستان جوبلیس سیریز۔ جنگ روس و تاتار۔ شانتا۔ عورت کا انتقام (فلمی کہانی)، نادر شاہ (ڈرامہ)

علاوہ بریں غزلیں، نظمیں، قطعات اور رباعیات مطبوعہ و غیر مطبوعہ ہیں۔ شرفِ تلمذ علامہ وحشت سے حاصل ہے۔

نمونۂ کلام پیش ہے ؎

وہ صنم کدہ جو قدیم تھا ہوا کعبہ دین متین کا
وہ حقیقت آئینہ ہو گئی جو نہاں تھی پردۂ راز میں

ہوا جی یک بیک بیزار سب کا پارسائی سے
یہ کیا شے لاکے تو نے بزم میں پیر مغاں رکھدی

آجاؤ کہ مل بیٹھ کے اک تصفیہ کر لیں
تم عہد جفا کا کرو ہم عہد وفا کا

ڈالی تھی آرزو نے گلستاں کی داغ بیل
افسردگی دل نے بیاباں بنا دیا

پھر داغ بیل ڈال رہا ہوں بہار کی ۔۔۔ پھر سی رہا ہوں پیرہن تار تار کو
پہاڑ رات تھی فرصت کی کاٹ دی میں نے ۔۔۔ کیا وہ کام جو کوہ سے ہو نہ سکا

قمر ۔ نام عبدالصمد تخلص قمر۔ ادبی دنیا میں قمر صدیقی کے نام سے مشہور تھے ۱۹۰۰ء میں شہر کلکتہ میں پیدا ہوئے اردو اور عربی کی ابتدائی تعلیم وتربیت ۔ والد ماجد کے زیر نگرانی ہوئی۔ مدرسہ عالیہ کلکتہ سے میٹرک اور اسلامیہ کالج (حال کلکتہ سنٹرل کالج) سے بی۔ اے پاس کیا۔ پھر کلکتہ یونیورسٹی سے اُردو اور فارسی میں ڈبل ایم اے کی ڈگریاں امتیازی حیثیت سے حاصل کیں۔ ایم اے کے ساتھ بی ٹی کیا۔

شروع میں لامارٹینز، کالج LA MARTINEER
اور کمرشیل انسٹی ٹیوٹ میں بحیثیت پروفیسر انگریزوں کو اُردو اور فارسی کا درس دیتے رہے۔ دوسری عالم گیر جنگ کے زمانے میں پہلے لفٹیننٹ پھر کیپٹن کے عہدے پر فائز رہے۔ تقسیم ہند کے بعد مغربی پاکستان روالپنڈی بھیجے گئے تھے اور پھر مارچ ۱۹۵۰ء میں ان کا تبادلہ مشرقی پاکستان ڈھاکہ ہو گیا جہاں آخری دم تک فوجیوں کی تعلیم وتربیت کے فرائض بحسن وخوبی انجام دیتے رہے اور وہیں ۲۱ر دسمبر ۱۹۵۱ء کو حرکت قلب بند ہو جانے کی وجہ سے داعی اجل کو لبیک کہا۔

کیپٹن قمر صدیقی اوائل عمر سے شعروشاعری کی طرف مائل تھے۔ اسلامیہ کالج کے ایام طالب علمی میں علامہ وحشت کلکتوی کے زمرۂ تلامذہ میں شامل ہوئے باکمال نکتہ سنج شفیق استاد کی فیض وشفقت، اپنی اعلیٰ تعلیم، ذاتی مطالعہ خداداد ذہانت اور علمی قابلیت کی بنا پر بہت جلد نکات شعر وادب اور فن وعروض پر بدرجۂ کمال حاوی ہو گئے۔

لیکن ہر حال میں وحشتؔ کے دامنِ فیض سے وابستگی کو باعثِ فخر و مسرت محسوس کرتے جب تک بقیدِ حیات رہے اپنے کرمفرما استاد کی جو خدمت، قدر و منزلت کرتے رہے وہ عدیم المثال ہے۔ اپنے کلام میں وحشتؔ کے حسنِ عقیدت وارادت کا ذکر فخر و مباہات سے اکثر و بیشتر کیا۔ ایک شعر میں فرماتے ہیں ؎

کمالِ نکتہ فہمی سے قمرؔ اپنا یہ دعویٰ ہے
کوئی وحشتؔ کو کیا سمجھے گا جیسا ہم سمجھتے ہیں

اس قسم کے اشعار میں نے شیشے کے فریموں میں لکھے دیکھے ہیں جو ان کے کمروں میں جابجا آویزاں اور باعثِ زینت ہیں

علامہ وحشتؔ قمرؔ کو فرزندِ عزیز کی طرح شفقت فرماتے اکثر موقعوں پر ایسے جذبات کا اظہار فرمایا ہے ۱۹۴۱ء میں اسلامیہ کالج کے سالانہ مشاعرے میں قمرؔ فوجی ملازمت کے باعث ایک مدت کے بعد شریکِ محفل ہوئے تھے۔ قمرؔ کی شرکت سے وحشتؔ کو جو خوشی ہوئی تھی وہ ضبط نہ کر سکے اور فوری جذبات میں برجستہ یہ شعر ارشاد فرمایا ؎

قمرؔ کے آنے سے محفل کو چار چاند لگے
سخن قمرؔ کے لیے قمرؔ سخن کے لیے

جب قمرؔ کا انتقال ہوا اس وقت خاکسار راقم الحروف لاہور میں مقیم تھا۔ قمرؔ کی وفات حسرت آیات کا پیغام حضرت وحشتؔ نے اپنے ایک مکتوب کے ذریعہ جن الفاظ میں تحریر فرمایا تھا وہ حسبِ ذیل ہیں ؎

"آپ کو اب تک معلوم ہو گیا ہوگا کہ ایک جانگداز سانحہ کا مجھ کو بھی مقابلہ کرنا پڑا ہے قمرؔ صدیقی کی ناگہانی موت ہے

دل سے کسی طرح نہ مٹے گا قمرؔ کا داغ
باقی مرے جگر میں رہیگا جگر کا داغ

قمرؔ صدیقی کلکتہ اور مضافات کلکتہ کی سوسائٹی میں بھی ہردلعزیز تھے مشاعروں اور ادبی محفلوں میں قمر کی شرکت باعثِ رونق وزینت اور کامیابی سمجھی جاتی۔ قمرؔ نہ صرف پرگو شاعر تھے بلکہ بدیہہ گوئی وزود کلامی میں بھی اپنا جواب آپ تھے۔

دورانِ گفتگو میں ان کے دلچسپ و دلآویز چست فقرے بےحد لطیف اور اثر انگیز ہوتے۔ قمرؔ کی شخصیت کا رعب اور کمال شاعری کا اثر بھی محفلوں پر کچھ ایسا چھایا رہتا کہ اچھے اچھوں کا ناطقہ بند ہو جاتا اور ان کی تیز و طرار زبان کے آگے کسی کی ایک نہ چلتی۔ گذشتہ ربع صدی میں کلکتہ میں جن اربابِ ادب کا اردو کی ترقی و اشاعت میں نمایاں حصہ رہا ہے اور جنھوں نے کلکتہ کے نوجوان طبقہ میں علم و ادب کا رجحان پیدا کیا اور ذوق شعر و ادب کی صحیح رہنمائی کی ان کی فہرست میں قمر صدیقی کا نام بھی فراموش نہیں کیا جا سکتا۔ خصوصاً جن نوجوانوں کا ذوقِ سخن قمرؔ کی آغوشِ تربیت میں پروان چڑھا ان میں پرفیسر اظہر قادری ایم۔ اے اور فضلی دانشر قابل ذکر ہیں۔

قمر صدیقی نے تقریباً تمام اصناف سخن مثلاً نظم، غزل، قصیدہ، رباعی قطعہ، مسدس، مخمس وغیرہ پر طبع آزمائی کی لیکن ان کے کلام کا بیشتر حصہ غزلوں پر مشتمل ہے۔ جو حسنِ تغزل اور معیار فن کا بہترین نمونہ ہے۔ فرسودہ خیالات، نئے اور اچھوتے مضامین، دلاویز استعارات، دلنشیں تشبیہات نادر اصطلاحات کے دلدادہ تھے۔ ان کے کلام میں وہ تمام خوبیاں بدرجۂ اتم موجود ہیں جو انھیں اپنے معاصرین میں ممیز کرتی ہیں۔

مرزا غالبؔ کے رنگ اور وحشتؔ کے تتبع میں بھی اکثر اشعار کہے جو سوز و گداز، تاثیر، فلسفۂ محبت اور رموز حیات کے حامل ہیں۔ چند اشعار

ہدیۂ ناظرین ہیں ؎

مصائب نے جو دنیا میں اس کو آلیا ہوتا
یہ بندہ پھیلتا اتنا کہ عالم کا خدا ہوتا

مجھے محروم جلوہ خود ہوس ہی نے مری رکھا
غبار شوق مٹ جاتا تو دل آئینہ سا ہوتا

قمر کب تک ہجوم غم سے محرومی کا افسانہ
مزہ آتا جو کچھ تیری غزل میں فلسفہ ہوتا

یوں محو ذوق پرستش پر احساں جتایا جاتا ہے
ہوتی ہے نیاز افزائی دل جب ناز اٹھایا جاتا ہے

آتی ہے بہار لالہ رخاں بڑھتی ہے جس کی رعنائی
جب خون تمنا سے دل کو رنگین بنایا جاتا ہے

ہر شمع تمنا ہے مدھم ہونے کو ہے بزم دل برہم
یکساں ہے اب اس کا وجود و عدم مٹایا جاتا ہے

افسردگی و الام قمر چھا جائیں نہ اک دن محفل پر
کیوں اس کو بلا کر محفل میں افسردہ بنایا جاتا ہے

قمر صدیقی تاریخ گوئی میں ید طولیٰ رکھتے تھے۔ سلاست و فصاحت کے ساتھ ساتھ روانی، برجستگی، شگفتگی، چستی، بندش اور مناسب الفاظ کی نشست نمایاں خصوصیات ہیں۔

فضلی نام سید فضل احمد کریم۔ تخلص فضلی۔ ولادت نومبر ۱۹۰۶ء وطن۔ الٰہ آباد۔ والد بزرگوار سید فضل رب فضلی اپنے عہد کے خوش گو شعراء میں شمار ہوتے تھے۔ فضلی نے ذوق شعری اپنے والد سے

درجہ میں پایا۔ بی اے تک الہ آباد میں تعلیم حاصل کی پھر آئی۔ سی۔ ایس۔ کے امتحان میں کامیاب ہو کر سنہ ۱۹۳۰ء ٹریننگ کے لئے ولایت تشریف لے گئے وہاں آکسفورڈ سے بی۔ لٹ کی ڈگری حاصل کی۔ نومبر سنہ ۳۲ء میں ہندوستان واپس آئے۔ بنگال میں تقرر ہوا۔ اس وقت سے قیام پاکستان تک برابر کلکتہ میں رہے۔ تقسیم بنگال کے بعد حکومت مشرقی بنگال میں سکریٹری تعلیمات کے منصب پر مامور ہوئے۔ آج کل مری، (پنجاب) میں سکریٹری برائے امور کشمیر حکومت پاکستان کے عہدۂ جلیلہ پر فائز[1] ہیں۔

فضلی فطری شاعر ہیں بہت خوب کہتے ہیں۔ ایک مجموعۂ کلام "نغمۂ زندگی" جو سنہ ۱۹۴۱ء میں انجمن ترقی اردو حیدرآباد دکن کے تحت شائع ہوا تھا اہل ذوق سے خراج تحسین حاصل کر چکا ہے۔ ان کا کلام ہندوستان اور پاکستان کے رسائل و جرائد میں برابر چھپتا رہتا۔ ایک غزل پیش ہے ؎

وہی ہے ظلمات کا سا عالم وہی اندھیرا ہے چشم تر میں
وہی ہے بعد سحر بھی اے دل جو زندگی تھی سحر سے پہلے

اسیر دام خرد کے ہیں جو انھیں مبارک یہ احتیاطیں
انھیں سے ہوتے ہیں معرکے سر جو کھیل جاتے ہیں سر سے پہلے

یہ کیسے مانوں کہ تو نہ کھائے گا اب کوئی پھر فریب اے دل
وہی مری سادگی ہے اب بھی جو تھی فریب نظر سے پہلے

گداز میرا در فکر غالب سے تھی تو رونق سخن کی لیکن
بھلا کہاں بانکپن تھا ایسا غزل میں فضلی جگر سے پہلے

۔ بیخود عباس علیخاں نام۔ تخلص بیخود سنہ ۱۹۰۷ء میں بمقام کلکتہ پیدا ہوئے سنہ ۱۹۲۶ء میں مدرسہ عالیہ کلکتہ سے میٹرک سنہ ۱۹۳۰ء میں اسلامیہ کالج

---

[1] آج کل کراچی میں مرکزی حکومت سے وابستہ ہیں۔

سے بی۔ اے (اور فارسی آنرز میں اوّل) سنہ ۱۹۲۲ء میں فارسی میں درجہ اوّل میں ایم اے اور سنہ ۱۹۳۹ء میں اردو میں ایم اے کے امتحانات پاس کیے۔

سنہ ۱۹۳۶ء میں جب علامہ وحشت کلکتوی نے پنشن کے قبل چھٹی لی تو ان کی جگہ بیخود کا بحیثیت پروفیسر شعبہ اردو تقرر ہوا۔ اور سنہ ۱۹۴۶ء سے اب تک پریسیڈنسی کالج کلکتہ میں اردو کی خدمت کر رہے ہیں

پروفیسر عباس علیخاں بیخودؔ بقول پروفیسر نیاز احمد (علیگ) پروفیسر اور شاعر دونوں حیثیتوں سے یکساں مشہور ہیں۔ کلکتہ کے ادبی اور تعلیمی ماحول میں انھیں قابل رشک اہمیت حاصل ہے لیکن وہ جتنے مشہور ہیں اس سے کہیں زیادہ ہر دل عزیز ہیں۔"

عباس علیخاں بیخودؔ، پروفیسر بھی ہیں اور شاعر بھی۔ اگر شاعر اپنے فاتحانہ انداز میں کہتا ہے ؎

موت آ رہی ہے وعدے پہ یا آ رہے ہو تم
کم ہو رہا ہے درد، دلِ بے قرار کا

تو پروفیسر بھی اپنے بصیرت افروزی کا سکہ بٹھلائے بغیر نہیں رہتا ؎

غزل سرائی کی لذت ہے ویر پا بیخودؔ
بگڑ رہی نہیں بادۂ کہن کے لئے

بیخودؔ کا شمار بلاشبہ علامہ وحشت کے ان شاگردوں میں ہوتا ہے جن پر وحشتؔ کو ناز ہے اور جو ان کو اولاد جیسے عزیز ہیں۔ بیخودؔ کا کلام نہایت پختہ اور زبان و فن کے اعتبار سے بہت بلند ہے۔ ایک مجموعہ[۱] "جامِ بیخودی" کے نام سے سنہ ۱۹۴۶ء میں چھپ چکا ہے۔ بطور نمونہ چند اشعار ہدیۂ قارئین ہیں

---

[۱] اس کا ایک نسخہ موصوف نے راقم الحروف کو مئی سنہ ۱۹۵۲ء میں ازراہِ نوازش عنایت فرمایا ہے۔

جفا کا تیری طالب ہوں وفا ہے مدعا میرا
یقین نامرادی پر بھی دیکھو حوصلہ میرا

جوشِ جنوں میں تنگ ہیں صحرا کی وسعتیں
وحشی نے تیرے دشت کو زنداں بنا دیا

چمن میں برق ہے گلچیں ہے اور صیاد ہے
قفس میں پھر بھی تڑپتا ہے دل چمن کیلئے

شکر خدا کہ شکوۂ اعدا نہیں ہمیں
مرہون منتِ کرم دوستاں رہے

ہوسِ نشاط و راحت سببِ غم و الم ہے
جسے سود کا ہو سودا کرے فکر وہ زیاں کی

دلِ حزیں کو امید نشاط فردا ہے
فریب خوردۂ رنگینیٔ تمنا ہے

سہیں جفائیں جو میں نے یہ میری عادت تھی
وفا جو کی نہیں اس نے یہ رسم دنیا ہے

پرویز شاہدی نام اکرام حسین۔ تخلص پرویز۔ حلقۂ ارباب ذوق میں پرویز شاہدی کے نام سے مشہور ہیں۔ مولد لودی کٹرہ پٹنہ سٹی میٹرک کلکتہ سے پاس کیا۔ ایم اے پٹنہ یونیورسٹی سے کیا۔ ۱۹۳۵ء سے اب تک کلکتہ میں مستقل طور پر قیام ہے۔ پہلے مٹیا برج کالج اور اب رپن کالج کلکتہ میں بحیثیت پروفیسر اردو کی خدمت میں مصروف ہیں۔ ماہنامہ جدید انقلاب کلکتہ بارہ سال تک انہیں کی ادارت میں شائع ہوتا رہا۔

پرویز شاہدی ایک فطری شاعر ہیں۔ مجسم شاعر اور صرف شاعر، طرز و انداز گفتگو اور ہر چیز میں شاعرانہ عظمت بدرجۂ کمال نمایاں ہے۔ ان کی آوازاتی

اچھی اور پڑھنے کا انداز اتنا موثر اور دلنشین ہے کہ محفلوں پر چھا جاتے ہیں۔

اختر شیرانی مرحوم کی طرح پہلے خالص رومان، نغمہ و شباب کے شاعر تھے اور اب صرف ترقی پسند شاعر ہیں اور اشتراکی و انقلابی نظمیں کہنے کے دلدادہ حیاتِ انسانی کی تصویر کشی، زندگی کی صحیح عکاسی، خیالات کی بلندی، جذبات کی گہرائی، احساسات کی بے پناہی، زبان کی لطافت، طرز بیان کی رنگینی ترتیب الفاظ کا حسن، یہ وہ خوبیاں ہیں جو ان کی نظم و نثر دونوں میں بدرجہ اتم موجود ہیں۔ ان کی تخلیقات رنگِ قدیم و جدید کا نہایت حسین و لطیف سنگم نظر آتی ہیں۔ شاعری میں انھیں بہت بلند مقام حاصل ہے۔

نظمیں بھی کہتے ہیں اور غزلیں بھی۔ لیکن رباعی ان کا محبوب موضوع سخن ہے اس صنف میں یدِطولیٰ حاصل ہے۔ رباعیاں عموماً ساقی شراب اور میخانہ کے گرد گھومتی ہیں۔ چند رباعیاں بطور نمونہ پیش کرتا ہوں ؎

سینے سے زباں تک جلانے پہلے
ساقی دلِ سوزاں کو جگا دے پہلے
شعلہ بنکر رباعیاں لپکیں گی
ہر بوند کو آگ تو پلا دے پہلے

مستی میں نظر چمک رہی ہے ساقی
ساری محفل بہک رہی ہے ساقی
کیا کیف رباعیوں میں بھر لایا ہوں
ہر لفظ سے مے چھلک رہی ہے ساقی

افسردہ خوبِ زشت پیتا ہوں میں
خونِ حرم و کنشت پیتا ہوں میں
کیا چیز ہے کیا چیز یہ بہتی ہوئی آگ
ہر بوند میں ایک بہشت پیتا ہوں میں

اب رنگ نہیں رات کا کالا ساقی
ہے نور سے پُر چاند پیالہ ساقی

ساغر تو نہیں تو نے اُچھالا ساقی تارا بنکر چٹک گئی ہیں بوندیں

رضا

نام سید امیر رضا مظہری الکاظمی۔ تخلص رضاؔ۔ دنیائے ادب میں رضا "مظہری الکاظمی" کے نام سے مشہور ہیں۔ مشہور انشاء پرداز وشاعر جمیل مظہری کے چھوٹے بھائی ہیں۔

رضا مظہری کا آبائی وطن اگرچہ حسن پورہ ضلع سارن (بہار) تھا لیکن ان کی ولادت مئی ۱۹۰۵ء ضلع مظفر پور کے ایک دیہات میں ہوئی۔ ابتدائی تعلیم مظفر پور میں ہوئی۔ اس کے بعد تعلیم کے سلسلہ میں مرشد آباد علی گڑھ کلکتہ، جگہ جگہ کی خاک چھانتے رہے۔ علی گڑھ سے آئی۔ ایس۔ سی اور بی اے کے امتحانات پاس کیے۔ کلکتہ میں بی۔ ٹی۔ کرنے کے بعد مدرسہ عالیہ میں ۱۹۳۷ء میں بحیثیت معلم ان کا تقرر ہوا۔ چند سال حکومت مغربی بنگال کے شعبۂ نشر واشاعت میں مترجم کی حیثیت سے اردو کی خدمت کرتے رہے اور اب دوبارہ مدرسہ عالیہ میں بحیثیت ہیڈ ماسٹر عہدہ معلمی پر فائز ہیں۔ ۱۹۵۱ء میں ایم اے بھی کر چکے ہیں۔

رضا مظہری ایک پرگو شاعر اور جلیل القدر انشاء پرداز ہیں۔ بہت کم لکھتے اور بہت کم کہتے ہیں۔ لیکن جو نظمیں، غزلیں، افسانے، مقالات وغیرہ ان کی نوک قلم سے نکل کر رسائل وجرائد کی زینت بن چکے ہیں وہ اُن کی منفرد طرز تحریر اور بے پناہ صلاحیت کا اعلیٰ نمونہ ہیں۔ اگر انہیں غم روزگار سے فرصت ملتی تو وہ یقیناً زیادہ لکھتے اور ان کی اس کثیر التحریر ان کے لئے باعث شہرت بنتی مگر یہ اردو ادب کی بدنصیبی ہے کہ ایسے فنکاروں کو افکار حیات اور غمہائے روزگار اکثر دنیائے ادب سے دور ہی رکھتے ہیں لیکن اس کے باوجود انھوں نے ادب کو ہر حال میں زندگی کیلئے لازم سمجھا۔ سرت چند رچٹرجی کے بہترین ناول

کا ترجمہ "چونری" کے نام سے کیا جس کی ضخامت ۵۰۰ صفحات ہے یہ بنگلہ ناول انجمن ترقی اُردو کی تغافل شعاری کے باعث اب تک زیورِ اشاعت سے آراستہ نہ ہو سکا۔ دوسرا ناول "آوارہ یادگار" کے نام سے مکمل ہے، افسانے مضامین، اور نظموں کے چند مجموعے مرتب اور اشاعت کے منتظر ایک درسی کتاب "نظامِ حکومت" کے نام سے شائع ہو چکی ہے جو کلکتہ یونیورسٹی کے نصاب میں داخل ہے۔

شاعری کے متعلق خود ان کی زبانی سُنیئے:

"فنِ شعر[1] میں باقاعدہ شاگردی کا فیض کسی سے بھی حاصل نہ کیا۔ لیکن۔

ع "تمتع زہر گوشہ یا فتم"

گھر پر: المرحوم سید خورشید حسن خورشید اور برادرِ محترم حضرت جمیل مظہری کی صحبتوں میں ابتدائی مشق کی اور اصلاح ہوتی رہی حضرت وحشت اور ان کے شاگردانِ کرام کے فیضِ صحبت نے بہت کچھ سکھلایا۔ شاعری میرے لئے ذہنی نہیں، صرف افکارِ زندگی سے گریز کا ذریعہ۔ جو کچھ کہتا ہوں اپنے لئے کہتا ہوں اس لئے میرے شعروں کے دامن میں کوئی پیام نہیں صرف زندگی کے تلخ تجربے ہیں اور یہی میری زندگی پر میرا ایک شعر ایک مجمل تبصرہ ہے ؎

کسی طرح جو اس ریگ زارِ ہستی پر
اُبھر سکا جو نہ پورا وہ نقشِ پا ہوں میں"

---

[1] پیام نو، مولفہ وفا راشدی صـ ۱۸۳

کل درد تھا عبارت درماں کی جستجو سے
اب درد بن گیا ہے اک جزوِ زندگی کا

ڈوب کر بھی ہم اُبھر آتے ہیں — جیسے تقدیر میں ساحل ہی نہیں
دکھ سہے جاؤ جیئے جاؤ رضاؔ — اس سفر کی کوئی منزل ہی نہیں

گھبرا کے فضائے گلشن سے اُکتا کے بہارِ پیہم سے
آ نکلے گلستاں والے کچھ تقدیر کھلی ویرانے کی

آغازِ محبت میں نے کیا محرومی سے مایوسی سے
انجام جو ہے اوروں کیلئے سرخی ہو مری افسانے کی

دریا کے ابل پڑنے پہ رضاؔ حیرت ہو اگر تو زیبا ہے
کیا اس سے چھلکنے کا شکوہ وسعت تھی یہی پیمانے کی

شوق کی سرگرمیاں بھی ختم ہو جاتی ہیں اگر
زندگی کی آگ میں دل کو سلگتا دیکھئے

دل پر جس کے بھی جو گزر جائے — تم نے تو مسکرا کے دیکھ لیا
دل پہ کچھ ابھرے تھے نقشِ اُمید — آنسوؤں کے ساتھ وہ بھی بہہ گئے

جی رہا ہوں پھر بھی میں زندہ نہیں تیرے بغیر
مٹ گیا ہے فرقِ ہستی و عدم میرے لئے

وہ کشمکش تربیت کرتا نہیں جو ذوق کی اپنے
ابل پڑتی ہے مے اس کی چھلک جاتا ہے جام اس کا

رضاؔ وہ بھول تم سے جو ہوئی تھی اظہارِ الفت میں
لیا جائے گا شاید زندگی بھر انتقام اس کا

تمنّا منشی مسیح الدین المتخلص بہ تمنّا مرحوم باشندگان کلکتہ میں سے تھے۔ رضا علی وحشت سے تمنّا کو شرف تلمذ حاصل تھا۔ ۱۲۷۵ھ میں علی پور کچہری کلکتہ میں مختاری کرتے تھے۔ چند اشعار ہدیہ قارئین ہیں ؎

گر لپٹتا تو کبھی خواب میں اے مصحفِ رو
تن عریاں پہ مرے جامہ عریاں ہوتا

جب وہ مہتابی سے رخسار دکھا دیتے ہیں
چرخ پر ماہ کو خورشید بنا دیتے ہیں

حکم قانون شفائے مرض غم ہے یہی
بوسۂ لب دل بیمار کا درماں ہوئے

ذبیح ڈھاکہ کے نواب خاندانوں میں بیشتر خوش فکر اور باکمال شعرا گذرے ہیں۔ عصر حاضر کے شعراء میں شرف الدین شرف (جن کا تذکرہ گردیپ اول میں ہوچکا ہے) محمد اسمٰعیل ذبیح اور خواجہ عادل قابل ذکر ہیں۔

ذبیح بہت کہنہ مشق شاعر ہیں عمر تقریباً ۶۵ سال کے لگ بھگ ہوگی ظاہر ہے کہ عمر کے لحاظ سے کلام میں پختگی و مشاقی کی جھلک نمایاں ہونی چاہیے۔ نواب آف ڈھاکہ کے اے ڈی کانگ ہیں۔ راقم الحروف کو ان سے کئی بار ملنے کا شرف حاصل ہوچکا ہے۔

بنگال کے قابل قدر صاحب علم و فضل حضرت ابو العلائی سے استفادہ کیا۔ مرزا داغ دہلوی مرحوم سے بذریعہ خط وکتابت کلام کی اصلاح لیتے رہے۔ داغ کے ہمراہ ہندوستان کے بعض مقامات دہلی۔ دکن اور لکھنؤ کی سیر کی۔

نمونۂ کلام ملاحظہ ہو ؎

روشن فروغ بادہ سے ہے انجمن تمام
ساغر پہ ہو رہا ہے گماں آفتاب کا

کبھی خالی نہیں ہیں چال سے عیار کی باتیں
یہ کہتا ہے دم عہد وفا اکثر بہت اچھا
زمانہ بھر میں کوئی غیر کو اچھا نہیں کہتا
کہو انصاف سے کہتے ہو تم کیونکر بہت اچھا

گلہ کیوں کروں کیا مرا سر پھرا ہے		گلے پر عنایت سے خنجر پھرا ہے
بہت دیکھے ہیں انقلابات عالم		فلک عمر بھر میرے سر پر پھرا ہے

عطاالرحمٰن عطاالرحمٰن صدیقی کلکتہ کے ان علم دوست اور ادب نواز ہستیوں میں سے ایک ہیں جن کی ساری زندگی خدمت زبان اردو اور کاوش و تحقیقات ادب میں گذری ہے ۔ ان کے متعدد علمی وادبی مضامین بنگال کے مختلف رسائل و جرائد مثلاً جدید اردو ، روز نامہ ہند و عصر جدید کلکتہ کے عام و خاص ایڈیشن میں چھپ کر اہل علم و اہل نظر سے خراج تحسین حاصل کر چکے ہیں ۔

مسٹر راس مسعود مرحوم نے بھوپال میں فورٹ ولیم کالج کی تقلید میں ایک سوسائٹی قائم کرنے کا ارادہ کیا تھا ۔ جس کا مقصد سنسکرت اور ہندی زبان کے علمی ذخیروں اور جواہر ریزوں کو اردو ادب میں منتقل کرنا تھا چنانچہ عطاالرحمٰن نے مسعود مرحوم کے حسب فرمائش ۲۵۰ کتابوں کی فہرست مرتب کی تھی ۔ یہ مسعود مرحوم کو اتنی پسند آئی کہ معاوضہ عطا کیا ۔ یہ فہرست عطاالرحمٰن کے علمی ذوق اور وسیع مطالعہ کی شاہد ہے ۔ اس فہرست میں کیا کچھ تھا اس کی صراحت خود عطاالرحمٰن کی زبانی سنیئے ۔ " یہ فہرست تین حصوں میں منقسم تھی پہلا حصہ ان کتابوں کا تھا جو براہ راست سنسکرت سے اردو میں منتقل ہوئی تھیں اور دوسرا حصہ ایسی کتابوں کا تھا جو کسی ایک غیر زبان کے توسط سے اردو میں منتقل ہوئی تھی ۔

اور تیسرا حصہ دو زبانوں وغیرہ کے توسط کا تھا۔

سالنامہ جدید اردو ستمبر ۱۹۴۵ء

ظفر

اہل بنگال کیلئے یہ امر باعث فخر و مسرت ہے کہ "وحشت اسکول" کے چشمۂ فیض سے نہ صرف متوطنِ بنگال فیضیاب و مستفید ہوئے بلکہ ہندو پاکستان کے اکثر صوبوں کے مشہور و ممتاز اہل قلم کو بھی اس اسکول سے اکتساب فن سخن کا شرف حاصل ہے خصوصاً پنجاب کے جو فنکار دامن فیض وحشت سے وابستہ رہے ان میں پیرزادہ سید ظفر ہاشمی کا نام قابل ستائش ولائق قدر ہے۔

ظفر ہاشمی ایک خوش فکر ادیب اور مشہور شاعر ہیں ان کی متعدد تالیفات و تصنیفات زیور اشاعت سے آراستہ ہو کر ارباب علم و فضل سے خراج تحسین حاصل کر چکی ہیں تقسیم ہند سے پیشتر ہند و پاک کے مشہور اخبارات، رسائل و جرائد مثلاً روزآنہ انقلاب، مخزن، نیرنگ خیال، عالم گیر لاہور، ساقی دہلی، چمنستان امرتسر وغیرہ میں مضامین نظم و نثر نمایاں طور پر شائع ہوا کرتے اور حلقہ علم و ادب میں بہ نظر قدر و استحسان دیکھے جاتے۔

گو ظفر ہاشمی کی ولادت بتاریخ یکم جنوری ۱۹۰۹ء میں صوبۂ پنجاب بمقام سیالکوٹ میں ہوئی۔ لیکن یہ سعادت فضلائے بنگال کو حاصل ہے کہ اس کے زیر سایہ نہ صرف تعلیم و تربیت کی اول و آخر منزلیں گئیں بلکہ نکات حیات اور رموز سخن سے بھی آشنا ہوئے۔

یہ بھی کتنی عجیب بات ہے کہ خان بہادر حضرت علامہ رضا علی وحشت سے ان کی ملاقات صرف ایک بار ۱۹۳۵ء میں ہوئی تھی مگر بذریعہ خط و کتابت استاد شاگرد کے تعلقات اتنے پرخلوص، پرجوش اور شفقت و محبت آمیز ہیں کہ اس کی

مثال تاریخ ادب اردو میں خال خال ہے۔ عموماً استاد و شاگرد کے تعلقات اصلاح کلام و مشورۂ سخن تک محدود ہوتے ہیں۔ یا زیادہ سے زیادہ اُن میں گفت و شنید اور نامہ و پیام کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔ جس میں خلوص و محبت کم اور تکلفات کے عناصر زیادہ ہوتے ہیں اس کے برعکس وحشتؔ و ظفرؔ کے خطوط نہ صرف ایکدوسرے کے مخلصانہ جذبات و محسوسات کے شاہد ہیں بلکہ ادب کیلئے سرمایۂ گرانمایہ کا حکم رکھتے ہیں۔ اگر مکاتیب وحشتؔ کو کتابی شکل میں شائع کر دیئے جائیں تو ان کی اہمیت مرزا غالب مرحوم کے "اردوئے معلّیٰ" سے ہرگز کم نہیں ہوگی

ظفرؔ ہاشمی نے اپنے بے شمار اشعار میں اپنے استاد محترم (وحشتؔ) کی یاد، خوبیٔ کلام اور اعترافِ فیض کا اظہار جس طرز نو اور فخریہ انداز میں کیا ہے۔ وہ ان کی استاد سے والہانہ محبت، بے پناہ عقیدت اور پرستارانہ نیازمندی کا آئینہ دار ہے ؎

ہاشمی کو سخن پہ ناز تو ہے ملا اُستاد اس کو وحشتؔ سا

(حسنِ کلام صفحہ ۷۸)[1]

جو تیری قدر اتنی ہو رہی ہے اہل محفل میں

ظفرؔ کیا حضرتِ وحشتؔ سی پایا ہی بیاں تو نے

(حسنِ کلام صفحہ ۱۱۱)

میں نے غزل کہی ظفرؔ وحشتؔ کے رنگ میں (ایضاً صفحہ ۱۱۳)

کچھ انبساطِ خاطرِ دلدار دیکھ کر

صبا کلکتے جاکر حضرت وحشتؔ سے کہہ دینا

ظفرؔ پنجاب کے گوشہ میں بیٹھا یاد کرتا ہے

---

[1] حسن کلام ظفرؔ ہاشمی کا ایک مجموعہ کلام ہے۔

ظفر کے دو مجموعۂ کلام "حسنِ کلام اور حسنِ خیال" منظرِ عام پر آچکے ہیں۔
روانیِ طبیعت اور پرگوئی کا یہ عالم ہے کہ پانچواں دیوان مکمل ہے ؎

ہاشمی حضرتِ وحشت کا کرم ہے ہم پر
ہاتھ میں پانچواں دیوان لئے بیٹھے ہیں

تیسرا مجموعۂ کلام "تنویرِ عجم" زیرِ طبع ہے جو بہت جلد شائقین علم وادب کے ہاتھوں میں ہوگا۔

۱۹۲۷ء سے ۱۹۳۷ء تک ظفر کا قیام لاہور میں رہا۔ ان دنوں امرتسر سے ایک رسالہ "چمنستان" جاری کیا جو حالات کے نامساعد ہونے کے باعث ۱۹۳۳ء میں بند ہو گیا۔ پھر کچھ عرصہ تک ماہنامہ عالمگیر لاہور کے مدیرِ اعلیٰ رہے۔ ۱۹۳۰ء میں عالمگیر میں ایک مبسوط مقالہ "وحشت کی شاعری" پر شائع کیا اس سے قبل سر عبد القادر مرحوم کے مخزن میں وحشت کے مقالات اور علامہ اقبال و وحشت کے طرحی کلام شائع ہوا کرتے تھے مگر حضرت وحشت کا سب سے پہلا مکمل تعارف اسی مقالہ نے کرایا۔ اس مقالہ کے باعث ظفر ہاشمی پر چاروں طرف سے تحسین و آفریں کے پھول برسائے گئے اور علامہ اقبال کی بارگاہ ظفر کی رسائی کا سبب یہی مضمون تھا، وحشت نے انہیں دنوں یہ شعر ارشاد فرمایا تھا ؎

اگر بنگالہ قدرے من نہ داند ما چہ غم وحشت
صدائے می دہد از گوشۂ پنجاب اقبالم

ظفر کے علمی و ادبی مضامین نثر "سیرتِ رسول اور حسنِ ادب" کے نام سے شائع ہو چکے ہیں۔

ظفر ہاشمی کا پہلا مجموعہ حسنِ خیال ۱۹۳۳ء میں طبع ہوا۔ مجموعی طور پر

پر کلام عیرفیانہ مگر مخصوص رنگ کا حامل ہے ہر نظم ایک خاص رنگ ، خاص کیفیت کی آیئنہ دار ہے جس کے مطالعہ سے روح میں بالیدگی جذبات میں بیداری طبیعت میں زندگی سی محسوس ہونے لگتی ہے۔ ہر شعر ایک پیام ایک تڑپ اور ایک حیات ہے اقبال اور تعلیماتِ اقبال سے بجید متاثر ہیں اور کیوں نہ ہو جبکہ اقبال کی صحبتوں اور محبتوں سے فیضیاب ہو چکے ہیں اکثر اشعار اقبال کے رنگ میں ڈوبے ہوئے ہیں مثلاً ؎

ذرہ ہائے خاک کو دے اِذنِ رقصِ بیخودی
آفتاب ان خاک کے ذروں میں پنہاں بھی ہے

دہر میں تیرا ٹھکانہ ہے نہ کعبہ میں پناہ
کفر سے رنجیدہ آزردہ ایماں بھی ہے

آج جو منزل کی جانب سے چلا ہے رہنما
درحقیقت وہ ترا غارتگر ایماں بھی ہے

مندر و مسجد میں ناقوس و اذاں کی ہے پکار
ہر صدا ہے نغمۂ عرفاں فزا ہی ہمکنار

بقول حضرت وحشت ظفر ہاشمی کی طبیعت کو شعر و سخن سے ایک قدرتی مناسبت ہے اکثر اشعار سے سوز و گداز مترشح ہے جس سے کلام میں تاثیر پیدا ہوگئی ہے اور یہی شعر کی غایت ہے۔"

غزلیں عموماً وحشت ، حسرت موہانی اور اثر لکھنوی کے رنگ میں کہی

لہ ۲ سنہ ۱۹۵۰ء میں میرا قیام لاہور میں ہوا تھا انھیں دنوں جب میں ماہنامہ کائنات اڈیٹ کرتا تھا۔ ظفر نے مجھے حسن کلام اور حسن خیال کا ایک ایک نسخہ عطا فرمایا تھا (نوٹ صفحہ ۱۶۵، ۱۶۶)

ہیں جو تغزل کی جان ہیں۔ الفاظ کی سادگی و پرکاری، زبان کی برجستگی و پاکیزگی، رنگین تشبیہات، دلکش اصلاحات، طرز بیان کی سنجیدگی و متانت، ظفر کی شاعرانہ رفعت علمی قابلیت اور فنی و ادبی صلاحیت کی مظہر ہیں بطور نمونہ از خروارے حسن کلام (دوسرا مجموعۂ کلام مطبوعہ ۱۹۳۸ء) سے چند اشعار ہدیۂ ناظرین ہیں:-

تقاضا سوزِ دل کا ہے کہ ہے شوقِ فنا غالب
نہیں معلوم سوئے شمع کیوں پروانہ آتا ہے

جب سے ان کا نقاب اٹھا ہے لطفِ ذوقِ نظر نہیں آتا

حضرتِ ہاشمی یہ ذوقِ تجسس کب تک
عشق بھی کرتے رہے اور مسلماں بھی رہے

جسے بغیر طلب کے ملا ہو سوزِ جگر
کسی کریم سے وہ التماس کیا جانے

نشاطِ سوز نگاہِ بلند و ذوقِ یقیں
نہ کردے مجھ کو حقیقت شناس کیا جانے

مے یقین سے ہو لبریز جس کا جام ظفر
بھلا جہاں کا وہ خوف و ہراس کیا جانے

طرزی

پورا نام سید محمود طرزی، والد سید محمد علی مرحوم ولد سید قادر علی مرحوم ہے۔ محمود طرزی کی پیدائش ۲۴ ستمبر ۱۸۹۰ء باغپت ضلع میرٹھ میں ہوئی۔

ان کی زندگی کا اولین نصف حصہ پراز مصائب رہا۔ ان کا ذریعہ معاش ۱۹۰۲ء سے بحیثیت گاف بوائے پانچ روپیہ سے شروع ہوتا ہے

دس روپیہ ماہانہ پر اسسٹنٹ کوتوال، سولہ روپیہ ماہانہ پنشن، ۱۹۱۲ء میں کلکتہ ٹراموے کمپنی میں ڈاکٹر رہے۔ اگست ۱۹۱۸ء میں محمد نذیر خاں دہلوی کے عنایت وکرم سے کاروباری دنیا میں داخل ہوئے اور زندگی کے روشن دن کا آغاز ہوا۔ ۱۹۲۰ء میں اکاؤنٹنٹ اور ۱۹۲۲ء میں نیو کمرشیل کمپنی کے حصہ دار رہے۔ ۲۳ دسمبر ۱۹۲۳ء کو امریکن ایسٹرن ٹوباکو کارپوریشن لمیٹیڈ میں ایک سو پچیس روپیہ ماہنامہ پر ملازم ہوئے ۲۴ نومبر ۱۹۲۱ء میں اس کمپنی کے منتظمین نے ہرسٹی میچ کمپنی لمیٹیڈ کی تشکیل کی اور سکریٹری کی حیثیت سے ساڑھے چار سو روپیہ تنخواہ سواری کے لئے موٹر کار اور تمام سیاہ سفید کا اقتدار حاصل ہوا۔ اب دو عالیشان پریس کے مالک ہیں۔ پہلا پریس ۱۹۳۹ء اور دوسرا ۱۹۴۵ء میں قائم ہوا۔

محمود طرزی کی شخصیت نہایت بارعب، پرشکوہ اور ہر دلعزیز ہے انقلابی نظمیں اور علمی، تاریخی، ادبی و تحقیقی مضامین اخبارات و رسائل میں چھپ کر ان کی قابلیت و صلاحیت کا لوہا منوا چکے ہیں۔ علم دوستی، بزم پرستی، احباب نوازی اور غربا پروری میں عدیم المثال ہیں۔ فطرتاً حد درجہ خوش مزاج اور بے انتہا بذلہ سنج واقع ہوئے ہیں۔ گفتگو میں ایسی چاشنی اور دلکشی ہوتی ہے کہ ہر صحبت اور ہر محفل میں چھا جاتے ہیں۔ کئی رسالوں اور اخباروں کے ایڈیٹر اور سرپرست رہے ہیں ان کا ذاتی کتب خانہ[1] تقریباً پانچ ہزار علوم و فنون مشرق و مغرب کے رسائل و کتب پر مشتمل ہے جو ان کے شوقِ مطالعہ اور ذوقِ علم و ادب کا شاہد ہے

---

[1] خاکسار راقم الحروف نے ان کے کتب خانہ سے بھی استفادہ کیا ہے۔

آغا حشر کاشمیری مرحوم ان کے رفیق خاص تھے۔ ایک زمانہ تھا کہ آغا حشر کو انڈین تھیٹر کے لیے ڈرامے لکھتے اور محمود طرزی کے زیر ہدایت وہ اسٹیج ہوتے غزلیں کم اور نظمیں زیادہ کہتے ہیں۔ نظموں میں عموماً رومانیت کم اور وطنیت کے عناصر زیادہ ہوتے ہیں۔ ایک نظم کے چند اشعار ملاحظہ ہوں ؎

ہے دل بتوں کے لیے، اور دماغ فن کیلئے
خطا معاف ہو کیا رہ گیا وطن کے لیے

وہ ملک کیوں نہ خداداد خودی سے ہو محروم
جہاں ہو روح کی سوداگری بدن کیلئے

سہاگ نام ہے بیوہ کی حسرتوں کا یہاں
کہ چوڑیاں بھی میسر نہیں دلہن کے لیے

بس انتہا ہے کہ ایک بدنصیب بیٹی نے
حیا کو بیچ دیا باپ کے کفن کے لیے

قسم ہے آپ کو مضرابِ سازِ ہستی کی
قلم کو تیغ بنا دیجئے وطن کے لیے

ہیں خمکدۂ میں سخن کے ہوں محتسب طرزی
محاسبہ ہے مری نظم اہل فن کے لیے؛

حسرت پروفیسر عبدالقیوم حسرت نعمانی ایم اے کلکتہ کے ہر دلعزیز علم دوست اور احباب نواز تھے۔ کلکتہ یونیورسٹی میں اُردو اور سٹی کالج میں فارسی پڑھایا کرتے۔ تقسیم بنگال کے بعد سنہ ۱۹۴۷ء میں ڈھاکہ یونیورسٹی سے وابستہ ہو گئے۔ سنہ ۱۹۵۰ء میں ڈھاکہ میں اچانک حرکت قلب بند ہو جانے کی وجہ سے تقریباً ۵۰ سال کی عمر میں رحلت فرمائی۔

حسرت نعمانی تنقید و تحقیق کی بہت اچھی صلاحیت رکھتے تھے ان کے مقالات کلکتہ اور لاہور کے رسائل وجرائد میں عموماً اور ماہنامہ نگار (لکھنؤ) (حضرت نیاز فتحپوری حسرت کے بہت مداح ہیں) میں خصوصاً شائع ہو کر ارباب علم و ادب سے خراج تحسین حاصل کر چکے ہیں۔ جو اردو ادب میں گرانقدر سرمایہ کی حیثیت رکھتے ہیں۔

شاعری سے فطری لگاؤ تھا۔ وحشت کلکتوی سے شرف تلمذ رہا۔ نثر کی نسبت نظم کا سرمایہ بہت کم ہے۔ کوئی مجموعہ شائع نہیں ہوا۔ اسلامیہ کالج کلکتہ کے ایک سالانہ مشاعرہ منعقدہ ۲۰ر نومبر ۱۹۲۳ء زیر صدارت وحشت میں وہ حسرت نے ایک غزل پڑھی تھی اس کے مندرجہ ذیل تین شعر میرے ذہن میں اب تک محفوظ ہیں۔ مصرعہ طرح تھا۔ ع

"بہتر یہ ہے کہ حال دل اپنا بیاں نہ ہو۔"

اے خوگر سجود مزاج آستاں کا دیکھ
یہ جذبۂ نیاز ترا رائگاں نہ ہو

دیکھے قفس میں پھر کوئی کیوں خواب گلستاں
جب آنکھوں ہی میں کیفیت گلستاں نہ ہو

کس کس ادا سے اس نے بڑھایا نظر کا ذوق
مطلب یہ تھا کہ کوئی ادا رائگاں نہ ہو

طاہر

پروفیسر سید محمد طاہر رضوی مرحوم کی پیدائش ۱۹۰۵ء بمقام حسین آباد ضلع پلاموں میں ہوئی۔ پٹنہ یونیورسٹی سے ۱۹۲۱ء میں میٹرک، ۱۹۲۳ء میں رپن کالج کلکتہ سے آئی اے ۱۹۲۵ء میں پریسیڈنسی کالج کلکتہ سے بی اے (فارسی میں آنرز کے ساتھ) اور ۱۹۲۷ء

میں کلکتہ یونیورسٹی سے ایم اے کا امتحان پاس کیا۔ بی اے اور ایم۔ اے کے ہر دو امتحانات میں اول آئے۔

ایم۔ اے کے بعد پریسیڈنسی کالج میں لکچرار اور کلکتہ یونیورسٹی کے ہیڈ اگزامنر کے عہدۂ جلیلہ پر فائز ہوئے۔ ۱۹۲۲ء میں ان کا تبادلہ اسلامیہ کالج میں (جواب کلکتہ سنٹرل کالج ہے) فارسی کے ہیڈ آف دی ڈیپارٹمنٹ کی حیثیت سے ہو گیا۔ تقسیم بنگال کے بعد ۱۲ ستمبر ۱۹۴۷ء میں راجشاہی کالج (مشرقی بنگال) میں عربک اور پرشین ڈیپارٹمنٹ کے ہیڈ کی حیثیت سے تبادلہ ہو گیا۔ اکتوبر ۱۹۴۷ء میں جب اپنے اہل وعیال سے ملنے کلکتہ آئے تو انھیں دنوں میں اللہ کے پیارے ہو گئے۔

پروفیسر طاہر رضوی کو انگریزی و فارسی میں غیر معمولی لیاقت و مہارت تھی۔ انگریزی میں ایک کتاب "پارسیز دی ہیلپ آف دی ملک" تصنیف کی جو اہل علم طبقہ میں عموماً اور پارسیوں میں خصوصاً بیحد مقبول ہوئی۔ ان کی زندگی ہی میں پروفیسر بازند رانی نے فارسی میں اس کا ترجمہ ایران لیگ ببمبئی سے کیا اور اردو میں نگار پریس سے شائع ہوا۔

طاہر رضوی ایرانیات و اسلامیات کے مضامین میں مستند سمجھے جاتے تھے۔ دوسری تصانیف خدمات ایران بہ اسلام و یگانگت آیات قرآن دگاتھا اور یکسانی عقائد و کیش زردشتی ہیں۔ ان تصانیف کی شہرت کے باعث ۱۹۳۴ء میں سابق شاہ ایران رضا شاہ پہلوی مرحوم نے ایران کے مشہور معروف شاعر فردوسی طوسی کی ہزار سالہ برسی کی تقریب میں خاص طور سے مدعو فرمایا تھا۔ تقریب کے موقعہ پر طہران میں اپنی فارسی میں فاضلانہ تقریر کے ذریعہ اپنی ہندوستانی تحقیقات علمی کا ثبوت پیش کیا

اور یہ ثابت کیا کہ شاہنامہ میں جو اشعار فردوسی نے دقیقی کے نام سے لکھے ہیں وہ حقیقتاً فردوسی ہی کے ہیں۔ اسی زمانے میں بغداد و عراق کا بھی سفر کیا۔

اُردو زبان میں تقریباً چالیس کتابیں اسکول و کالج کے تعلیمی نصاب کے لئے لکھیں جن میں سے بعض کی فہرست یہ ہے

(۱) گلشنِ اُردو (۲) خیابانِ ادب (۳) دلبستانِ رضویہ
(۴) انتخاب سبزواریہ (۵) چمنستانِ ادب (۶) اُردو کمپوزیشن

وحید

وحید النبی خاں۔ المتخلص بہ وحید ایم۔اے کلکتہ کے قادر الکلام شاعر، جلیل القدر ادیب اور شہرۂ آفاق مصنف تھے۔

زندگی کی اول و آخر سانس کلکتہ میں لی اور ۱۹۴۲ء میں اس دارِ فانی سے عالم جاودانی کو سدھارے۔

کلکتہ یونیورسٹی سے اُردو، فارسی، انگریزی میں ٹریبل ایم۔اے کیا گو اپنی خود دار طبیعت کے باعث شہرت اور نام و نمود سے اجتناب کرتے رہے لیکن اُردو زبان و ادب کی جو خاموش خدمات انجام دی ہیں وہ رہتی دنیا تک فراموش نہیں کی جاسکتیں، انگریزی، فارسی، عربی اور اُردو ادبیات سے متعلق وسیع مطالعہ اور غیر معمولی تحقیقات تھیں۔ تحریر و تقریر میں بے تکلفانہ بحث و مباحثہ کی صلاحیت رکھتے تھے۔

انگریزی زبان میں میٹرک کلاس کیلئے کئی کتابیں تالیف و تصنیف کیں جن میں انگریزی و اُردو قواعد کی ایک کتاب "ٹینس ٹیچر" TENSE TEACHER بیحد مفید و مقبول ہے اور بیس سال سے داخلِ نصاب ہے ادبی تصانیف میں ایک "ڈرامہ" "خیر و شر" آج تک کتب خانوں کی زینت ہے۔ اس کا ایک نسخہ خاکسار مؤلف کے کتب خانہ میں محفوظ ہے۔

فورٹ ولیم کالج کلکتہ کے منشی بورڈ آف اکزامنز اور مدرسہ عالیہ کے مدرس تھے۔ ظاہر ہے کہ سیکڑوں طلبا ان کے چشمۂ فیض سے مستفیض ہو چکے ہیں مولف کو بھی موصوف سے اکتساب علم کا فخر حاصل ہے۔

وحید فطری شاعر تھے۔ علامہ وحشت کلکتوی کے خوشہ چیں اور عزیز شاگرد تھے۔ اور انھیں سے کسب فن شاعری کی سعادت حاصل کی۔ موزونی طبع و حاضر دماغی کا یہ عالم تھا کہ جماعت میں انگریزی نظمیں پڑھاتے وقت اکثر اشعار کا اردو ترجمہ کر ڈالتے۔ راقم الحروف کی درخواست پر (ورڈز ورتھ) (WORDS WORTH) کی مشہور رومانی نظم "LUCY" (لوسی) کو اردو زبان میں منتقل کیا۔ ترجمہ کرنے کا یہ طریقہ تھا کہ خاکسار انگریزی شعر پڑھتا جاتا اور اس کا ترجمہ وہ اردو شعر میں فرماتے جاتے اور پھر خاکسار قلمبند کرتا جاتا۔ افسوس کہ وہ نظم ضائع ہو گئی۔

"جنگ اُحد" اور "جنگِ بدر" سے متعلق ان کی نظمیں جو مسدس کی شکل میں ہیں اردو شعری ادب میں شاہکار کی حیثیت رکھتی ہیں۔ بخوف طوالت نمونہ پیش کرنے سے قاصر ہوں۔

ایک نظم "اردو" سے متعلق جو مدرسہ عالیہ میگزین سنہ ۱۹۴۱ء میں شائع ہوئی تھی۔ اس کے چند اشعار قارئین کے تفنن طبع کیلئے پیش کرتا ہوں ؎

ہے موجد زبان اُردو فضائے فطرت
روح و رواں اُردو نشو نمائے فطرت

سچ تو یہ ہے کہ اس کے بانی ہیں دو ہی ارکان
اک رکن اس کے ہندی اک رکن اہل ایران

ہندوستان زمیں ہے، فارس نے بیج ڈالا

دونوں نے مل کے بویا۔ دونوں نے مل کے پالا
مغلان پارسی گو ہندوستان میں آئے
رنگ اپنے ہندیوں پر ہر بات میں جمائے
وہ لفظ ان سے سیکھے اور دس انہیں سکھائے
اپنی معاشرت کے آداب بھی بتائے
یوں رفتہ رفتہ بھاشا میں فارسی سمائی
یعنی زبان اُردو یوں کام میں آئی
ثا، صاد، وعین، وطا، ظا گو ہیں عرب سے آئے
مانوس ہند ہو کر ہندی میں ہیں سمائے
کیوں ہے نزاعِ لفظی کس واسطے لڑائی
کہتے ہیں جس کو ہندی اردو ہی ہے بھائی
دونوں میں فرق کچھ بھی دیتا نہیں دکھائی
کچھ فرق ہے تو یہ کہ اُردو میں ہے صفائی
گسہ زبان ہندی، غصہ زبان اُردو
مہراج طرز ہندی حضرت بیان اُردو
کوچوں میں ہے یہ ہندی بازار میں ہے اُردو
قصبوں میں ہے یہ ہندی دربار میں ہے اُردو
بولی میں ہے یہ ہندی اشعار میں ہے اُردو
پنچوں میں ہے یہ ہندی محفل میں یار اُردو
ہندی زبان اُردو محتاج زیب و زینت
اُردو زبان ہندی سج دھج میں خوبصورت

کہتا ہے کوئی اُردو اسلام کی زباں ہے
کہتا ہے کوئی اس میں ہندو دھرم نہاں ہے
کہتا ہے کوئی اس میں عیسٰی کی داستاں ہے
کہتا ہے کوئی اس میں زرتشت کا بیاں ہے

باتیں اگر یہ سچ ہیں شکر خدائے برتر
حسن قبول اُردو نے پالیا ہے گھر گھر

قضیہ اسی زباں میں اظہار اسی زباں میں
بازار اسی زباں میں بیوپار اسی زباں میں
تقریر اسی زباں میں گفتار اسی زباں میں
مذہب اسی زباں میں سنسار اسی زباں میں

ہندوستان میں کہئے اُردو کہاں نہیں ہے؟
اس پر یہ ضد کہ اُردو ہندی زباں نہیں ہے

امیر

نام امیر الاسلام، تخلص امیر، حلقۂ ادب میں 'امیر شرقی'، کے نام سے یاد کیے جاتے ہیں۔ والد کا نام آنریبل خان بہادر معین الاسلام انسپکٹر جنرل رجسٹریشن متحدہ بنگال اور ممبر کانسل آف اسٹیٹ متحدہ ہند۔

امیر شرقی کا سن پیدائش سنہ ۱۹۰۲ء بمقام کلکتہ ہے۔ مدرسہ عالیہ سے میٹرک، ہیسٹنگز ہاؤس اسکول علی پور سینٹ تھیز کیمبریج، پریسیڈنسی کالج سے بی۔ اے اور سنہ ۱۹۲۴ء میں علم ریاضی میں کلکتہ یونیورسٹی سے ایم۔ اے کیا۔ اوّل الذکر تین امتحانات میں امتیازی نمبروں کے ساتھ۔ ۔ ۔ ۔ آنرز کیا اور آخر الذکر ایم اے کا امتحان اوّل درجہ میں پاس کیا۔

بنگالی ان کی آبائی زبان ہونے کے باوجود، اردو، فارسی، عربی

سنسکرت، لاطینی و فرانسیسی زبانوں سے اچھی طرح واقفیت رکھتے ہیں مان کی شاعری کا زیادہ حصہ اُردو کلام پر مشتمل ہے لیکن فارسی، بنگالی، عربی اور انگریزی زبانوں میں بھی خوب خوب طبع آزمائی کی ہے۔ اُردو شاعری میں شرف تلمذ علامہ وحشت کلکتوی سے ہے۔ ناطق لکھنوی مرحوم سے بھی کسب فن کیا۔ ہر صنف سخن میں فکر کرتے ہیں۔ لیکن تاریخ گوئی ان کا محبوب مشغلہ ہے اور اس فن میں قابل رشک حد تک کمال رکھتے ہیں۔ شادی، موت، ملاقات گفتگو، گویا چلتے پھرتے بیٹھتے اُٹھتے ہر موقع ہر لمحہ پر بےساختہ تاریخ کہہ ڈالی۔ ان کے لئے معمولی سی بات ہے لطف یہ کہ مصرعہ یا شعر میں کبھی ناہمواری، ناموزنیت یا ابہام نہیں پایا جاتا ہے، بلکہ جو مصرعہ ہے ڈھلا ہوا جو شعر ہے فنِ تاریخ کا اعلیٰ نمونہ ذیل میں تاریخ گوئی کے چند نمونے ہدیہ قارئین ہیں۔

ا۔ صنعت نہ خانہ طبغراد

۱۹۴۷ء

اوپر سے نیچے یا دائیں سے بائیں یا آڑا یا ترچھا۔ ایک ہی قطار کے تین خانوں کے الفاظ کے اعداد بحساب جمل (ابجد) جوڑیئے تو ۱۹۴۷ء ہونگے جو طلوع پاکستان کا سال ہے

آفتاب مزایزد	رفیق اہلبیت	تحفۂ رب
فتح آسمانی	طلوع پاکستان	رحمت
خواب اقبالؒ	سراجِ دین اسلام	تعبیر جناحؒ

(۲) ذیل کی نعتیہ تاریخیں حضور صلعم کی ولادت، نبوت، معراج شریف ہجرت اور رحلت کی عیسوی تاریخیں ہیں۔ ایک حرف بھی زائد نہیں سلام و درود بھی ہیں۔

نزول عشق ابد اے بر و سلام و درود (ولادت)

۵۷۰ء ۵۷۰ء

جمیع زیب نبوت اطاعت المحمود (نبوت)

۶۱۰ء ۶۱۰ء

فعود منزل معراج ہجرت طٰہٰ (معراج شریف اور ہجرت)

۶۲۱ء ۶۲۲ء

نال و حاصل مقصود، واصل موجود (رحلت)

۶۳۲ء

(۳) قطعہ تاریخ متعلق پیام نو، مولفہ وفا راشدی

راشدی نے جانفشانی سے انھیں یکجا کیا
انقلابی اور قومی خاص نظمیں بے نظیر
مرات حیرت، پیام نو، وفا مشہور خلق
۱۳۶۸ھ ۱۳۶۸ھ
شہری تاریخ ہجری خوب لکھی اے امیر

(۴) تاریخ رحلت قائد اعظم

رود بابائے پاکستان جناح قائد اعظم

۱۹۴۸ء

(۵) تاریخ رحلت اختر شیرانی

گوہر فردوس اختر حق پناہ

۱۳۶۷ھ

۱۹۴۸ء

(۶) تاریخہائے شہادت امام حسینؑ

سلام آقا شہید حسینؑ	نماز عاشورہ	حق شہید کربلا
۶۶۸۰	۶۶۸۰	۶۶۸۰

(۷) تاریخ وصال اکبر الہ آبادی

داد جان ، جانِ ظرافت اکبر

۱۹۵۱ء

(۸) تاریخ شہادت قائد ملت لیاقت علی خاںؒ

کیا شہادت قائد ملت کی ہے

۱۳۷۱ھ

گنج حلم آں قاید ملت لیاقت شد شہید

۱۹۵۱ء

اثیر شرفی کا ذاتی کتب خانہ ہر علم و فن مثلاً موسیقی ، ادب ، تاریخ ، فلسفہ ، فقہ ، شاعری ، وغیرہ کی لاتعداد کتابوں پر مشتمل ہے جو ان کے ذوقِ سلیم اور مذاقِ علم کا آئینہ دار ہے

فن پر مہارت ہے ۔ موسیقی کے متعلق متعدد معلومات افزا و مفید مضامین بنگالی رسائل میں شائع ہو کر خراج تحسین حاصل کر چکے ہیں ، بنگال کے کئی مشہور موسیقی انجمنوں کے سرپرست ، صدر اور سکریٹری رہے اس فن کے کئی رسائل بھی ایڈیٹ کر چکے ہیں ۔

آج کل تاریخ اور عروض و فن شاعری پر ایک کتاب کی تالیف و تحقیق میں معروف ہیں ۔

اختر پروفیسر اختر حسین ۔ اختر ۱۴ نومبر ۱۹۰۱ء بمقام کلکتہ پیدا ہوئے ۔ سنہ ۱۹۰۱ء میں پھر مدرسہ عالیہ کلکتہ کے شعبۂ عربی سے

عربی تعلیم کی تکمیل کی۔ ۱۹۱۸ء میں شعبہ انگریزی سے میٹرک پاس کیا۔ ۱۹۲۶ء میں عربی میں ایم۔ اے اور ۱۹۲۷ء میں بی۔ ایل کے امتحانات پاس کئے۔ حافظ قرآن بھی ہیں۔ پریسیڈنسی کالج ہوگلی کالج، لیڈی برابارن کالج میں لکچرار رہنے کے بعد ۱۹۳۱ء سے اسلامیہ کالج (حالیہ کلکتہ سنٹرل کالج) میں بحیثیت پروفیسر عربی اور فارسی کے انچارج ہیں۔

شاعری میں عبدالرحمن آصف تلمیذ رشید علامہ وحشت کلکتوی کے آگے زانوئے ادب تہہ کیا۔ ۱۹۲۵ء میں حج بیت اللہ سے مشرف ہوئے سفر کے تاثرات، سفرنامہ، کی شکل میں قلم بند کئے جو حلقہ ارباب ذوق میں بےحد پسند کئے گئے۔ ان کی درسی کتابیں جغرافیہ اور تاریخ کلکتہ یونیورسٹی کے نصاب میں شامل ہیں۔

چند اشعار بطور نمونہ کلام پیش ہیں ؎

زیب دیتے ہیں رخِ روشن پہ گیسوئے سیاہ
میں ترے قربان کتنی صبح پرور شام ہے

آخر سما سکی نہ حقیقت مجاز میں
اس کو لباس تنگ نے عریاں بنا دیا

یہ پیکر ضعیف یہ بارِ گرانِ غم
اس پر بھی ناز ہے ہمیں انساں بنا دیا

اصل اصول زیست عبادت سہی مگر
انسانیت ضرور ہے انسان کے لئے

اختر نہ چھوڑ اس صنم حق نما سے ربط
کچھ کفر بھی ضرور ہے ایمان کے لئے

عبدالرحیم

پروفیسر عبدالرحیم شاعر نہیں بلکہ اردو انگریزی کے نہایت سلجھے ہوئے ادیب ہیں۔ عمر کوئی پچاس پچپن سال

کی ہوگی۔

۱۹۱۲ء میں علی گڑھ یونیورسٹی سے عربی میں ۱۹۱۴ء ڈھاکہ یونیورسٹی سے اقتصادیات، میں ایم اے کی سندیں حاصل کیں ۱۹۱۱ء میں علی گڑھ کے ریسرچ اسکولر، اسلامی اقتصادیات بھی رہے۔ ۱۹۱۷ء سے ۱۹۳۰ء تک پریسیڈنسی کالج کلکتہ میں عربی، فارسی، اردو کے لکچرار اور انگریزی کے ممتحن رہے۔

سیاست سے بھی وابستگی رہی۔ مولانا محمد علی جوہر کے ساتھ ۱۹۱۱ء و ۱۹۱۲ء میں بحیثیت اسسٹنٹ ایڈیٹر "کامریڈ" ایڈیٹ کیا۔

دورِ حاضرہ کی اشتراکیت وجمہوریت کی روشنی میں کئی کتابیں لکھیں جن میں "سیرتِ رسول" اور کربلائے معلیٰ یا واقعاتِ کربلا" قابلِ ذکر ہیں۔

شاکر نام طاہر علی تخلص شاکر۔ عمر تقریباً چالیس سال۔ کلکتہ کے جوان فکر شاعر ہیں۔ فن اور زبان پر کافی مہارت ہے۔ کلکتہ میں ماہنامہ شمس، اور بزم شاکری " کے ذریعہ اردو زبان کی جو بے لوث و خاموش خدمت انجام دے رہے ہیں وہ قابلِ تحسین ہے۔ کلکتہ کے بے شمار نوجوانوں نے ان کی رہنمائی سے ذوقِ سلیم پایا۔ اور مذاقِ شاعرانہ سے آراستہ ہوئے۔

غزل ان کا خاص موضوع سخن ہے اس صنف میں خوب خوب کہتے ہیں۔ زبان کی سلاست اور کلام کی فصاحت قابل ستائش ہیں وحشت اسکول سے تعلق رکھتے ہیں۔ غالب اور وحشت کے کلام سے بحد متاثر ہیں یہی وجہ ہے کہ ان کے کلام میں وحشت وغالب کا رنگِ خصوصی غالب ہے۔ اکمل مرحوم سے بھی استفادہ کیا۔ اگر شاکر طبیعت کے قانع نہ ہوتے اور شہرت سے اجتناب نہ کرتے تو بلاشبہ اپنی انفرادی خوبیوں اور قادر الکلامی کے

باعث ملک کے ممتاز الشعراء میں شمار کئے جاتے۔ وحشت کی یہ مختصر رائے شاکر کے لئے آخری سند کا حکم رکھتی ہے کہ۔ شاکر نہایت باکمال شاعر ہیں۔ نمونہ کلام ملاحظہ ہو:۔

دل کی بربادی کا پھر مجھ کو یقین ہونے لگا
پھر ہجومِ شوقِ حسرت آفریں ہونے لگا
اس قدر بھی خود نمائی کی ہوس اچھی نہیں
سنتے ہیں وہ جلوہ گر اب ہر کہیں ہونے لگا
تابکے سنتا رہے آخر کسی کا غم کوئی
مجھ سے آزردہ مرا ہر ہمنشیں ہونے لگا
میرے چہرے پر لکھا ہے جیسے حرفِ آرزو
اس نے دیکھا مجھ کو اور چیں بر جبیں ہونے لگا
اس سے شاکر اب شکایت کا کوئی پہلو نہیں
اس کا ہر انداز اب تو دلنشیں ہونے لگا

اختر نام ایم۔ وائی۔ اختر۔ عمر تقریباً ۳۸ سال۔ تیرہ چودہ سال کی عمر سے انھوں نے شاعری شروع کی۔ یہ غالباً ۱۹۳۶ء کا زمانہ تھا۔ اسلامیہ کالج کے مشاعرے میں دو ایک بار شرکت بھی فرمائی ان کی غزلیں زیادہ تر مدینہ بجنور، نیرنگ خیال، عالمگیر لاہور اور دیگر پرچوں میں شائع ہوئیں۔ غزلوں کے علاوہ انھوں نے نظمیں لکھیں اور افسانے بھی لکھے، ان کے افسانے "ثانی" کے نام سے عالمگیر لاہور اور جدید اردو کلکتہ میں اکثر شائع ہوتے تھے۔ حالات کی الجھنوں کے باعث آج کل بہت دنوں سے خاموش ہیں۔ پیدائش کلکتہ میں ہوئی اور اب تک ہیں ہیں،

مختار نام حافظ نظیر الحق۔ تخلص مختار۔ عمر تہتر سال سن ولادت ۱۲۹۹ھ مقام ولادت حاجی پور ضلع مظفر پور بہار۔ ستر سال کی عمر سے اب تک کلکتہ میں اقامت پذیر ہیں۔ گلستاں، بوستاں، واقعات عالم گیری و بہار دانش اور اردو فارسی کی دیگر درسی کتاب اپنے والد بزرگوار شیخ مولوی جلال الدین مرحوم سے پڑھیں۔

نظم و نثر میں عروض نویسی کے ماہر ہیں۔ افروز جو مشہور فارسی گو شاعر تھے اور شاد عظیم آبادی کے ہمعصروں میں سے تھے، سے فارسی و اردو کلام کی اصلاحیں لیں۔ اب بجائے خود استاد رکھتے ہیں۔ علاقہ خضر پور کلکتہ کے بیشتر تعلیم یافتہ و صاحب ذوق علامہ مختار کے ذوقِ سخن سے استفادہ کر چکے ہیں اور کر رہے ہیں ؎

ایک غزل کے چند اشعار ہدیۂ ناظرین ہیں ؎

آگیا یہ کہاں کا ہوش آتے ہی کوئے یار میں
گرہیں لگا رہا ہوں میں دامن تار تار میں

تجھ کو چمن سے کام کیا آگ لگا بہار میں
کھیل اے جنونِ ہجر یار دو اڑی کو ہار میں

ایک برہنگی مری پہ شمش بہت کی ہو گئی
میری قبا کے تار تار بٹ گئے خار خار میں

ٹانکے شگافِ زخم کے ٹوٹے جو میں نے آہ کی
چارہ گر دیں کیا کروں دل بھی ہو اختیار میں

مختار خوبی صدقے ہے شعر شعر پر
طولِ بیاں ہے مختصر حسن ہوا اختصار میں

اسلم

نام حافظ محمد حنیف ۔ تخلص اسلم ۔ عمر تقریباً ساٹھ سال ۔ شاگرد وحشت ۔ صوم و صلوٰۃ کے پابند ۔ نعتیہ کلام ان کا سرمایہ شاعری ہے ۔ کلکتہ میں پیدا ہوئے ۔ ایک نعت کے چند اشعار سنیئے :-

کیا رکھیں کام لالہ و سرو چمن سے ہم
گلہائے نعمت چنتے ہیں باغ سخن سے ہم

یثرب کی بزم جو ہے وہ ہے بزم جانفزا
غم گیں کبھی بھی آئے نہ اس انجمن سے ہم

ذکر نبی ؐ بجائے انا الحق زباں پہ ہے
پابوس ہیں خسانۂ دارو رسن سے ہم

زنار میرے ہاتھ میں تسبیح بن گیا
اب کیا تقاضا اور کریں برہمن سے ہم

روح الامیں بھی مست ہیں جن کی شمیم سے
لاتے ہیں ایسے پھول عرب کے چمن سے ہم

مست و انجم

غلام محمد مست بڑے کہنہ مشق شاعر تھے ۔ غالباً ساٹھ سال کی عمر میں آج سے آٹھ دس سال قبل انتقال فرمایا ۔ مست کی طرح غلام رسول انجم بھی ایک کہنہ مشق شاعر تھے اور کثیر التلامذہ ۔ آرزو لکھنوی کے شاگرد تھے ۔ انھوں نے کوئی پچاس سال کی عمر میں ۱۹۴۹ء میں رحلت فرمائی ۔

مست اور انجم اب ہم میں نہیں رہے لیکن انھوں نے اُردو زباں کی جو بے لوث خدمت کی ہے وہ فراموش نہیں کی جا سکتیں ان کے گیت ، غزل اور قوالی نہ صرف ریکارڈنگ کے لئے مقبول خاص

وعام بھی بلکہ عام محلبیں اور محفلوں میں بھی ان کا کلام بڑے دلچسپ فریب انداز میں پڑھا اور سنا جاتا رہا ہے۔ ان کے اشعار آج بھی بنگال کی گلیوں میں اکثر جوان اور بچے گاتے اور گنگناتے نظر آتے ہیں۔ ہندوستان کے مشہور ترین قوال پیارے اور کالو، کلکتہ والے نے مست وانجم کے کلام کی بدولت ہندوستان گیر شہرت حاصل کی۔ کلام مست ؎

او خوشی کے دیکھنے والے یہ غم بھی دیکھنا
مٹیں گے اک دن الفت میں ہم بھی دیکھنا

او کتاب دلربائی پڑھنے والے رات دن
ہے کہیں اس میں لکھا لفظ کرم بھی دیکھنا

مست وہ جاتے ہیں منہ پھیر کر جانے بھی دو
زندگی سے یونہی منہ پھیریں گے ہم بھی دیکھنا

قوالی

پری جمال، پری وش، پری ادا، ساقی
ترے حجاب کے صدقے نقاب اٹھا ساقی

جلائے دیتی ہے مستی بھری ادا ساقی
کرم، کرم کہ پھنسا مست مبتلا ساقی

مے سے آتی ہے خوشبو گلاب کی ساقیا بھر دے بوتل شراب کی

کلام انجم :-
ہندی غزل کے دو شعر پیش کئے جاتے ہیں۔

نیرب کے دولھا سے لاگی لگنوا جا سے اجیارا ہے چودہ بھنوا
تن کے بھبوت میں نے جوگ رما ئی بھول گئی تن تن کی جتنوا

عادلؔ خواجہ محمد عادل جہانگیر نگری ڈھاکہ کے نواب خاندان کے چشم و چراغ ہیں۔ خواجہ ناظم الدین سابق گورنر جنرل پاکستان اور نواب آف ڈھاکہ خواجہ حبیب اللہ خاں کے برادر عزیز ہیں۔ ڈھاکہ ان کا وطن و مسکن ہے۔ وہاں کے شعراء میں ممتاز حیثیت رکھتے ہیں۔ عمر تقریباً پچاس سال ہوگی۔

ایک غزل کے چند اشعار آپ کی ضیافت طبع کے لیے پیش ہیں ؎

خوں گشتہ ہیں دل اور جگر، کچھ نہ پوچھئے
کس کی نگاہ کا ہے اثر کچھ نہ پوچھئے

بیگانہ وار گذرے وہ، یہ بھی فریب تھا
پوشیدہ التفات نظر، کچھ نہ پوچھئے

سب کی نظر بچا کے وہ چشم حیا پرست
ایک بار اٹھ گئی جو ادھر کچھ نہ پوچھئے

عادل نے ایک بار نہیں بلکہ بار بار
کھایا ہے کیا فریب نظر کچھ نہ پوچھئے

احمدؔ محی الدین محمود نام احمد تخلص، مشرقی پاکستان کے سب سے بڑے اردو شاعر خالد بنگال کے عزیز قریب اور تلمیذ رشید ہیں۔ ولادت بولائی نامی ایک گاؤں جو ضلع میمن سنگھ مشرقی پاکستان میں ہے، ہوئی۔ اردو فارسی اور عربی کی تعلیم مولانا عبدالعزیز مرحوم اعظم گڈھی سے اپنے گاؤں میں حاصل کی۔

محمود بنگالی متخلص بہ احمد ایک ایسے گاؤں کے رہنے والے ہیں جہاں کے سو فی صدی باشندے بنگلہ بولتے ہیں اور اردو سے کسی کو دور کا بھی واسطہ نہیں لیکن ایسے ماحول میں ایک احمد کی اردو زبان اور شعر و ادب سے اتنی گہری دلچسپی معجزہ نہیں تو اور کیا ہے۔ احمد کے کلام میں وہ سب خوبیاں بدرجۂ اتم موجود ہیں۔

جو ایک باکمال شاعر میں ہونی چاہئیں۔ ان کا ایک دیوان مکمل ہے جو منتظر اشاعت ہے۔ ایک نظم "تاج محل" کے چند بند ملاحظہ فرمایئے ؎

اے تاج اے سیماب تن اے گوہر انجم وقار
ہے گنبد گردوں ترے گنبد کے آگے شرمسار
صدقہ ہیں تیرے مہر و مہ ہے چاندنی تجھ پر نثار
ہیں بوسۂ پا کیلئے جمنا کی موجیں بے قرار

ہیں زینتِ محراب زر نقش حسیں تحریر کے
ہوں مصحفِ رخسار پر جس طرح خط کے حاشیے
یہ پھول ہیں حرفوں کے یا رنگین جواہر ہیں جڑے
یا چشمۂ کافور میں کالے حبب لہراتے ہوئے

جمنا تری تنویر سے کوسوں فلک پر نور ہے
گویا لب ساحل کوئی روشن چراغِ طور ہے
یا گھاٹ پر اشنان کو آئی ہوئی اک حور ہے
سبزہ پہ رکھا ہوا اک ساغر بلور ہے

محفوظ الحق

خاں بہادر پروفیسر محمد محفوظ الحق ایم۔ اے کی تاریخ پیدائش ۷؍جنوری ۱۹۰۰ء بمقام سداللہ پور ضلع پٹنہ صوبہ بہار اور تاریخ وفات ۱۰؍جون ۱۹۴۶ء بمقام کلکتہ ہے ۱۹۱۶ء میں مدرسہ عالیہ کلکتہ سے میٹرک ۲۰ء میں پریسیڈنسی کالج سے بی اے ۲۲ء میں فارسی میں

کلکتہ یونیورسٹی سے ایم ۔ اے کے امتحانات پاس کئے ۔ ایم اے درجہ اول میں کیا ۔ ۱۹۲۳ء میں رپن کالج اور اس کے بعد پریسیڈنسی کالج میں فارسی کے پروفیسر رہے ۔ کلکتہ یونیورسٹی کے شعبہ جات عربی ، فارسی ، اسلامی تاریخ وتمدن سے بھی وابستہ رہے ۔

پروفیسر محفوظ الحق فارسی زبان وادب کے جید عالم تھے ۔ انھوں نے سب سے پہلے شہزادہ داراشکوہ کی مشہور فارسی تصنیف "مجمع البحارین" کو جدید وآسان فارسی میں انگریزی ترجمہ کے ساتھ پیش کیا ۔ اس کتاب میں ہندوستان کے دو بڑے ہندو مسلم مذاہب کا عجیب دل کش انداز میں موازنہ ہے ۔ اس کتاب کا تعارف ۱۹۲۹ء میں انگریزی کے مشہور جریدہ BIBLOTHECA INDICA SERIES میں شائع ہوا تھا ۔ شہنشاہ بابر کے فرزند ارجمند مرزا کامران کے فارسی دیوان کو اُردو لباس سے آراستہ کیا ۔ اس میں ان کا ایک قابل قدر مقدمہ بھی شامل ہے ۔ یہ کتاب شبلی اکیڈیمی اعظم گڑھ کے زیر اہتمام زیور اشاعت سے آراستہ ہو کر منظر عام پر آئی تھی ۔ اس مقدمہ کا خلاصہ انگریزی زبان میں بھی اشاعت پذیر ہوا اس کی وجہ مقدمہ کی مقبولیت تھی ۔

مسٹر ایچ اے ۔ ہارلے (MR: H. A. HARLEY) پرنسپل اسلامیہ کالج کلکتہ اور پروفیسر عبد المقتدر کی باہمی مدد سے امین احمد رضی کی تاریخی وجغرافیائی انسکلوپیڈیا کی پہلی جلد کو انگریزی زبان میں منتقل کیا جو "ہفت قلم" یعنی (THE SEVEN CLIMES) کے نام سے انگریزی صحیفہ (BIBLIOTHECA INDICA SERIES) میں ۱۹۳۹ء میں چھپی ۔

رُباعیات عمر خیام، کا نہایت دلکش ترجمہ کیا جو سنہ ۱۹۴۰ء میں اشاعت پذیر ہوا۔

متعدد کتابوں کی تالیف و تصنیف کے علاوہ محفوظ الحق کی زندگی ہمیشہ اُردو فارسی و عربی ادبیات کی تحقیقات کے لئے وقف رہی۔ ان کے علمی و تحقیق و تنقیدی مضامین انگریزی و اُردو کے اکثر و بیشتر رسائل و جرائد میں چھپ کر ارباب علم و ادب سے خراج تحسین حاصل کرتے رہے۔ نصیر الدین ہاشمی نے دکن میں اُردو کی تالیف میں محفوظ الحق سے بھی مدد لی تھی۔

۱۹۲۷ء میں رائل ایشیاٹک سوسائٹی بنگال کی رکنیت کے علاوہ سنہ ۱۹۳۶ء سے سنہ ۱۹۳۹ء تک لائبریرین سکریٹری کے عہدے پر فائز رہے سنہ ۱۹۴۰ء سے سنہ ۱۹۴۲ء تک اس سوسائٹی کے JOINT PIHLOLGICAL SECY جوائنٹ فیلولوجیکل سکریٹری اور فیلو بھی رہے۔ کلکتہ کے مشہور انگریزی ادبی رسالہ BENGAL PAST & PRESENT کے ایڈیٹر مسلم انسٹی ٹیوٹ کے سکریٹری اور سنہ ۱۹۴۷ء سے سنہ ۱۹۴۸ء تک ایران سوسائٹی کے ممبر بھی رہے۔

محفوظ الحق کا شمار کلکتہ کی ان چند اہل علم و عظیم المرتبت ہستیوں میں ہوتا ہے جن پر نہ صرف فارسی ادب بلکہ اہل بنگال کو بھی بجا طور پر ناز ہے۔ ان کی فارسی دانی اور مذاق علم و ادب عدیم المثال و قابل ستائش ہیں ؎

زندۂ جاوید ماند ہر کہ نکو نام زیست

کز عقبش ذکر خیر زندہ کند نام را

فہمی ابو الکلام سلیم اللہ فہمی اُردو زبان کے مشہور انشار پرداز اور شاعر ہیں۔ عمر تقریباً پچاس سال۔ کلکتہ کے رہنے والے ہیں۔ اپنی

ایک کتاب "مشرقی" کے دیباچہ میں رقم طراز ہیں

پیدائش تعلیم و تربیت، روایات اور تشکیل مذاق کے اعتبار سے اس کتاب کا مصنف قطعی طور پر بنگالی ہے اور بنگال ہی کو اپنا وطن جانتا ہے اس لئے کہ اس کا خاندان تین پشتوں سے اسی دنیا میں آباد ہے۔"

فہمی نے کلکتہ یونیورسٹی سے درجہ اول میں ایم۔ اے (فارسی میں) کرنے کے بعد بنگال سول سروس کا امتحان امتیازی حیثیت سے پاس کیا۔ متحدہ بنگال میں محکمہ تعلیمات کے اسسٹنٹ سکریٹری، مشرقی بنگال میں سلیف گورنمنٹ کے سکریٹری، ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ و کلکٹر مکھنا، رجسٹرار کواپریٹو سوسائٹی مشرقی بنگال کے عہدوں پر فائز رہے اور اب ڈائرکٹر آف ڈیولپمنٹ اینڈ رورل اکسٹینشن ایسٹ پاک

DIRECTOR OF DEVELOPEMENT AND

RURAL EXTENTION EAST PAKISTAN.

کے منصب جلیلہ پر فائز ہیں۔ کئی بار لندن، سوئٹزرلینڈ، ایران اور دیگر ممالک کی سیر و سیاحت بھی کر چکے ہیں۔

مجسمہ اخلاص و مروت اور مرنجان مرنج انسان ہیں ساری زندگی زبان و ادب کی خاموش دبے لوث خدمت میں گذری۔ انگریزی، فارسی، عربی، اردو اور بنگالی ادبیات کا نہایت گہرا مطالعہ کیا ہے۔ بنگالی زبان سے بے شمار شہ پارے اردو ادب میں منتقل کئے۔ بنگالی ادیب کی حیثیت سے بھی ان کا تذکرہ بنگالی زبان کے مقالات میں اکثر آتا ہے۔ بنگالی ادب کے ممتاز و مشہور انشاء پرداز محبوب العالم کی مقبول کتاب "سنکاٹ" کیلئے جا چکے ہیں ان کا تذکرہ ملتا ہے۔ اس وقت بنگال میں تین اچھے مترجم ہیں، سلیم اللہ فہمی۔ احسن احمد اشک۔ اور محمد یونس احمر، جن کو

بنگالی زبان سے براہ راست اُردو میں منتقل کرنے کی استعداد کامل حاصل ہے۔ اور اس لحاظ سے انھیں بنگال میں اُردو کی نمائندگی کا حق حاصل ہے۔ ڈھاکہ ریڈیو سے ان کی اُردو، بنگالی اور فارسی، ادبیات سے متعلق اکثر تقاریر نشر ہوتی ہیں۔

فارسی زبان سے بھی ان کا خاص تعلق رہا ہے۔ اپنے والد مرحوم سے اکثر فارسی میں گفتگو فرماتے اور اسی زبان میں ان سے خط و کتابت کرتے۔ ۱۹۲۴ء میں انھوں نے فارسی میں ایک روزنامچہ تحریر فرمایا تھا جو ان کی فارسی دانی کا بین ثبوت ہے اس کا قلمی نسخہ ان کے ذاتی کتب خانہ میں موجود ہے ان کا ذاتی کتب خانہ بنگلہ، عربی، فارسی، اُردو، انگریزی، علوم و فنون کی تقریباً پانچ ہزار کتابوں پر مشتمل ہے جو ان کے علمی و ادبی ذوق و شوق کا مظہر ہے کتب خانہ سنہ ۱۹۲۷ء میں اپنے والد مرحوم مولانا محمد فہیم اللہ کی یادگار میں قائم کیا تھا۔

فہمی کی ایک تصنیف مشرق کے نام سے سنہ ۱۹۵۲ء میں شائع ہو چکی ہے یہ کتاب دراصل بارہ ریڈیائی تقریروں کا مجموعہ ہے جو ڈھاکہ ریڈیو اسٹیشن سے نشر کی جا چکی ہیں۔ ہر تقریر مشرقی بنگال کی تاریخی، جغرافیائی، تمدنی، ثقافتی اخلاقی اور ادبی زندگی کے کسی نہ کسی پہلو کی آئینہ دار ہے اور اس لحاظ سے یہ کتاب قابل قدر ہے۔

شاعری میں حضرت وحشت کے دامنِ فیض سے وابستہ رہے ہے چند اشعار سنیے۔

آب اس کی آبِ کوثر سے لذیذ — قند ہے کب اس کے خنجر سے لذیذ
دستِ وحشت میں اسی کا لطف ہے — کچھ نہیں ہے اس میں پتھر سے لذیذ
رات دن کھاتا ہوں جی بھرتا نہیں — کچھ نہیں غم ہائے دلبر سے لذیذ

ملک کی ہر چیز اچھی ہے سلیم　　اس کے فاقے بھی مزعفر سے لذیذ

آرزو

آرزو سہارنپوری کلکتہ میں پیدا ہوئے۔ عمر کوئی ۵۲ - ۵۵ سال ہوگی۔ ان کا ایک مجموعۂ کلام "الہام سحر" کے نام سے شائع ہو چکا ہے۔ بقول رضا علی وحشتؔ آپ کے جذبات ایک دلگداز طریقہ سے شعر کی شکل اختیار کرتے ہیں۔"

عشق کی ہر نوا مطلوب　　حُسن کی، مجھ سے ہر ادا منسوب
ویدنی ہے قلندری میری　　کبھی سالک ہوں اور کبھی مجذوب
عشق کا ایک پرتو سادہ　　جوہر حسن جلوۂ محبوب
ان کی ندرت پسندیاں توبہ　　کبھی طالب ہیں اور کبھی مطلوب

مذکورہ بالا قواعد کے علاوہ قربان علی عصری (تلمیذ وحشت) حکیم مولانا عبدالرحمٰن بیخودؔ۔ ایم۔ اے خاں بہادر مرزا جعفر علی کشفیؔ ایم اے اسحٰقؔ امرتسری اصغر علی غافل (تلمیذ اکمل مرحوم حال مقیم مشرقی بنگال)، ڈاکٹر آفتاب احمد شریف چکوال قابل ذکر ہیں

چوتھا دور

تیسرا گروپ

ہوش گذشتہ بیس سال سے اب تک کلکتہ کے جن جواں سال فن کاروں نے اردو زبان و ادب کی بے لوث اور غیر معمولی خدمت انجام دی ہے۔ ان میں ابراہیم ہوش سب سے اول قابل ذکر ہیں ہوش کے وجد آفریں نغمے نہ صرف ہر بزم ادب اور محفل سخن میں گونجتے رہے ہیں بلکہ ان کی تخلیقاتِ نظم و نثر کلکتہ کے ہر اخبار و رسالے میں خصوصاً اور ہند و پاک کے جرائد میں عموماً چھپتے رہے ہیں۔ ہوش کی پر

خلوص جدید انداز تحریر نے جو کلکتہ کے نوجوان اہل قلم کے لئے ایک نئی راہ نکالی ہے اکثر نوجوان آپ کی رہنمائی میں جادۂ علم و ادب پر گامزن ہیں۔

ہوش کا اصل نام محمد ابراہیم تخلص ہوش، اور ادبی نام ابراہیم ہوش ہے مقام ولادت کلکتہ ہے اور آج تک وہیں کی فضا میں مسرور و شاداں ہیں۔ مدرسہ عالیہ اور اسلامیہ کالج میں تعلیم کی منزلیں طے کیں۔

شاعری میں آنند لکھنوی سے کسب فن کیا۔ وحشت کے دامن فیض سے بھی وابستہ رہے۔

ابراہیم ہوش۔ شاعر، ادیب، افسانہ نگار، ڈرامہ نویس، سیاست داں، صحافی، دوست نواز اور اس کے علاوہ بہت کچھ ہیں۔ لیکن اخبار نویسی ان کا محبوب مشغلہ ہے جو "تو من شدی و من تو شدم" کا مصداق ہے۔

متعدد اخبارات و رسائل روزنامہ۔ اقبال بمبئی۔ ہفت روزہ نظام بمبئی وغیرہ کے چیف ایڈیٹر رہے۔ روزنامہ عصر جدید و ہند، آزاد ہند کلکتہ کی ادارت سے بھی وابستہ رہے۔ فی الحال روزنامہ آبشار کلکتہ کے ایڈیٹر ہیں۔

ان کی طبیعت کی بے نیازی و لاپرواہی کا یہ عالم ہے کہ جو کچھ لکھتے ہیں اپنے پاس محفوظ نہیں رکھتے۔ ان کے صرف وہی مضامین نظم و نثر محفوظ ہیں جو اخبارات و رسائل کی آغوش میں پناہ لے چکے ہیں ۱۹۴۶ء میں انھوں نے شعرائے بنگال کا تذکرہ مسلسل نظم میں لکھا تھا۔ ۱۹۵۲ء میں جب میں نے کلکتہ میں (روزنامہ آزاد ہند کے دفتر میں) اس نظم کے متعلق ان سے دریافت کیا تو انھوں نے ہنس کر جواب دیا کہ وہ ضائع ہو گئی۔ یہ نظم ان کا ایک قابل قدر کارنامہ تھی اور اس کے ضائع ہونے کا افسوس انھیں مگر مجھے ضرور ہے

ابراہیم ہوش کی ہر دلعزیزی و شہرت کا ایک سبب یہ بھی ہے کہ وہ اخبارات

ہند و عصر جدید کے کالم میں "نالہ پابند نَے نہیں ہے۔" کے عنوان سے نکاہات کے علاوہ "کلکتہ اردو" کے زیرِ سرخی بڑی مزیدار چیزیں لکھا کرتے تھے۔ اس میں کلکتہ کے عوام کی بول چال اور غیر تعلیم یافتہ طبقے کے ماحول کا صحیح نقشہ ہوتا تھا جو ٹھیٹ بنگلہ، گلابی اُردو اور ایک خاص زبان کا خوبصورت MIXTURE ہوتا تھا۔ جیسے ہر پڑھنے والا شیریں گھونٹ سمجھ کر پی جاتا تھا یہ سلسلہ بیحد دلچسپ اور دلآویز تھا۔ اس سے نہ صرف عوام کو اپنی غلط بولی کی اصلاح کا موقعہ ملتا تھا بلکہ ان میں اُردو پڑھنے لکھنے کا شوق دن دونی رات چوگنی ترقی کرتا تھا۔

اب ہوش کی ایک غزل کے تین اشعار سنیئے:۔

تو اپنے جلوہ ہائے خاص کو کیوں عام کرتا ہے
یہ ارزانی مرے دل کو گراں معلوم ہوتی ہے

نہیں محفل میں کوئی محرم سوزِ دروں میرا
مگر اک شمع میری رازداں معلوم ہوتی ہے

فغاں کو ہوش میں نے کر دیا تھا نذرِ خاموشی
خموشی بھی مری ان کو فغاں معلوم ہوتی ہے

احمر محمد یونس نام۔ تخلص احمرؔ۔ وطن کلکتہ۔ عمر تیس بتیس سال ۱۹۴۹ء میں اردو میں کلکتہ یونیورسٹی سے ایم۔ اے کیا۔ پہلے آل انڈیا ریڈیو کلکتہ سے منسلک تھے ۱۹۴۹ء میں ایم لے کے بعد ڈھاکہ ریڈیو میں ملازمت کرلی۔ ۱۹۵۲ء میں ان کا تبادلہ ریڈیو پاکستان کراچی ہوگیا۔ کراچی کی آب وہوا راس نہ آئی اور ۵۳ء میں ڈھاکہ واپس چلے گئے۔ اب وہیں مقیم ہیں

کلکتہ میں سب سے زیادہ لکھنے والوں میں ابراہیم ہوش کے بعد یونس احمر کا

کا نام آتا ہے۔ ان کی نظمیں، افسانے، علمی و ادبی مضامین اور ترجمے نہ صرف بنگال کے اخبارات و رسائل بلکہ پاک و ہند کے متعدد جرائد میں بھی اکثر چھپتے رہتے ہیں۔ خاص کر ترقی پسند حلقے میں بہت مشہور ہیں۔ احمر کے طبعزاد افسانے اور مضامین ان کی انفرادی خصوصیات کے حامل ہیں۔ لیکن وہ اپنے حسن افکار جمیل و بلندیٔ تخیل کے باعث ممتاز درجہ رکھتے ہیں وہ بنگال کے آتش فشاں شاعر قاضی نذر الاسلام کی رفاقت، اور گہرا مطالعہ ہے۔ نذر الاسلام کی بعض نظموں کا کامیاب ترجمہ جعفر علی خاں آثر لکھنوی نے بھی کیا ہے اور پروفیسر اختر حسین رائے پوری نے بھی۔ لیکن قاضی نذر الاسلام کو اصل روپ اور اصل حالت میں دنیائے اردو سے روشناس کرانے کا سہرا یونس احمر کے سر ہے احمر نے بجز معدودے چند کے نذر الاسلام کی بعض کتابوں کو اردو زبان میں منتقل کر دیا ہے جن میں "زہریلی بانسری" اور "طغیان" قابل ذکر ہیں جو اردو ادب کی گرانقدر سرمایہ ہیں۔ ترجمہ کے علاوہ احمر نے نذر الاسلام کی شاعرانہ عظمت اور ادبی شخصیت کے مختلف پہلوؤں پر مقالے لکھے جو "ماہ نو"، ادب، افکار، نقوش، جدید اردو وغیرہ میں چھپے۔ احمر نے نذر الاسلام کی تخلیقات کو اردو دنیا میں پیش کر کے نہ صرف بنگلہ ادب بلکہ اردو ادب پر بھی بہت بڑا احسان کیا ہے۔

احمر کے طبعزاد افسانوں کا ایک مجموعہ "سنگریزے" کے نام سے منظر عام پر آچکا ہے۔ افسانے اکثر بیسویں صدی دہلی میں بھی شائع ہوتے رہتے ہیں۔ تقسیم بنگال کے قبل انھوں نے ایک دو ماہی رسالہ "نئے دھارے" کے نام سے سویرا لاہور کے طرز پر جاری کیا تھا۔ یہ رسالہ کلکتہ کے بہترین لکھنے والوں کے رشحات قلم سے مزین ہوتا۔ افسوس ہے کہ وہ صرف تین اشاعت نکال سکے۔

اشک پروفیسر احسن احمد اشک کا سال پیدائش جنوری ۱۹۱۸ء بمقام کلکتہ ہے۔ پروفیسر مولوی عبدالمقتدر[1] مرحوم جن کا شمار ہندوستان کے مشہور مستشرقین میں ہے ان کے والد ماجد تھے۔

احسن احمد اشک نے ۱۹۳۲ء میں مدرسہ عالیہ سے میٹرک ۱۹۳۸ء اسلامیہ کالج سے بی۔ اے (آنرز کے ساتھ) ۱۹۴۰ء اور ۱۹۴۲ء میں کلکتہ یونیورسٹی میں اوّل رہے ۱۹۴۳ء میں اسلامیہ کالج کلکتہ کے عہدہ معلمی پر مامور ہوئے تقسیم بنگال کے بعد سے اب تک ڈھاکہ انٹرمیڈیٹ کالج میں شعبہ جات اردو و فارسی کے پروفیسر ہیں۔

اسلامیہ کالج کے ایام طالب علمی میں رضا علی وحشت کی شاگردی کا شرف حاصل تھا۔ لیکن شاعری میں باقاعدہ اکتساب فن علامہ جمیل مظہری سے کیا۔

احسن احمد اشک کئی سال تک ماہنامہ جدید اردو کلکتہ کے ایڈیٹر بھی رہے اور اب بزم احباب ڈھاکہ کے سکریٹری ہیں۔

احسن احمد کی تحریر نہایت شگفتہ اور دلکش ہوتی ہے۔ نذرالاسلام کی آتش نشانیوں، اقبال کی فلسفیت اور جمیل مظہری کی اخلاقیات سے بیحد متاثر ہیں قاضی نذرالاسلام کی نظم و نثر کا ترجمہ نہایت دلنشیں و شگفتگی سے کر رہے ہیں جو ماہنامہ دلربا، ڈھاکہ میں برابر چھپ رہا ہے۔ نذرالاسلام کے متعلق ان کی ایک کتاب مشرق کوآپریٹو پبلیکیشنز۔ ڈھاکہ کے تحت زیر طبع ہے۔ ایک مجموعہ کلام برق و باراں شائع ہو چکا ہے۔

---

[1] عبدالمقتدر کا تذکرہ "پہلا گروپ" میں کیا جا چکا ہے

افسر نام ظہیر عالم صدیقی، قلمی نام افسر ماہ پوری۔ تخلص افسر۔ سن پیدائش ۱۹۱۹ء بمقام موضع ماہ پور، ضلع سارن (بہار) ۱۹۳۸ء میں کلکتہ یونیورسٹی سے پرائیویٹ امیدوار کی حیثیت سے میٹریکولیشن کا امتحان درجۂ اول میں پاس کیا ۱۹۳۹ء میں ہوم (ریکارڈس) ڈیپارٹمنٹ حکومت متحدہ بنگال کلکتہ میں ملازم ہوئے۔ دو سال برہم پور مرشد آباد میں رہے تقسیم بنگال سے ایک ڈھاکہ میں قیام پذیر ہیں۔

مشرقی پاکستان میں جتنے جواں سال شعراء تقسیم کے بعد سے سکونت پذیر ہیں ان میں افسر ماہ پوری کا درجہ نہایت ممتاز ہے وہ ایک خوش فکر ادیب بھی ہیں۔ ان کی ادبی زندگی کا آغاز ۱۹۳۶ء میں ہوتا ہے۔ شروع میں ایک عرصہ تک افسانے لکھتے رہے جو متحدہ ہندوستان کے اکثر رسالوں میں اشاعت پذیر ہونے ۱۹۴۵ء میں تقریباً ایک نظم لکھی جو بیحد پسند کی گئی ڈھاکہ میں پہلی مرتبہ غزل کہی اور مشاعرے میں شرکت کی۔ نظم و نثر پر یکساں قدرت رکھتے ہیں۔ متعدد مقالات ریڈیو پاکستان ڈھاکہ سے بھی نشر ہو چکے ہیں۔ افسر ماہ پوری کا شمار ہند و پاک کے ان جواں سال فنکاروں میں ہے جو بہت کم لکھتے ہیں مگر بہت عمدہ لکھنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔

دائرۂ ادب[۱] ڈھاکہ جو ۱۹۴۸ء میں مشرقی پاکستان میں اردو زبان کی ترقی و ترویج کی غرض سے عالم وجود میں آیا، اس کے بانی اور پہلے سکریٹری ہیں۔

بخوف طوالت حرف چند اشعار بطور نمونۂ کلام پیش خدمت ہیں ۔

---

[۱] راقم الحروف کو بھی اس کے بانی ہونے کا شرف حاصل ہے۔

عجیب چیز محبت کی واردات بھی ہے
حدیثِ دل بھی ہے روداد کائنات بھی ہے

اِدھر بھی اُٹھتی ہے اربابِ انجمن کی نظر
کچھ آپ ہی نہیں محفل میں، میری ذات بھی ہے

گزاری ہے انھیں طغیانیوں میں زندگی اپنی
ہمیں معلوم ہے لطفِ خدا و ناخدا کیا ہے

بدلنا ہی پڑے گا اب نظامِ میکدہ ساقی
ہزاروں رند ہیں وہ ایک پیمانے سے کیا ہوگا

بجا ہے دیر و حرم کا بھی احترام مگر
خیال عظمتِ انساں نہیں تو کچھ بھی نہیں

ساحل پہ اور تیزی سے کشتی پہنچ گئی
اس رنگ سے بھی گذرا ہے طوفاں کبھی کبھی

کلیم اللہ

ابوالفضل کلیم اللہ زندگی کے بتیسواں سال پر گامزن ہیں وطن کلکتہ۔ سنہ ۱۹۴۲ء میں انھوں نے کلکتہ یونیورسٹی سے اسلامی ہسٹری اور کلچر میں ایم۔ اے کیا۔ اس کے بعد بی بی سی لندن چلے گئے۔ انگریزی لٹریچر سے انھیں کافی شغف ہے مضمون نگاری کا ذوق ورثے میں ملا ہے مشہور ادیب و شاعر ابوالمکارم سلیم اللہ فہمی کے چھوٹے بھائی ہیں۔

کلیم اللہ کے افسانے و مضامین اکثر و بیشتر ماہنامہ جدید اُردو، کلکتہ، خاور ڈھاکہ اور دلربا ڈھاکہ میں شائع ہوتے رہے ہیں۔ فی الحال ریڈیو پاکستان ڈھاکہ میں اسسٹنٹ اسٹیشن ڈائرکٹر کے عہدے پر فائز ہیں

نظیر

نام سید نظیر حسین ۔ قلمی نام نظیر جمیلی ۔ سن پیدائش ۱۹۱۴ء وطن بھکن پور ضلع مظفر پور (بہار) ہے بچپن سے تقسیم ہند تک برابر کلکتہ ہیں رہے ۔ کلکتہ یونیورسٹی سے ۱۹۴۳ء میں فارسی میں ایم، اے کیا۔ علامہ جمیل مظہری کے خالہ زاد بھائی ہیں ۔ ان کا شاعرانہ ذوق اور علمی مذاق جمیل کی صحبتوں اور محنتوں کا مرہون منت ہے ۔ مشورۂ سخن بھی جمیل سے کرتے ہیں ۔ بیدار مغز شاعر ہیں ۔ زیادہ تر غزلیں کہتے ہیں ۔ نظم و نثر پر یادی قدرت ہے ۔ ان کے متعدد مضامین ماہنامہ نگار میں شائع ہوکر خراج تحسین حاصل کر چکے ہیں ۔ ان کے افسانے کا ایک مجموعہ "گوہر" نگار بکڈپو لکھنؤ کے تحت زیور اشاعت سے آراستہ ہوکر منظر عام پر آچکا ہے ۔ فی الحال فرسٹ سکریٹری انڈین امبیسی طہران ہیں ۔

نظیر جمیلی کے صرف تین اشعار ملاحظہ ہوں ؂

کیسی ہوا چلی تھی سب کچھ جھلس گئی ہے
رنگینیٔ تمنا ، رعنائیٔ جوانی
جو کچھ نہ لٹ چکا ہے جو کچھ ہے لٹ رہیگا
سرمایۂ محبت ، سامانِ زندگانی
یہ زندگی کی لعنت کچھ کم نہ تھی کہ اس پر
بخشا گیا ہے ہم کو "احساسِ زندگانی"

نجمی

حسن نجمی ہے کا وطن سکندر پور ضلع بلیا، یوپی اور تاریخ پیدائش یکم نومبر ۱۹۱۴ء ہے اردو فارسی انگریزی اور ہندی زبانوں سے اچھی طرح واقف ہیں۔ پندرہ سال سے مدنا پور (مغربی بنگال) میں قیام ہے

اور ادبی زندگی یہیں پروان چڑھی۔ ۱۹۳۸ء سے مختصر افسانے لکھتے ہیں جو ملک کے مختلف رسائل میں چھپ چکے ہیں اور چھپتے رہتے ہیں ۱۹۴۲ء سے شعر کہتے ہیں۔ باقاعدہ کسی کے شاگرد نہیں۔ لیکن اکثر پروفیسر پرویز شاہدی اور شریف حکوانی کو اپنا کلام دکھالیا کرتے ہیں۔ نثر نگاری میں ابراہیم ہوش سے مدد لیتے رہے۔ آپ کے افسانے انسانی زندگی کی سچی تصویر اور نظمیں حیات وجذبات کی حامل ہوتی ہیں۔ بطور نمونہ از خروارے ایک غزل ہدیہ قارئین ہے ؎

دوست مستقبل کا روئے ضو فشاں دیکھا کیے
اور ہم چپ چاپ ماضی کے نشاں دیکھا کیے

ہم تن آسانی کے خوگر ڈھونڈتے منزل کہاں
دور ہی سے گردِ راہِ کارواں دیکھا کیے

عقل نے پیراہنِ ہستی کے ٹکڑے کر دیئے
اور ہم دستِ جنوں میں دھجیاں دیکھا کیے

کون ڈوبا کون ابھرا ہم کو اس کا کیا پتہ
ہم تو رقصِ موجِ بحرِ بیکراں دیکھا کیے

اپنی رودادِ محبت گو بہت دلچسپ تھی
پھر بھی ہم سمجھی، حدیثِ دیگراں دیکھا کیے

ذاکر عبداللہ نام تخلص ذاکر۔ عمر تقریباً چالیس سال۔ کلکتہ میں پیدا ہوئے اور آج تک وہیں مسکن گزیں ہیں۔ میٹرک پاس ہیں۔ بچپن سے شعر کہتے ہیں۔ علامہ عبدالرحمٰن آصف کے تلمیذ رشید ہیں۔ فن وعرض

پر کامل قدرت ہے زبان نہایت شستہ و سلیس ہے۔ کلکتہ کے بے شمار طالب علم آپ کے فیض علم و ادب سے مستفید ہوتے رہے ہیں۔ مگر کبھی استادی و شاگردی کے قائل نہیں ہوئے ؎

نگہ یار نشیلی بھی ہے ہشیار بھی ہے
برق انداز بھی ہے نرگسِ بیمار بھی ہے
آنکھوں سے قتل کرے ہونٹوں سے زندہ کرے
وہ مسیحا بھی ہے اور قاتلِ خونخوار بھی ہے
منزلِ عشق کچھ آساں نہیں ہے اے ذاکر
راہ دشوار بھی ہے وادیٔ پرخار بھی ہے

عطا

عطا الرحمن نام۔ تخلص عطا۔ دنیائے شاعری میں "عطا آصفی" مشہور ہیں۔ عبدالرحمن آصف سے شرفِ تلمذ ہونے کی بنا پر اپنے کو آصفی، لکھنا باعثِ فخر تصور کرتے ہیں۔ وطن کلکتہ۔ سن پیدائش ۱۹۲۱ء بڑے پُرگو شاعر ہیں۔ فنِ شاعری و عروض پر قادر ہیں طبیعت میں بلا کی روانی اور موزونیت ہے۔ آپ فارغ الاصلاح ہیں۔ کلکتہ کے بہت سے شاعران سے مستفیض ہوتے رہے ہیں۔

ایک مجموعۂ کلام "جلوہ زار" چھپ چکا ہے۔ خالص اُردو میں بھی اکثر غزلیں کہی ہیں جو بالکل آرزو لکھنوی کی خالص اُردو، کے رنگ میں ہیں۔ اس قسم کے چند اشعار ملاحظہ ہوں ؎

آنچل کو ہواؤں کے جھونکوں کا وہ سرکانا
پھلواری کے کونے میں وہ تیرا سرک جانا

آنسو نہ بہاؤ، تم بھڑکے گی لگی جی کی
یہ پانی کے چھینٹوں سے ہے آگ کا بھڑکانا

اِترائے وہ کیا جی میں دیکھا ہو عطا جس نے
کلیوں کا بکس جانا پھولوں کا بکھر جانا

تقسیم بنگال کے بعد سے اب تک ڈھاکہ میں قیام پذیر ہیں

خلش

رشید الزماں نام۔ خلش تخلص۔ وطن کلکتہ۔ عمر ۳۲ سال۔ ۱۹۴۰ء میں پریسیڈنسی کالج اور اسلامیہ کالج سے بی اے کی ڈگری حاصل کی۔ کالج کے زمانے میں وحشتؔ کلکتوی اور پروفیسر عباس علیخاں بیخودؔ جیسے بلند پایہ شعراء اور شفیق اساتذہ سے مستفیض ہوئے خضر پور کے علاقہ میں جہاں علامہ آرزوؔ لکھنوی مرحوم کا قیام تھا۔ وہیں خلشؔ کی بھی رہائش تھی۔ چنانچہ علامہ مرحوم کی قربت سے کافی فائدہ اٹھانے کا موقع ملا اور باقاعدہ زانوئے تلمذ موصوف کے آگے تہہ کیا۔ کلکتہ کے جواں سال شاعروں میں خلشؔ ممتاز شاعر ہیں ۱۹۴۱ء سے سکریٹریٹ میں ملازم ہیں۔ تقسیم بنگال کے بعد ڈھاکہ میں مستقل سکونت اختیار کرلی ہے۔

خلش خضر پور کی مشہور ادبی انجمن "بزمِ سخن" کے بانی اور سکریٹری رہے۔ آزادؔ مرحوم انہیں دل سے عزیز رکھتے تھے۔ اکثر نوجوان شعراء کو ان کے پاس اصلاح کیلئے بھیجا کرتے تھے۔

نمونۂ کلام یہ ہے ؎

میکدے میں جام سے ساقی نے اک اک کو دیا
اور ہم ہر بار ہاتھ اپنا بڑھا کر رہ گئے

دو دن کی سرکشی کی ندامت ہے آج تک
اچھا ہوا کہ ہم نہ بہت دن جوان رہے

جہاں میں سیکڑوں طوفاں اٹھے گذر بھی گئے
کسی کا سر نہ اٹھا تیرے آستانے سے

عابد عبد المعبود المتخلص بہ عابدؔ مولانا حکیم عبد الرؤف قادری داناپور کے صاحبزادے ہیں۔ حکیم عبد الرؤف داناپوری ۱۹۰۰ء سے آخری دم تک برابر کلکتہ میں رہے۔ ۱۹۴۸ء میں وہیں رحلت فرمائی۔ ان کا شمار کلکتہ کے مشہور و معروف علماء و فضلاء میں ہوتا ہے۔ متعدد تصانیف ان کی یادگار ہیں

عبد المعبود عابدؔ کے بڑے بھائی عبد الودود قادری مرحوم نے اردو لائینو مشین بنائی اور قادری لائینو ٹائپ ایجاد کیا تھا۔ اسی ٹائپ میں مدت تک اردو "ڈان" اخبار کراچی شائع ہوتا رہا۔ ان کے چھوٹے بھائی جو بنگال سول سروس کے امتحان میں مسلمانوں میں اول آئے تھے اس وقت کلکتہ میں پاکستان کے ڈپٹی ہائی کمشنر کے سکریٹری ہیں۔

عابدؔ کو نہ صرف اردو شاعری بلکہ نثر نگاری سے بھی فطری لگاؤ ہے ۳۵ء میں کلکتہ کے ایک ہفتہ وار "کلکتہ ویکلی" میں نائب مدیر رہے اس وقت سے ۳۹ء تک کلکتہ کے متفرق روزناموں اور ہفت روزوں میں مترجم اور مدیر معاون کی حیثیت سے کام کرتے رہے

شمالی و مغربی ہند کے متعدد اخبارات کے نامہ نگار خصوصی بھی رہ چکے ہیں۔ سیاست سے بھی ان کا تعلق رہا۔ ۱۹۳۷ء سے ۱۹۳۹ء تک کلکتہ مسلم لیگ کے جوائنٹ سکریٹری کی خدمات انجام دی۔

تقسیم کے بعد ۴۷ء میں ڈھاکہ پہنچے۔ وہاں کی سب سے پہلی ادبی انجمن "دائرہ ادب" کے پہلے صدر منتخب ہوئے۔

۱۹۳۹ء سے اب تک محکمہ نشر و اشاعت حکومتِ بنگال (تقسیم کے بعد سے حکومتِ مشرقی بنگال) سے منسلک ہیں۔

عابد موجودہ دور کے ایک قابل قدر فن کار ہیں ۱۹۳۲ء میں پہلی غزل کہی۔

علامہ وحشت کلکتوی کے دامن فیض سے وابستہ رہے۔ طبیعت کا خاص رجحان غزل گوئی کی طرف ہے ؎

روش روش ہم نے دیکھ لی ہے کہیں نہیں دل لگا ہمارا
بہار میں زندگی نہیں ہے خزاں میں غارتگری نہیں ہے

جہاں پہ بینش فریب کھائے جہاں بصیرت کو شرم آئے
نظر کا وہ منتہا ہماری کبھی نہیں ہے کبھی نہیں ہے

دیکھ کر ٹوٹی ہوئی کشتی کے تختوں کو مرے
مجھ سے کیوں بیزار ہے اللہ بھی ملاح بھی

نمودِ گل سے ہے فصل بہار کی زینت
وگرنہ خار سے گلشن کبھی نہیں خالی

ظہور | حلقۂ اربابِ ادب میں "ظہور الحق مبارکی" کے نام سے یاد کئے جاتے

ہیں۔ ان کے والد بزرگوار محمد ذکریا مرحوم ڈھاکہ کے نواب خاندان کے طبیب خاص تھے۔ انگریزی کی معمولی تعلیم ہے۔ ذاتی مطالعہ کے ذریعہ اُردو فارسی اور عربی میں اچھی استعداد پیدا کی ہے۔ بفضل تعالیٰ حافظ قرآن بھی ہیں۔

پندرہ سال کی عمر سے شعر کہنا شروع کیا۔ ڈاکٹر عندلیب شادانی جیسے یکتائے روزگار استاد کی فیض و محبت نے ظہور کی شاعری کو بہت بلند کر دیا ہے۔ مشاعروں میں اپنا کلام روح نواز وجد آفریں ترنم سے پڑھتے ہیں اور محفلوں پر چھا جاتے ہیں۔

چند اشعار ناظرین کی ضیافتِ طبع کیلئے پیش ہیں ؂

ذاتِ وحدت میں نہاں ہے وصف کثرت سے عیاں
کتنا عریاں ہے ترا جلوہ جہاں مستور ہے

جو گذر چکا ہے خودی سے وہی ہے خدا رسیدہ
ملی بے خودی سے مجھ کو یہ حدیث عاشقانہ

کون سہ سکتا ہے حیاتِ جاوداں کی تلخیاں
زندگی پر موت کا کتنا بڑا احسان ہے

قہر ہے جب ٹوٹ جائے خود فریبی کا طلسم
خود فریبی کے سہارے زندگی آسان ہے

نہ جائے گی رائیگاں کبھی یہ اہل گلشن کی آہ زاری
خزاں رسیدہ چمن سے اُٹھا ہے گا ابر بہار گھٹا گھر گھر

شمس

عظیم آباد (بہار) میں پیدا ہوئے اس لئے شمس عظیم آبادی کہلاتے ہیں۔ حالانکہ بچپن سے لے کر ۱۹۴۶ء تک برابر کلکتہ

میں رہے۔ تعلیم مدرسہ عالیہ میں حاصل کی، کلکتہ کے جواں سال شاعروں میں ابراہیم ہوش کی طرح شمس کا کلام بھی مقبول خاص و عام ہے۔ ہوش اور شمس یہ دو شاعر ایسے ہیں جو اپنے ترنم کی سحر طرازیوں سے ماحول میں عجیب کیفیت پیدا کر دیتے ہیں اور کلام کی خوبیاں تو سونے پر سہاگے کا کام کرتی ہیں۔

شمس نے ۱۹۳۲ء جرم محمد آبادی کے آگے زانوئے تلمذ تہہ کیا۔ غزل ان کی محبوب صنف ہے ۱۹۴۶ء سے بمبئی میں قیام ہے اور وہاں فلمی گانے لکھ رہے ہیں ؎

تکمیل عشق ہوتی ہے قاتل رکے نہ ہاتھ
جب تک میں دم نہ توڑ دوں خنجر رواں رہے

دل کی ضد ہے کہ رہے گیسوئے جاناں کے قریب
چھوڑ دو آج پریشاں کو پریشاں کے قریب

ہو نہ ہو یہ تپشِ سوزِ دروں کا ہے اثر
کچھ دھواں سا نظر آتا ہے گریباں کے قریب

وہ بھی دن تھے کہ بلا نوش لقب تھا اے شمس
آپ بھٹکے بھی نہیں محفلِ رنداں کے قریب

تاباں سید شاہ عنایت حسین نام۔ تاباں تخلص۔ تاباں جمالی القادری کے نام سے اکثر غزلیں شائع ہوتی ہیں۔ کلکتہ میں پیدا ہوئے اور انقلاب عظیم کے بعد بھی کلکتہ کے ہو کر رہے۔ عمر تقریباً ۳۰ - ۳۲ سال۔ سات آٹھ سال سے وحشت کلکتوی سے اصلاح لیتے رہے ہیں۔

تاباں جمال القادری کی پہلی تالیف "جامِ نو" کے نام سے ۱۹۴۹ء

میں "مکتبۂ قادریہ" سے شائع ہوچکی ہے۔ جامِ نو[1]، کلکتہ کے نوجوان اور اُبھرتے ہوئے شعراء و ادبار کا قابلِ قدر تذکرہ ہے۔ ان کی شاعری کے متعلق امام فن وحشتؔ کلکتوی کی یہ رائے سندِ آخر کا حکم رکھتی ہے۔

"تاباںؔ کلکتہ کے ایک نوجوان شاعر ہیں۔ ان کو شعر و سخن سے ایک فطری مناسبت ہے ان کی طبیعت کی روانی، الفاظ کے حسن و تیبع کی بہچان اور تخیل کی ندرت نے انہیں صفِ شعراء میں ایک ممتاز جگہ دی ہے۔"

تاباں کا پہلا مجموعۂ کلام موسوم بہ "شام روح" سنہ ۱۹۵۱ء میں زیورِ اشاعت سے آراستہ ہوکر منظر عام پر آچکا ہے۔ بطور نمونۂ کلام چند اشعار ملاحظہ ہوں ؎

مجبور ہو کے ترکِ تمنا کروں جو میں
یہ بات بھی نہیں ہے مرے اختیار کی

کسی طرح تو سنانا ہے حالِ دل ان کو
بنا رہا ہوں حقیقت کو اپنی افسانہ

کہہ گئی محفل میں ان سے مرے دل کی داستاں
وہ نگاہِ یاس جس کو بے زباں سمجھا تھا میں

اختر علی اختر کلکتہ کے نہایت پُرگو شاعر اور خوش فکر ادیب ہیں۔ افسانہ ڈرامہ، ترجمہ، ادبِ لطیف، نظم معرا، سانیٹ غرضکہ نظم و نثر کے ہر صنف پر یکساں قدرت رکھتے ہیں۔ فارسی، انگریزی، اردو، ادبیات

---

[1] جام نو میں راقم الحروف کا تذکرہ بھی شامل ہے۔

کا نہایت وسیع مطالعہ کیا ہے۔ ہر ادب پر تنقیدی نظر رکھتے ہیں۔ تقسیم بنگال سے اب تک مشرقی بنگال میں مقیم ہیں اور اپنے ذاتی پریس۔ NEWMAN کے ذریعہ علم و ادب کی خدمت کر رہے ہیں۔ اوائل عمر سے شعر کہتے ہیں۔ چند اشعار ہدیۂ ناظرین ہیں

شکست ذوق نظر کے سوا کچھ اور نہیں
جمی ہو ایک ہی نکتہ پر گر نگاہ تیری
زوال عشق سمجھ، عشق میں خرد مندی
نہیں ہے عقل، محبت میں خیر خواہ تیری
مری نظر کی خطا تھی کہ میں خراب ہوا
مری طرف تھی کہاں بزم میں نگاہ تیری

شاد — رشید احمد خاں شاد خضر پوری کلکتہ کے ان جواں سال شعراء میں سے ہے۔ جن کی طبیعت میں بذلہ سنجی کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے۔ شعر و ادب سے فطری لگاؤ ہے۔ بچپن سے شعر کہتے ہیں مزاحیہ رنگ ایک خاص انفرادیت کا حامل ہے۔ تبسم لکھنوی سے شرفِ تلمذ ہے۔ تقسیم مملکت کے بعد بہ سلسلہ ملازمت لاہور تشریف لے آئے آجکل حیدر آباد سندھ میں قیام پذیر ہیں ؎

آج کل لڑکیاں مدارس کی ... ایکٹنگ لے اُڑی ہیں نرگس کی
ہیں مکدر فضائیں آفس کی ... دھمکیاں مل رہی ہیں ڈس مس کی
وہ کلفٹن وہ مہ رخوں کا ہجوم ... یاد آتی ہے شام پیرس کی

متذکرہ بالا فنکاروں کے علاوہ مشرقی بنگال کے شعراء میں

پروفیسر شمس شیدائی ایم اے۔ احمد صدیقی بنگالی، گوہر شادانی، پروفیسر حنیف فوق عطاالرحمن جمیل، اختر پیامی، مسعود کلیم، کلیم سہسرامی، وحید قیصر ندوی (نمائندہ انجمن ترقی اردو مشرقی پاکستان)، شمیم پھلواروی، لبشیر ملا ٹھوی، یحییٰ طرب۔
دفا براہی اور مغربی بنگال میں محمد یعقوب افضل بی۔ اے خضر پوری، ڈاکٹر رضی احمد رضی ناطقی۔ عبدالرحیم رحیم خضرپوری، عبدالصمد شید اخضر پوری تلمیذ ناوک لکھنوی، محمد اسمٰعیل فائز آصفی، محمد ہاشم آصفی، علی حسن فہمی تلمیذ سالک لکھنوی پروفیسر محمد رضا بر ضبط ایم۔ اے وغیرہ قابلِ ذکر ہیں۔

چوتھا دور

چوتھا گروپ

اظہر ظہیر الدین محمد یحییٰ نام۔ اظہرؔ تخلص۔ دنیائے ادب میں اظہر قادری کے نام سے مشہور ہیں۔ ۱۵ رجولائی ۱۹۲۹ء میں کلکتہ میں پیدا ہوئے۔ ۱۹۴۵ء میں اسلامیہ کالج سے بی۔ اے اور ۱۹۵۰ء میں کلکتہ یونیورسٹی سے ایم۔ اے (اردو) میں کیا۔ ۱۹۵۱ء سے ڈھاکہ میں سکونت ہے۔ پہلے ڈھاکہ یونیورسٹی نائٹ کلاس میں اردو کے پروفیسر تھے اور اب سینٹ گرے گریز کالج میں پروفیسر ہیں۔

کیپٹن قمر صدیقی مرحوم ایم۔ اے۔ بی۔ ٹی جیسے اہل علم و فضل کے زیرِ تربیت و تعلیم پرورش پانے کی وجہ سے اوائل عمر ہی سے علم و ادب سے ذوق رہا اور موصوف

مرحوم کی شفقت و محبت نے جادۂ شعر و ادب میں رہنمائی کی۔

ساقی کراچی، جام نو کراچی، دلربا ڈھاکہ اور دیگر رسائل میں ان کے مقالات اور نظمیں اکثر شائع ہوتی رہتی ہیں۔ انھیں صنف رباعی میں بھی ید طولیٰ حاصل ہے ان کی رباعیوں میں صرف یہی نہیں کہ اچھوت خیالات، گہرے نظریات اور جمال نواز نکات ملتے ہیں بلکہ شاعرانہ رنگینیاں اور فنکارانہ پختہ کاریاں بھی پائی جاتی ہیں۔ ایک مجموعہ "رباعیات اظہر" مرتب ہو چکا ہے جو اس جواں فکر و جواں سال شاعر کی فنکارانہ صلاحیتوں کا مظہر ہے۔ ایک غزل ہدیۂ ناظرین ہے ؎

ملتفت گر نگاہِ یار نہیں — دل بھی کچھ ایسا بیقرار نہیں
رو کے چاہوں کہ غم کروں ہلکا — اب تو اتنا بھی اختیار نہیں
وہ سمجھتے ہیں شادماں مجھ کو — غم جو چہرے سے آشکار نہیں
کیوں خوشی کی ہو آرزو مجھ کو — غم تو دل پر کچھ ایسا بار نہیں

پھول مرجھا بھی جاتے ہیں اظہر
زندگانی سدا بہار نہیں

ارشد نام سید شاہ رشید الرحمن۔ تخلص ارشدؔ سال پیدائش ۱۹۲۹ء ۱۹۴۸ء میں پٹنہ یونیورسٹی سے درجہ اول میں بی اے آنرز، اور ۱۹۵۱ء ڈھاکہ یونیورسٹی سے درجہ اول میں ایم۔ اے کے امتحانات پاس کیے ان دنوں ڈھاکہ یونیورسٹی کے شعبہ اردو سے وابستہ ہیں۔

ان کی ادبی زندگی کا آغاز ۱۹۴۴ء سے ہوتا ہے۔ غزلیں بھی کہتے ہیں اور نظمیں بھی۔ تنقیدی مضامین اکثر لکھتے رہے ہیں۔

ایک مجموعۂ کلام "سنگ و سخن" اور ایک مقالات کا مجموعہ "آج کا نقاد" عنقریب منظر عام پر آنے والے ہیں۔

تقسیم کے بعد بہار سے ہجرت کر کے ڈھاکہ آگئے ہیں۔

چند اشعار ملاحظہ ہوں ؎

پتے کی بات تھی لیکن چمن سے کون کہے
خزاں نے روپ نکھارا تری بہاروں کا

ترے کرم کا ول غم نواز کیا کہنا
نظر ہیں ایک ہیں اب سوز و ساز کیا کہنا
یہی جو حال رہا تیری چشم پوشی کا
گناہ کرنیکا پھر کس کو حوصلہ ہوگا

زندگی موت کے پہلو میں ہے اک ذرد لطیف
اور وہ درد جو بڑھتا ہی گیا کم نہ ہوا

صادق

نام محمد عبدالرزاق۔ تخلص صادق۔ قلمی نام صادق القادری عمر ۲۵ سال۔ وطن کلکتہ۔ اسلامیہ کالج سے بی اے آنرز کیا تقسیم کے بعد سے ڈھاکہ میں قیام ہے۔

۱۹۴۴ء سے ابرار حسنی سے اصلاح لیتے ہیں۔ نمونہ کلام یہ ہے

راہ میں بیم و رجا کی وہ تذبذب دل میں ہے
اک قدم منزل کے باہر اک قدم منزل میں ہے

ایک پروانے کا جل جانا تو سب پہ کھل گیا
یہ خبر کس کو کہ شمع بزم کس مشکل میں ہے

بے تمنا زندگی انسان کی دشوار تھی
اک نہ اک حسرت نہاں ہر آدمی کے دل میں ہے

قدوس

یہ غلام قدوس صدیقی کلکتہ کے مشہور شاعر عطا آصفی کے چھوٹے

بھائی ہیں۔ ان کا سن پیدائش ۱۹۲۶ء بمقام کلکتہ ہے۔ بچپن سے شعر کہتے ہیں اور طالبعلمی کے زمانے سے آج تک تقریباً ہر طرحی مشاعرے میں غزلوں کے ساتھ شرکت کرتے ہیں۔ نثر نگاری کا شوق بھی فطری ہے۔ ایام طالب علمی میں اسلامیہ ہائی اسکول میگزین کے سنہ ۱۹۳۸ء سے ۱۹۴۰ء تک چیف ایڈیٹر رہے۔ ماہنامہ ارمغان کلکتہ بھی کئی سال تک ان کی ادارت میں نکلتا رہا۔ شاعری میں اپنے برادر محترم عطا آصفی سے استفادہ کرتے رہے۔ حضرت طاہر علی شاگرد عبدالرحمن آصف کو بھی اکثر اپنا کلام دکھاتے رہے۔ تقسیم بنگال کے بعد سے ڈھاکہ ان کا وطن ثانی ہے ۔

ہے میرے پیش نظر اب بھی صورت پرواز
مجھے نہ روک سکے گی مری شکستہ پری

تمھارے ساتھ گزر جائے تو غنیمت ہے
وہ ایک لمحہ سہی عمر جاوداں نہ سہی

پھر جنون عشق شاید رنگ پر آنے لگا
پھر چمن میں دل مرا اے دوست گھبرانے لگا

فصل گل سے تو کہیں وہ رخ خزاں بہتر تھا
ہائے لٹ جائے گا گلشن مجھے معلوم نہ تھا

نظیر

نام نظیر صدیقی۔ تاریخ پیدائش ۷ نومبر سنہ ۱۹۳۰ء مولد سرائے ساہو ضلع چھپرا (بہار) سنہ ۱۹۴۶ء میں پٹنہ یونیورسٹی سے میٹرک سنہ ۱۹۴۸ء میں جارج اسلامیہ کالج گورکھپور سے انٹرمیڈیٹ اور سنہ ۱۹۵۰ء میں ڈھاکہ یونیورسٹی سے بی اے کے امتحانات پاس کئے۔ سنہ ۵۳ء میں ڈھاکہ یونیورسٹی سے

درجہ اوّل میں ایم۔ اے (اردو) کیا۔

۱۹۶۸ء سے ڈھاکہ میں مقیم ہیں۔ نظم و نثر لکھنے کا ذوق فطری ہے

نمونہ کلام یہ ہے۔

ہر ہر نفس ہے موت کی حسرت لئے ہوئے
میں جی رہا ہوں زیست کی تہمت لئے ہوئے

یادِ ماضی تلخ ہے اور عکس فردا دل شکن
اے غم امروز اب تو ہی بتا ہم کیا کریں

جو لوگ موت کو ظالم قرار دیتے ہیں
خدا ملائے انہیں زندگی کے ماروں سے

حفیظ حفیظ رزاقی کا سال پیدائش ۱۹۳۸ء بمقام کلکتہ ہے ۱۹۶۸ء میں کلکتہ یونیورسٹی سے بی۔ اے کیا

نظم و نثر دونوں پر یکساں قدرت ہے۔ شعر و شاعری میں پروفیسر عباس علی خاں بیخود سے شرفِ تلمذ ہے ان کی نظمیں ہندو پاک کے اکثر اخبارات و رسائل میں شائع ہو چکی ہیں نمونہ کلام یہ ہے

ہمیں خوف کیا رقصِ موجِ بلا کو — سمجھتے ہیں ساحل کی روحِ رواں ہم
غمِ عشق بن جا غمِ آدمیت — وفا کی مکمل کریں داستاں ہم

جن پہ کچھ فکر و تصور کے ٹرے ہوں سائے
زیست دراصل عبادت انہیں لمحات سے ہے

راشد راشد القادری کی عمر ۲۸ - ۳۰ سال ہوگی۔ وطن و مسکن شہر کلکتہ

سنہ ۱۹۴۲ء میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے میٹرک پاس کیا۔ علامہ وحشتؔ سے شرف تلمذ ہے۔ بڑے پرگو شاعر ہیں۔ بہت خوب کہتے ہیں۔ ایک غزل جس کا عنوان "نغمۂ خودی" ہے کے چند اشعار سنیئے ؎

فضائے نو کی بلندیوں سے خودی کا نغمہ سنا رہا ہوں
ہر ایک ذرے کو رشکِ خورشید و ماہ و انجم بنا رہا ہوں

میں اپنی لوحِ حیات سے یوں نقوشِ ماضی مٹا رہا ہوں
شرابِ ماضی کی نہ سے اٹھ کر ایاغِ فردا چڑھا رہا ہوں

ہر اک اشارے پہ انکے بڑھ کر میں بازی جاں لگا رہا ہوں
خرد کو رنگیں فریب دیکر جنوں کی طبیعت بڑھا رہا ہوں

اقبال

نام محمد اقبال حسین تخلص "اقبال" وطن کلکتہ۔ عمر ۳۰ سال۔ شاگرد وحشتؔ نظم و نثر خاصا لکھتے ہیں۔ پہلے اقبال کلکتوی اور اب اقبال اعظمی ان کا قلمی نام ہے متعدد اخبارات و رسائل کے ایڈیٹر رہ چکے ہیں جن میں ہفتہ وار نیا سنسار، دلچسپ وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ غزلوں کی نسبت نظمیں زیادہ کہتے ہیں۔ ان کی نظموں کا موضوع عموماً اشتراکیت ہے۔

اقبال اعظمی کی ایک نظم بعنوان "اقبال قیصری کا زمانہ گذر گیا" کے چند اشعار ناظرین کے خدمت میں پیش ہیں

انگڑائی لے کے اٹھ ہی گئی میری بے کسی
اہل دول کا ظلم جو حد سے گذر گیا

مایوس زندگی نے اجل کو بنا دیا دوست
فاقوں سے جب کہ صبر کا پیمانہ بھر گیا

اُٹھو کہ دستِ ظلم کو بڑھ کر مروڑ دیں
مٹنا پڑے گا ہاتھ جو یہ پل گذر گیا

خود داریوں کا خون ہوا بے خودوں کے ہاتھ
ہر آنکھ سے خمار خودی کا اتر گیا

قلبِ وطن نواز میں گر روح پھونک دے
سمجھوں گا میں کہ نالہ میرا کام کر گیا

محکوم اب نہ کوئی رہیگا جہان میں
اقبال قیصری کا زمانہ گذر گیا

ناظر ناظر الحسینی کی عمر کوئی تیئیس سال ہوگی۔ کلکتہ میں پیدا ہوئے اور تاحیات تک یہیں رہنے کا ارادہ ہے۔ بچپن سے شعر کہتے ہیں۔ اکثر اپنا کلام علامہ وحشت کو بغرض اصلاح دکھایا کرتے ہیں۔ شروع میں اکثر غزلیں کہتے تھے۔ اب زیادہ تر نظمیں کہتے ہیں۔ کئی اخباروں اور رسالوں کے مترجم اور اڈیٹر رہ چکے ہیں۔ آجکل روزانہ ہند کلکتہ میں مترجم ہیں۔ خالص ترقی پسند شاعر ہیں اور انقلابی شاعری کے دلدادہ۔

ایک نظم "بیزاری" کا ایک بند ملاحظہ ہو
دیکھ کر سینۂ عاشق میں جدائی کے داغ
دیکھ کر جلتے ہوئے فصلِ بہاراں میں باغ
دیکھ کر بجھتے ہوئے حسرت و ارماں کے چراغ
دیکھ کر قوم کے افراد کے فرسودہ دماغ
ہند سے دور بہت دور چلا جاؤں گا

ساجن کلکتہ کے ابھرتے ہوئے نوجوان نثر نگاروں میں جنھوں نے اپنے کثیر التعداد مضامین کے باعث شہرت حاصل کی ہے ان میں "ساجن پردیسی" کا نام سب سے اول آتا ہے۔ ساجن کے افسانے برصغیر ہند و پاک کے متعدد رسائل و جرائد مثلاً تجلی، کلکتہ، بیسویں صدی دہلی، جادہ، بھوپال، احساس لاہور، جنسیات، سائیکولوجی کراچی، کائنات لاہور۔ وغیرہ میں گذشتہ دس سال سے برابر چھپ رہے ہیں۔ کارواں الہ آباد، نظام لاہور، افکار کراچی۔

ساجن پردیسی کا اصل نام عبد الغفور اور مقام ولادت کلکتہ ہے عمر ۲۵ ۲۶ سال۔ انگریزی تعلیم میٹرک سے آگے نہ بڑھ سکی لیکن افسانہ نویسی کے شوق میں انگریزی لٹریچر کی اچھی اچھی کتابیں برابر مطالعہ کرتے اور ان سے استفادہ کرتے رہے۔ تقسیم کے بعد ڈھاکہ چلے گئے۔ آج کل کراچی میں سکونت ہے۔

سنہ ۱۹۵۰ء میں کراچی سے غزل، نامی ماہنامہ جاری کیا اور اس کے بعد "سراغ رساں" جیسے نئے موضوع پر رسالہ نکالا۔ اول الذکر رسالہ بند ہو چکا ہے۔ آخر الذکر ہنوز جاری ہے۔

ساجن خاص ترقی پسند افسانہ نگار ہیں اس لئے ان کی تخلیقات ترقی پسند نظریات کی حامل ہوتی ہیں۔

متذکرہ بالا فن کاروں کے علاوہ اس گروپ کے شعراء میں سحر کلکتوی بی اے (آنرز)، (تلمیذ علامہ آثر ردولوی تلمیذ امیر مینائی)، غلام مرتضیٰ قدسی بی اے (آنرز) تلمیذ پروفیسر عباس علی خاں بیخود ایم اے) یاور حسینی (تلمیذ پروفیسر شوق علیگ)، مضطر حیدری، نشاط القادری۔ محمد قاسم صبر خضر پوری۔ روش علی حشرت تلمیذ منی لال، ادیب خضر پوری، رشید شمیم خضر پوری، احسان در بھنگوی

وغیرہ اور افسانہ نگاروں میں غلام رسول عشرؔ انصاری، جاوید نہال ایم اے۔ قیصر نشاط۔ اشتیاق احمد سہیل ادیب اور عابدی فیض آبادی وغیرہ کی بے لوث خدمات قابل ستائش ہیں اور ان کی ذات سے اُردو زبان و ادب کی بہت کچھ توقعات وابستہ ہیں۔

تقسیم کے بعد ان میں سے بعض مغربی بنگال (کلکتہ) میں رہ گئے۔ اور بعض مشرقی بنگال چلے گئے۔ اور وہاں کے ادبی ماحول میں چھائے ہوئے ہیں۔

بنگال میں واجد علی شاہ اختر کا زمانہ

اور ان کے ہمعصر شعراء

اختر غدر ۱۸۵۷ء کے بادِ خزاں سے دہلی اور لکھنؤ کے گلستانِ سخن اجڑ گئے۔ خاتم السلاطین واجد علی شاہ تاجدار اودھ کو معزول کر کے مٹیا برج کلکتہ اور شہنشاہ دہلی بہادر شاہ ظفرؔ کو رنگون بھیج دیا گیا۔ واجد علی شاہ کی ذات سے بنگال کو یہ فائدہ پہنچا کہ وہ نہ صرف اپنے ہمراہ لکھنؤ کی مذاق سخن اور سرمایۂ زبان لائے بلکہ اپنے تمام خوشہ چیں اہل علم و فضل کو بھی ساتھ لے آئے جن کے ذوق شعر و ادب نے "مٹیا برج" کو "لکھنؤ ثانی" بنا دیا۔ بادشاہ واجد علی شاہ کس حسرت و یاس کے ساتھ اپنا محبوب وطن چھوڑنے پر مجبور ہوئے۔ یہ شعر ان کے دلی جذبات اور احساسات کا ترجمان ہے ؎

در و دیوار پہ حسرت سے نظر کرتے ہیں
رخصت اے اہل وطن ہم تو سفر کرتے ہیں

انھیں نہ صرف فن تعمیر سے شوق تھا بلکہ فن موسیقی اور رقص و سرود سے بھی بیحد دلچسپی تھی۔ اُردو اور ہندی دونوں زبانوں میں شعر کہتے تھے۔ ہندی میں "جان عالم پیا" اور اُردو میں "اختر" تخلص کرتے تھے۔ ٹھیٹ ہندی میں طبع آزمائی کی۔ ان کی ٹھمریاں اور دادرے وغیرہ آج بھی لکھنؤ کے محلوں اور گلیوں میں مزے لے لے کر گائے جاتے ہیں۔ ان کے اُردو تخلص کے سلسلہ میں یہ امر دلچسپی سے خالی نہیں کہ انھوں نے یہ تخلص اختر بنگال کے مشہور و باکمال شاعر قاضی محمد صادق خاں المتخلص بہ اختر سے انعام واکرام کے عوض خرید لیا تھا۔ میر مظفر علی اسیر لکھنوی اور نواب فتح الدولہ برق لکھنوی واجد علی شاہ اختر کے استاد تھے۔ اختر نے قاضی محمد اختر سے بھی مشورہ سخن لیا۔

شاہ اختر نے نظم ونثر کی تقریباً پچاس کتابیں لکھی ہیں۔ مثنوی خوب کہتے تھے ہر شعر درد و تاثر میں ڈوبا ہوتا تھا۔ لکھنؤ سے سفر کلکتہ کے حالات "حزن اختر" کے عنوان سے نظم کئے جو بہت المناک و دلسوز ہیں۔ ایک مثنوی کے چند اشعار بطور از خروارے پیش کئے جاتے ہیں :

وہ رشک قمر نہا چکی جب
پہنا کفن اس نے گیروا سب

تسبیح گلے میں ایک ڈالی
اور مانگ بھی بالوں میں نکالی

بالوں کو بھی کر دیا پریشاں
حُسن اس سے ہوا مگر دو چنداں

کا فور لگایا سب بدن میں
کچھ عطر بھی مل دیا کفن میں

عمامہ بھی باندھا اس نے سر پہ
اور گیرو کی اوڑھی ایک چادر

جسم اپنا چھپا کے سب کفن میں
وہ شمع رُخ آئی انجمن میں

اک ہاتھ میں اس کے خنجر تیز
اور ایک میں جام سم سے لبریز

اک لونڈی کے ہاتھ میں اگر سوز رومال لئے کوئی جگر سوز
واں ناچ کا شغل ہو رہا تھا غل ساز طرب کا جا بجا تھا
مطرب سب کو رجھا رہے تھے اختر کی غزل یہ گا رہے تھے

اکثر اپنے محبوب وطن کی یاد سے تڑپ اٹھتے ؎

یہی تشویش شب و روز ہے بنگالے میں
لکھنؤ پھر بھی دکھائے گا مقدر میرا

حسب ذیل اشعار میں اختر کا خاص رنگ جھلکتا ہے ؎

کمر دھوکا، دہن عقدہ، غزال آنکھیں، پری چہرہ
شکم ہیرا، بدن خوشبو، جبیں دریا، زباں عیسیٰ
برائے سیر مجھ سار نار، میخانے میں گر آئے
گرے ساغر، لنڈھے شیشہ، ہنسے ساقی، بہے دریا

ایک طرف لکھنؤ کی محفل شعر و ادب کا چراغ گل ہو گیا تو دوسری طرف "مٹیا برج" کی شاعری میں چار چاند لگ گئے۔ اختر کے ہمراہ جو شعراء لکھنؤ سے "مٹیا برج" آئے انھیں نہ صرف سیم و زر سے مالا مال کیا بلکہ طرح طرح کے خطابات سے بھی سرفراز کیا۔ چنانچہ مرزا محمد آغا برق کو فتح الدولہ، بخشی الملک، ہور خشاں کو مہتاب الدولہ، کوکب الملک، ستارہ جنگ اور اسیر کو تدبیر الدولہ و وزیر الملک جیسے دلکش خطابات سے نوازا۔

خواجہ آتش کے شاگردوں میں حجو اور خلیل بھی لکھنؤ سے مٹیا برج آئے اور اختر کے چشمۂ فیض و دولت سے فیض یاب ہوئے۔

حجو میر اسادات حسین آغا حجو شرف ماجد علی شاہ اختر کے سمدھی تھے ان کا کلام رنگ تغزل کا آئینہ دار اور غیر مانوس و متروک الفاظ سے

سے پاک ہے۔ چند اشعار ناظرین کی ضیافت طبع کیلئے پیش کرتا ہوں ۔

ٹھہرا گیا ہے لا کے جو منزل میں عشق کی
کیا جانے رہنما تھا کہ رہزن تھا کون تھا؟

نکل کے جاؤں کدھر تیری انجمن کے سوا
چمن کی بلبلوں بسوں پھر کہاں چمن کے سوا

خلیل

میر دوست علی خلیل خلف سید جمال متوطن بڑولی نے نواب نادر مرزا کے ہمراہ کلکتہ کا سفر کیا۔ شاعری میں رعایت لفظی کے دلدادہ تھے۔ متروک اور غیر مانوس الفاظ بھی ان کے کلام میں ملتے ہیں۔ بعض اشعار بہت اچھے ہیں اور حسنِ تغزل کا بہترین نمونہ ہے

بزم سے یار نے یہ کہہ کے نکالا ہم کو
اُٹھیے! گھر جائیے! دم لے چکیے! سستائیے بہت

مسافرِ رہ نا آشنائے منزل ہیں
مثالِ ریگِ رواں جائیں کہاں، دیکھیں!

اسیر

سید مظفر علیخاں اسیر، سید امداد علی کے بیٹے، مصحفی کے شاگرد، بادشاہ اختر کے مصاحب اور استاد تھے۔ چھ اردو ایک فارسی دیوان ان کی یادگار ہیں فن عروض کے ماہر تھے۔ زبان نہایت عمدہ، حکیم ناطق لکھنوی مرحوم نے اپنی معرکہ آرا غیر فانی تصنیف نظم اردو (صـ۹۶) میں ان کی خصوصیات کلام پر نہایت جامع تبصرہ کیا ہے "یہ لکھنؤ میں سب سے پہلے شاعر ہیں جنھوں نے زبان کی سادگی کو مضامین و تخیل کی گہرائیوں سے وزنی کر دیا۔"

نمونہ کلام یہ ہے

کہنے کو یوں جہاں میں ہزاروں ہیں یار دوست
مشکل کے وقت ایک ہے پروردگار دوست

آیا ہے ہم کو ہاتھ یہ مضموں چراغ سے
روشنی اسی کا نام ہے جو جلائے دل

امیر کے شاگردوں میں امیر مینائی سب سے زیادہ مشہور ہوئے ان کے دو بیٹے حکیم اور افضل بھی صاحب دیوان تھے۔

برق فتح الدولہ، بخشی الملک خطاب، مرزا محمد رضا خاں نام۔ برق تخلص، مرزا کاظم علیخاں لکھنوی کے صاحبزادے، ناسخ کے تلمیذ رشید اور اختر کے استاد عزیز تھے۔

اختر سے انھیں بہت محبت تھی جب ترک لکھنؤ کیا اور مٹیا برج میں سکونت اختیار کر لی تو اپنے تعلقات کے تاثرات کا یوں اظہار کیا ہے

برق جو کہتے تھے آخر وہی کر کے اٹھے
جان دی آپ کے دروازہ پہ مر کے اٹھے

برق کا انتقال مٹیا برج میں ہوا۔ ایک ضخیم دیوان اپنے پیچھے چھوڑا۔ کلام میں تخیل اور تکلیف کے ساتھ ساتھ تاثیر و کیف بھی ہے۔ ناسخ سے متاثر تھے اور انھیں کے رنگ میں اکثر و بیشتر اشعار کہے ہیں

اذاں دی کعبہ میں ناقوس دیر میں پھونکا
کہاں کہاں ترا عاشق تجھے پکار آیا

قیس کا نام نہ لو ذکر جنوں جانے دو
دیکھ لینا مجھے تم موسم گل آنے دو

برق کے شاگردوں میں جلالی اور سحر بہت مشہور ہوئے۔

درخشاں مہتاب الدولہ، کوکب الملک، ستارۂ جنگ خطابات،

سید علیخاں نام، درخشاں تخلص، اسیر سے شرفِ تلمذ حاصل تھا اور آسیر کے توسط سے شاہی دربار میں رسائی پائی۔ مٹیا برج میں رحلت کی۔

ان کے علاوہ لکھنؤ کے جو خوش فکر و پرگو شعراء اختر کے دامنِ دولت سے وابستہ تھے اور جن کی شمع سخن سے محفل ادب روشن رہتی تھی ان میں مظفر علی ہنر (جو غزل میں صبا اور مرثیہ میں مرزا دبیر سے اصلاح لیتے تھے اور شاہ اختر کی دو بیگمات عذرۂ عظمیٰ نواب بادشاہ محل عالم اور نواب محبوب عالم کے استاد تھے) حاجی مرزا علی بہار (جو رشک کے شاگرد تھے) عیش اور مالک الدولہ صولت وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

اس زمانے میں بنگال کے ہر چہار طرف شعر و سخن کا کافی چرچا رہا۔ مرزا نواب خاں داغ دہلی سے اور نظم طباطبائی دکن سے کلکتہ آئے اور وہاں کے مشاعروں اور ادبی محفلوں میں برابر شرکت کی۔ داغ نے اپنے قیام کلکتہ کا ذکر اپنی مثنوی "فریادِ داغ" میں بڑی محبت سے کیا ہے۔

نظم علی حیدر نظم طباطبائی کو شاہ اختر نے نواب حیدر یار جنگ بہادر کے خطاب سے نوازا تھا۔ نظم ۱۲۷۰ھ میں لکھنؤ میں پیدا ہوئے اور ابتدائی تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد کلکتہ آ گئے تھے جہاں مولانا قائم الدین سے فارسی و عربی تعلیم کی تکمیل کی۔ شاہ اختر نے انھیں اپنے شہزادہ مرزا کام بخش کی تعلیم کے فرائض پر مامور کیا تھا ۱۳۰۵ھ میں واجد علی شاہ کی وفات کے بعد حیدرآباد دکن چلے گئے اور وہیں پیوند خاک ہوئے۔[۱]

---

[۱] نظم طباطبائی کے مفصل حالات و نمونۂ کلام کے لئے دیکھیے۔
"دکن میں اردو" از نصیر الدین ہاشمی

نواب واجد علی شاہ اختر کے زمانے میں بنگال کے مختلف مقامات میں قاضی محمد اختر اور عبدالغفور خاں نساخ جیسے اکابرین سخن وماہرین ادب کے علاوہ اور بہت سے باکمال شعراء ومایہ ناز انشاء پرداز موجود تھے، حاجی عبدالحمید حمید، پروفیسر عبدالغفور شہباز، عبد الودود، عبدالسبحان شاکر، محمد اسمٰعیل شوکت، عبدالعزیز عزیز، میر نذیر علی، اعظم ومعراج کلکتہ، خواجہ محمد افضل، نواب سید محمود آزاد، سید محمد آزاد (نامہ نگار اودھ پنچ) اکرام احمد ضیغم، غلام خاں تمکین، خواجہ حیدر جہاں شائق، خواجہ عبدالغفار اختر، خواجہ عبدالرحیم صبا، شاہ رؤف احمد رافت سرہندی ڈھاکہ۔ الفت حسین فریاد اور جرأت مرشدآباد۔ حیدر بخش حیدری۔ اور رمز چاٹگام۔ شاہد فریدپور۔ منظوم مالدہ، النسخ نیٹردا، فدا سلہٹ اور نجم الدین نادر میمن سنگھ کے رہنے والے تھے ان سب کے تذکرے دوسرے اور تیسرے منزل کے باب میں درج کئے جاچکے ہیں۔

بنگال میں علامہ آرزو لکھنوی

اور ان کے تلامذہ

تمہید بنگال میں علامہ خان بہادر رضا علی وحشت کی ناقابلِ فراموش خدمت زبان وادب میں اظہر من الشمس ہے اور تاریخ ادب اردو میں سنہرے حرفوں سے مرقوم ہونے کے لائق لیکن ان کے علاوہ حکیم علامہ ابو العلا ناطق لکھنوی مرحوم اور علامہ انور حسین آرزو لکھنوی مرحوم جیسے یگانۂ روزگار و مستند اساتذۂ فن وسخن کا اثر بھی بہت حد تک کلکتہ (مغربی بنگال) کے ادبی ماحول پر رہا۔ ناطق اور آرزو مدت دراز تک کلکتہ میں سکونت پذیر رہے اور بہت سے اہل ذوق ان کے چشمۂ فیض سے مستفیض و فیضیاب ہوئے۔ علامہ ناطق کا تذکرہ "چوتھے دور" کے باب میں شامل کیا جا چکا ہے۔

یہاں علامہ آرزو اور ان کے تلامذہ جو کلکتہ میں عرصہ دراز سے مقیم ہیں بلکہ کلکتہ

جن کا وطن ثانی ہے، کے مختصر حالات زندگی معہ انتخاب کلام پیش کیے جاتے ہیں۔

آرزو سید انور حسین نام۔ آرزو تخلص۔ ابتداء میں اُمید تخلص کرتے تھے سلسلہ نسب امام ہفتم موسیٰ ابن جعفر علیہ السلام سے ملتا ہے۔

۱۸ ذی الحجہ ۱۲۸۹ھ مطابق ۱۸ فروری ۱۸۷۳ء کو لکھنؤ میں پیدا ہوئے آرزو کے مورث اعلیٰ عہد مغلیہ میں ہرات سے وارد ہندوستان ہوئے اور شہنشاہ عالمگیر کے عہد میں اودھ کی صوبیداری پر فائز ہوکر لکھنؤ آئے اس وقت سے یہ خاندان یہیں سکونت پذیر ہوگیا۔

آرزو کے والد ماجد سید ذاکر حسین یاس اپنے وقت کے مشہور شاعر اور شاہدین شہر میں شمار ہوتے تھے۔ غزل میں جلال اور مرثیے میں میر مونس کے شاگرد تھے۔ آرزو نے شاعری شروع کی تو ابتدا ہی سے وہ رنگ طبیعت تھا کہ شفیق باپ نے اپنے استاد جلال کے حلقہ تلامذہ میں داخل کر دیا۔ اور آخر کار بعد وفات جلال، آرزو بہ اتفاق آرا جانشین جلال متقرر ہوئے۔

جلال اپنے عہد کے مسلم الثبوت صاحب فن تھے آرزو نے بھی فن شعر کی طرف پوری توجہ کی اور امام فن و مجتہد زبان ملنے گئے۔ اصناف سخن میں سوائے واسوخت کے ہر صنف میں کلام موجود ہے۔ غزل، قصیدہ، اور مرثیہ کا ذخیرہ بہت زیادہ ہے مثنویوں میں "عدل محمود، اور دُردانہ" نے بہت شہرت حاصل کی کئی فنی رسالے بھی لکھے جن میں "نظام اردو" اور میزان الحروف، اپنی نوعیت کے اعتبار سے نہایت گرانقدر رسالے ہیں نظام اردو" میں زبانِ اُردو کے قواعد بالخصوص اضافت مترادف کے علمی استعمال کے قاعدوں کا بیان وہ کارنامہ ہے جس کی مثال دوسری زبانوں کی قواعد کی کتابوں میں ملنا دشوار ہے

"میزان الحروف" میں صرف کی "مقدار صوت" سے بحث کی گئی ہے۔ یہ

موضوع بھی بالکل نیا ہے۔

آرزو نے ڈرامے بھی لکھے۔ جن میں چراغ توحید" صدائے درویش، جام زہر، سیفو عمل کا پھل، متوالی جوگن، دل جلی بیراگن، حسن کی چنگاری، چاند گہن اور بات کا دھنی بہت مشہور ہوئے آخر الذکر پانچ ڈرامے پارسی تھیٹریکل کمپنی۔ کارنتھین تھیٹریکل کمپنی اور الفریڈ تھیٹریکل کمپنی میں اسٹیج ہوئے اور بے پناہ مقبولیت حاصل کی۔

ان کی شہرت شاعری سے متاثر ہوکر کلکتہ کی مشہور فلم کمپنی نیو تھیٹرس نے ۱۹۳۶ء میں خدمات حاصل کریں اور وہ فلم کے گانے لکھنے لگے۔ فروری ۱۹۴۲ء میں نیشنل کمپنی کی طالب پر بمبئی تشریف لے گئے۔ اور آخر عمر یعنی ۱۹۵۱ء تک بمبئی میں مقیم رہے۔ سچ تو یہ ہے کہ فلمی دنیا میں آرزو لکھنوی کی وابستگی نیک فال ثابت ہوئی۔ پہلے فلمی گانے عموماً فن وزبان کے قید و بند سے آزاد ہوتے تھے لیکن آرزو کی شمولیت نے ایک حیرت انگیز انقلاب برپا کردیا۔ اور فن وزبان کی بڑی حد تک اصلاح ہوگئی

آرزو اُردو کی۔ ایک مکمل اور جامع نعت لکھنے میں مصروف تھے جس کا سلسلہ ان کی وفات کے بعد ختم ہوگیا۔

نہایت با اخلاق، بامروت بزرگ تھے۔ دنیا و مال دنیا کی طرف سے طبیعت مستغنی پائی تھی یہی سبب ہے کہ کبھی کسی کی جھوٹی خوشامد نہیں کی۔ ان کا کلام اہل دول کی مدح سے قطعاً پاک ہے۔ خاکسار کو ان کی صحبتوں سے اکثر لطف اندوز اور مستفیض ہونے کا شرف حاصل رہا۔

کسی باکمال شاعر کے جملہ خصوصیات شاعری کو جمع کرنا آسان نہیں البتہ چند نمایاں خصوصیتیں بیان کی جاسکتی ہیں۔ آرزو کے کلام میں مندرجہ ذیل خصوصیتیں نمایاں طور پر نظر آتی ہیں جو ان کے کمال کی آئینہ دار ہیں۔

۱۔ کلام فنی عیوب سے یکسر پاک ہے۔

۲ :- عامیانہ اور سوقیانہ خیالات سے ان کی شاعری کا دامن بالکل پاک ہے۔

۳ :- حقیقت و نفسیات کے نہایت لطیف مظاہرے کثرت سے نظر آتے ہیں۔

۴ :- لطافت زبان ایک امتیازی خصوصیت ہے

۵ :- سلاست و روانی کے ساتھ درد و اثر ان کا خاص حصہ ہے۔

۶ :- انداز بیان میں دلکش ندرت و جدت پائی جاتی ہے۔

۷ :- آہنگ و معنی دونوں کے اعتبار سے الفاظ برمحل و مناسب کا استعمال صرف آرزو کی خصوصیات سے ہے۔

۸ :- متعلق الفاظ اور غریب و نامانوس ترکیبیں بالکل نہیں آنے پاتیں۔ اگر کہیں کوئی ثقیل لفظ ضرورتاً صرف ہو بھی جاتا ہے تو ایسے محل سے کہ معنی خود بخود واضح ہو جاتے ہیں۔

۹ :- طبیعت کی روانی سخت سے سخت زمین کو پانی کر دیتی ہے

۱۰ :- قدرتِ بیان کی صنعت ہر جگہ نمایاں ہے۔ بالخصوص بہت سی چھوٹی بحروں میں مفاہیم نہایت خوبی سے واضح ہو جاتے ہیں اور لمبی بحروں میں بھرتی کے الفاظ نہیں آنے پاتے۔

۱۱ :- مشکل اور دقیق مفاہیم جن کا سلجھا کر بیان کرنا نثر میں بھی اکثر دشوار ہو جاتا ہے ان کے یہاں بڑی خوبصورتی سے نظم ہو جاتے ہیں اور مطلب واضح ہو جاتا ہے ان کے یہاں بڑی خوبصورتی سے نظم ہو جاتے ہیں اور مطلب واضح ہو جاتا ہے بلکہ ایسے اشعار زیادہ پُر کیف و وجد آفریں ہوتے ہیں

۱۲ - فارسی و عربی کے مقابلہ میں اپنی زبان کے الفاظ سے زیادہ کام لیا ہے اس کی زبردست مثال ایک مکمل دیوان سریلی بانسری کے نام سے موجود ہے۔ جس میں کوئی لفظ ایسا نہیں جسے اردو کے علاوہ کسی اور زبان کا کہہ

سکیں۔ سریلی بانسری کا ایک نسخہ کمترین کے ذاتی کتب خانے میں محفوظ ہے
اس سے چند اشعار ناظرین کے تفنن طبع کیلئے نقل کئے جاتے ہیں سو

خالص اُردو

جس نے نبادی بانسری گیت اُسی کے گائے جا
سانس جہاں تک آئے جائے ایک ہی دُھن بجائے جا

مان لی کس نے اپنی ہار بڑھ کے تھکن تبائے گی
بیں یونہی تڑپے جاؤں گا تو یونہیں مسکرائے جا

سب کی منتیں پلٹ گیئں سنکیں بندھی ہوئی ہوائیں
جی ہی نہیں اُداس اُداس کرتا ہی بن بھی سایں سایں

ہوگئیں کیاریاں ہری جیسے کہ رت پلٹ چلی
کون یہ مسکرا دیا ہنسنے لگی گلی گلی

کس نے بھیگے بالوں سے یہ جھٹکا پانی
جھوم کر آئی گھٹا ٹوٹ کے برسا پانی

یہ نیا دہی آنسو ہیں جو پی جاتے تھے
آرزو لو وہ کھلا بھید وہ پھوٹا پانی

اب غزلوں کے چند اشعار ملاحظہ فرمایئے سہ

رہنے دو تسلی تم اپنی دُکھ جھیل چکے دل ٹوٹ گیا
اب ہاتھ ملے سے ہوتا ہی کیا جب ہاتھ سے ناوک چھوٹ گیا

کس نے ٹپکا ہاتھ سے ساغر موسم کی بے کیفی پہ
اتنا برسا ٹوٹ کے بادل ڈوب چلا مینجانہ بھی

تلوار اٹھائی بچھر کہہ دی ابرو پہ بل آیا لب پہ ہنسی
بس دیکھ لی یہ ٹھنڈی گرمی جلاد بنی اور ڈرنے پر

تر سی نظر اللہ بچائے ڈالتی ہو پتھر میں لکیر

دل کا اشارہ جس کی طرف تھا پہیج سے جھکا جام ادا ہی

پھٹے دامن میں شرح حال چشم خوں فشاں رکھ دی

ورق تھا ایک جس پر لکھ کر ساری داستاں رکھ دی

جرم ابوالحسن نام جرم تخلص۔ ان کا شمار آرزو لکھنوی کے مایہ ناز تلامذہ میں ہوتا ہے ان کی خدمات شاگردان آرزو میں جن کا تعلق کسی حیثیت سے بھی کلکتہ سے رہا سب سے زیادہ قابل قدر اور تحسین آمیز ہیں۔

۴ر فروری ۱۹۰۳ء کو اعظم گڈھ کے مردم خیز قصبہ محمد آباد میں پیدا ہوئے۔ فارسی کی تکمیل حکیم زوار حسین، مولانا سید محمد ہارون فرنگی پوری کی خدمت میں ہوئی عربی شروع ہی کی تھی کہ فرنگی پور ضلع غازی پور سے محمد آباد آنا پڑا یہاں آکر ریاضی کے شوق میں مڈل اسکول کا امتحان دیا اور وہیں ہندی بھی پڑھی انگریزی اسکول میں داخلہ کی نوبت جب آئی تو باپ کا سایہ سر سے اٹھ گیا۔ گھریلو ذمہ داریوں نے سفر پر مجبور کیا تلاش معاش میں کلکتہ پہنچے یہاں کی خاک ایسی دامن گیر ہوئی کہ یہیں کے ہو رہے۔

مزاج میں سادگی اور انکساری بدرجۂ اتم موجود ہے جس کا ترجمان خود ان کا یہ شعر ہے۔

زمیں کی طرح جب حاصل ہے قدرت بردباری کی
رہوں سا گردش میں کیوں اے جرم ناحق آسماں بن کر

نظم و نثر دونوں میدان میں یکساں دستگاہ رکھتے ہیں۔ دس ہزار کا نوٹ، انجان رشتہ دار، ٹائم پیس، کھانسی وغیرہ، افسانے نظام ہفتہ وار

کلکتہ و بمبئی (حال لاہور) میں شائع ہوکر خراج تحسین حاصل کر چکے ہیں۔ عرصہ تک ادارۂ نظام سے بھی وابستہ رہے ہیں۔ مثنوی اور ڈرامے بھی لکھے۔ بنگلہ زبان بھی سیکھی یہی ہفتہ وار عبرت اور شعلہ کلکتہ انھیں کی سرپرستی میں جاری ہوئے، غزل، رباعی، قصیدہ مرثیہ، مسدس، مخمس، مستزاد، وغیرہ ہر صنف سخن میں طبع آزمائی فرمائی ہے۔ دس سال کی عمر سے شعر کہتے ہیں، سب سے پہلا شعر جو موزوں کیا وہ یہ ہے ؎

چار سو عالم میں ہے چرچا رسول اللہ کا
پڑھ رہی ہیں بلبلیں کلمہ رسول اللہ کا

شروع میں خواجہ تابش فاروق احمد سامری پھر ریاض خیرآبادی سے استفادہ کیا۔ ان کے بعد آرزو کے آگے باقاعدہ زانوئے تلمیذ تہہ کیا۔ کلام میں جہاں استاد کی پیروی کی ہے معلوم ہوتا ہے، آرزو بول رہے ہیں۔ بایں ہمہ ان کا کلام جدید و قدیم رنگ کا نہایت حسین و لطیف امتزاج ہوتا ہے۔ طرز تحریر کا کچھ ایسا خاص رنگ ہے کہ ایک حلقہ میں ترقی پسند اور دوسرے میں رجعت پسند کے نام سے بدنام ہیں۔ آرزو کے رنگ میں چند اشعار سنیئے ؎

ساقی تیرے فیض کے صدقے جتنے پینے والے ہیں
ہوش کی باتیں سب کرتے ہیں کہنے کو متوالے ہیں
تیری گلی کی دھن میں جو نکلے اس کو اتنا ہوش کہاں
راہ میں کتنے کانٹے بچھے ہیں پاؤں میں کتنے چھالے ہیں

اس کے علاوہ ایک اور مخصوص رنگ ہے یعنی سیاسی ماحول کے تاثرات کو غزل کے سانچے میں اس طرح ڈھالنا کہ غزل پندنامہ نہ ہوجائے ملاحظہ فرمایئے۔ ؎

منھ دیکھنے کا وقت نہیں، ڈوبتی ہے ناؤ
تم ناخدا بنو تو سہی جو خدا کرے

ہزار پہلو تھے حاجتوں کے کہیں سے کھل جاتی اصلیت بھی
ہمیں تو اس حسن ظن نے مارا بھلا وہ ہم سے دغا کریں گے

چمن کی دنیا میں خار جیسں کو ملے گا جبتک نہ حق نصرت
ہمیشہ بجلی گرا کرے گی ہمیشہ فتنے اٹھا کریں گے

جرم محمد آبادی کے محاسن کلام پر تبصرہ کرنے کے لئے مستقل ایک کتاب کی ضرورت ہے لہذا مندرجہ بالا اشعار پر اکتفا کرتا ہوں

جرم، دبستان آرزو کے بانی اور صدر ہیں۔ یہ وہ ادبی انجمن ہے جسکے تحت فن معلومات اور زبان وادب کی تحقیق واصلاح کا کام سرانجام پا رہا ہے

تلامذہ جرم کی فہرست حسب ذیل ہے۔

نازش نام شہادت حسین، تخلص نازش، مقام ولادت سکندرپور۔ اوئل عمر سے کلکتہ میں قیام ہے۔ ۱۹۲۹ء میں جرم کے حلقۂ تلامذہ میں داخل ہوئے طبیعت میں بلا کی روانی ہے سو

شکست دل سے دنیا آشنائے راز ہوتی ہے
ادھر شیشہ کھنکتا ہے اُدھر آواز ہوتی ہے

سوز نام عبدالحق۔ عمر اٹھائیس سال ہے

یہ کہہ کر چارہ گر نے مار ڈالا
علاج اضطراب دل نہیں ہے

ان کے علاوہ گہر محمد آبادی، سحر برآمدپوری بی اے، انجم اعظمی۔ شیدا رام پوری، شیدا مظفرپوری، ثمر خضرپوری، رشید بنارسی، خیر مظفرپوری

ممتاز گونڈوی، سحر سہسرامی، ناز غازی پوری، شیدا خیر آبادی، شمیم خضر پوری، صبر خضر پوری، احسن دریا آبادی، احقر اعظمی، منظر سلیم آبادی ایم۔ اے وغیرہ قابلِ ذکر ہیں اور کلکتہ میں مقیم ہیں۔

پرتو سید اظہر حسین نقوی نام اور پرتو تخلص ہے ۱۳۲۶ھ مطابق ۱۹۰۸ء بمقام لکھنؤ ولادت ہوئی۔ آرزو کے ممتاز شاگردوں میں ہیں۔ چودہ سال کی عمر میں ایک صاحب کی زبانی آرزو کا ایک شعر سنا ؎

تری نظر اللہ بچائے ڈالتی ہے پتھر میں لکیر
دل کا اشارہ جس کی طرف تھا سچ سمجھ کا جام ہی

اس شعر نے ایسا اثر کیا کہ فوراً آرزو کی خدمت میں حاضر ہو کر شرف تلمذ حاصل کیا۔ فن وزبان کے اکثر وبیشتر باریک درقیق نکتوں سے اچھی طرح واقف ہیں۔ فن عروض پر مہارت ہے۔ استاد کی زندگی ہی میں نہ صرف فارغ الاصلاح ہو گئے ان کے اکثر شاگردوں کی اصلاح کا کام ان کے سپرد رہا۔

۱۹۴۱ء میں کلکتہ سے ایک ہفتہ وار جریدہ "نظام" زیر سرپرستی آرزو لکھنوی جاری ہوا تو اس کی ادارت انہیں کے سپرد ہوئی۔ دسمبر ۱۹۴۳ء میں جب جاپان نے کلکتہ پر بمباری کی تو نظام بمبئی منتقل ہو گیا۔ اور اس کے ساتھ پرتو بھی بمبئی چلے گئے۔ وہاں فلمی دنیا سے وابستہ ہو گئے۔ چنانچہ "بھائی جان" اور "شاہکار" نامی فلموں کیلئے منظر نگاری، مکالمہ نویسی، اور نغمہ نگاری کے فرائض انجام دیے ان تصویروں کا ادبی حصہ ملک بھر میں معیاری تسلیم کیا گیا۔

انداز بیان میں کہیں استاد کی روشِ خاص کی جھلک نظر آتی ہے کلام فنی عیوب سے پاک اور ابتدائی وسوقیت سے بلند ہوتا ہے۔ طبع زاد قصیدوں میں بالعموم سخت زمینیں اختیار کی ہیں جنہیں پانی کی طرح بہا دیا ہے قدما کی

روش کے خلاف قصیدے کو مختصر کیا لیکن لوازم قصیدہ کی پوری پابندی کی۔
نمونتہً ایک قصیدے کی تمہید ملاحظہ ہو ؎

دل کا شیشہ غمِ دنیا سے کیونکر ٹوٹے
عقل کے کوہ تک اس چوٹ سے اکثر ٹوٹے

باغِ عالم میں زوال آتا ہے اچھوں ہی پر
خار گلبن میں رہے اور گلِ تر ٹوٹے

کم سے کم جوہری بنتا ہے ارسطوئے زماں
قول سے جس کے فقط عزمِ سکندر ٹوٹے

دستِ تحقیق تو کوتاہ تعلّی ہے بلند
جتنے تارے فلک کے سرِ منبر ٹوٹے

ارمؔ

نام شہنشاہ حسین، تخلص ارمؔ، آزردؔ کے ایسے شاگردوں میں ہیں جن پر انہیں ناز تھا۔ انگریزی اور فارسی میں ایم۔ اے ہیں۔ حلیۂ گفتگو اور ہر انداز شاعرانہ ہے، آج کل ریڈیو پاکستان کراچی سے منسلک ہیں۔ ایک غزل سنیے ؎

جس طرف اب نگاہ ہوتی ہے — تیری ہی جلوہ گاہ ہوتی ہے
گریۂ بیکسی کا پرساں کون — ہاں شبِ غم گواہ ہوتی ہے
حسن کی ایک بے گناہ نظر — بانیِ صد گناہ ہوتی ہے
غیر کے نقشِ پا کو کیوں دیکھیں — راہ پھر اپنی راہ ہوتی ہے
مسکرا دے کوئی جھٹک کر ہاتھ — یہ کشش بے پناہ ہوتی ہے

چوٹ دل کی ابھر رہی ہے ارمؔ
پھر چمک گاہ گاہ ہوتی ہے

نواب محمد رفیق نام، نواب تخلص وطن دہلی۔ سن پیدائش ۱۹۱۲ء کلکتہ میں پندرہ برس سے قیام ہے۔ کلام میں پختگی اور طبیعت میں روانی ہے۔ ادب اردو کی خدمت کے سلسلہ میں اپنی جائے قیام پر "اردو مجلس" کی بنیاد رکھی جس کے سرپرست علامہ آرزو اور وحشت تھے۔ شہر کے تمام چوٹی کے شعراء اس انجمن کے ممبر تھے، کلکتہ کی ادبی محفلوں میں انہیں ممتاز جگہ دی جاتی ہے۔ طبیعت میں انکساری اور تواضع ہے مرنجان مرنج قسم کے آدمی ہیں۔ ادبی دنیا میں ان کا شمار کہنہ مشقوں میں ہوتا ہے۔

ساز حیات میں اگر سوز کی چاشنی نہیں
عشق کی اصطلاح میں موت ہے، زندگی نہیں

یہاں تک حسن کے جلووں سے دل معمور ہو جائے
کرن جو پھوٹ کر نکلے چراغ طور ہو جائے

کتنے ارمانوں کا خون تھا یہ نہ دیکھا ایک نے
چند قطرے سب نے دیکھے جو گرے تھے جام سے

جی چاہتا ہے توڑ کے ہر بندش مجاز
اپنی جبیں میں رکھ لوں ترے سنگ در کو میں

مضطر لکھنوی، حفیظ گیاوی، دلی دہلوی انکے قابل ذکر شاگرد ہیں۔

سراج نام سراج احمد، تخلص سراج، علی آباد ضلع سلطان پور اودھ سے کلکتہ آئے اور عمر کا زیادہ حصہ یہیں بسر ہوا۔ اس وقت ان کی عمر ۵۰ سال کی ہو گی۔

۱۹۳۰ء میں جرم محمد آبادی سے ملاقات ہوئی شعر و شاعری کا ذوق موصوف کی صحبتوں میں پیدا ہوا ہے۔ جرم کے شاگرد بھی ہیں اور دوست بھی

جرم نے بعد میں آرزو کے سپرد کردیا۔ طبیعت میں رنگینی اور کلام میں پختگی ہے۔

ہتھکڑی کھل کے نہ گر جائے تو میرا ذمہ
تم ذرا کہہ کے تو دیکھو کہ بہار آئی

اُسی زمانے سے لہرا رہا ہے شعار عشق
وہ شمع ڈھونڈ رہے تھے جب انجمن کیلئے

عشق کی تاریک راہوں کا اجالا بن گئے
جذب کر کے یوں اُٹھے جلوے تری محفل سے ہم

ناوک

سید محمد ناوک لکھنوی آرزو کے قدیم شاگردوں میں ہیں۔ بنگال میں اردو ادب کی جو خدمت انجام دی ہے وہ قابل قدر ہے۔ عمر ۶۵ سال، فوٹوگرافی کی تجارت کرتے ہیں۔ کلام میں صفائی، پختگی اور برجستگی عمر کے لحاظ سے بدرجہ اتم موجود ہے۔

مصیبت اپنی تماشہ ہے اہل گلشن کو
کوئی بجھاتا نہیں آگ آشیانے کی

جانچ کر عشق کی کسوٹی پر
آپنے دل بنا دیا دل کو

مدبھری آنکھوں میں کو بن ہوئی جاتے ہیں غرق
اب ہنسی روک چھلکتے ہوئے پیمانے کی

فرشتے بھی آئیں تو جانے نہ پائیں
سلامت نکل کر تمھاری گلی سے

کلیم

شبیر حسین نام، کلیم تخلص، فیض آباد کے دیہات سیبار کے رہنے

والے ہیں۔ کلکتہ میں عرصہ سے مستقل قیام ہے۔ عمر کوئی ۳۵ - ۴۰ کے درمیان۔

سراپا عشق ہو جانے پہ دل محوِ فغاں کیوں ہو
جہاں شعلہ ہی شعلہ ہو وہاں پیدا دھواں کیوں ہو
بلا سے شیشہ ٹوٹا ان کا غصہ تو ہوا دھیما
وہی دل کام ہے جو کسی کے کام آجائے

منیر

دنیائے ادب میں منیر لکھنوی کے نام سے مشہور ہیں۔ بچپن سے آج تک کلکتہ میں قیام پذیر ہیں۔ آرزو لکھنوی کے خلفِ اصغر۔ عمر کوئی ۳۵ سال نیو تھیٹرز کمپنی کلکتہ میں مکالمہ نویس ہیں۔ طبیعت میں بے پناہ موزونیت اور غضب کی روانی ہے۔

رنگیں ہے شعلہ الفت کا یہ ناز اٹھانا کیا جانے
جو آگ لگاتا پھرتا ہو وہ آگ بجھانا کیا جانے
الزام جفا، جھوٹی تہمت، خود حسن پرست ہے پروانہ
معصوم ہے فطرت شعلے کی وہ غریب جلانا کیا جانے
بس چنگ و رباب کو چھیڑا کرے اور میٹھے سُروں میں ڈوبا رہے
جو عیش کا نغمہ گاتا ہو وہ غم کا ترانہ کیا جانے

لائق

مطیع الرحمٰن لائق دہلوی، نواب دہلوی کے چھوٹے بھائی ہیں۔ آرزو سے اکتساب فن کیا۔

کیا قہر ہیں نظام محبت کی بندشیں
دل میں ہو راز اور زبان راز داں نہ ہو

ان کے علاوہ ابراہیم ہوش، انجم کلکتوی مرحوم اور طور سہسرامی مرحوم بھی ان کے مشہور شاگردوں میں شمار کئے جاتے ہیں۔ اول و ثانی الذکر کے تذکرے "عصر حاضر" کے باب میں شریک اشاعت ہیں۔ آخر الذکر کے سوانح و کلام عدم دستیابی کے باعث پیش نہ کئے جا سکے۔

بنگال کے ہندو ادیب

تمہید تاریخ شاہد ہے کہ برصغیر ہند و پاک میں بسنے والی قوموں کے میل جول اور ربط و ارتباط سے اُردو زبان کی بنیاد پڑی اور ہندو مسلم اتحاد کی گود میں پروان چڑھی۔ یہ نہ صرف مسلمانوں کی ملکیت ہے۔ نہ ہندوؤں کی۔ بلکہ اس کی ترقی و ترویج اور توسیع و اشاعت میں دونوں بڑی قوموں کا مساوی حصہ رہا ہے۔ انھوں نے ہندو مسلم اتحاد، رسم و رواج اور مذاہب و عقائد کے موضوعات کو مرکز فکر قرار دیکر جس خلوص، احترام و محبت کے ساتھ خامہ فرسائی کی ہے وہ قابل رشک اور ایک دوسرے کے دیرینہ تعلقات کا آئینہ دار ہے۔ ماہنامہ "ادبی دنیا" لاہور فروری سنہ ۱۹۴۲ء میں ڈاکٹر تاراچند

اپنے ایک مقالہ میں رقم طراز ہیں ۔

" انیسویں صدی کے آخر تک بہت سے ہندو اُردو کو خالص اپنی زبان مانتے تھے ہندو شعراء اور نثر لکھنے والے اُردو کو اظہار خیال کا ذریعہ بناتے تھے ۔

زبان اُردو میں ہندوؤں کی خدمات کی داستانیں متعدد عنوانات کے رسائل وجرائد و اخبارات کی زینت بنتے رہے ہیں ہندو اہل قلم کے تذکرے بھی مختلف کتابوں[ا] کی شکل میں شائع ہو چکے ہیں بمقام افسوس ہے کہ سرزمین بنگال میں ہندوؤں نے اُردو ادب کی جو قابل قدر خدمات انجام دی ہیں ادب اردو میں ان کا تذکرہ خال خال ہے ۔

اٹھارویں صدی عیسوی میں فورٹ ولیم کالج کلکتہ کے مصنفوں میں مسلم اور غیر مسلم دونوں شامل تھے ۔ چنانچہ میر عطا حسین تحسین میر امن دہلوی ۔ حیدر بخش حیدری ، شیر علی افسوس ، میر بہادر حسینی ، کاظم علی جوان وغیرہ کے دوش بدوش قابل قدر ہندو ادیبوں اور شاعروں کے نام بھی نمایاں نظر آتے ہیں ۔

نہال چند

لاہور کے رہنے والے تھے ۱۲۱۷ھ میں کلکتہ گئے ۔ اور وہ ہیں کے ہو رہے ۱۸۰۳ء میں تاج الملوک ، اور گل بکاولی کی داستان عشق کو سب سے پہلے نثر میں موسوم بہ مذہب عشق ، پیش کیا ۔ گل بکاولی اصل میں شیخ عزت اللہ بنگ کے فارسی قصہ کا اُردو ترجمہ ہے ۔ یہ کہانی اس قدر مقبول ہوئی کہ کئی بار ڈراموں کی شکل میں اسٹیج اور اسکرین کے ذریعہ خراج تحسین حاصل کر چکی ہے کئی زبانوں میں اس قصہ کا ترجمہ بھی ہوا ۔ ایان نامی شخص نے

[ا] ناظم سیوہاروی کی ایک کتاب " اردو زبان اور ہندو " راقم الحروف کی نظر سے گذری جس میں دو چار بنگالی ہندو ادیبوں کے تذکرے ملتے ہیں

سے اس کا اردو منظوم، ترجمہ اردو مثنوی میں تحفۃ المجالس کے نام سے ترجمہ کیا۔ اس سے بھی قبل ۱۰۳۵ھ کی دکنی زبان میں اس کا نسخہ ملتا ہے۔

نمونۂ نثر:

"اشرف البلاد کلکتہ میں آب و خورش کھینچ کر لائی اور یہ خاکسار کپتان وارٹ صاحب بہادر کی خدمت میں سابق سے بندگی رکھتا تھا۔ ان کی دستگیری سے صاحب گلگرائسٹ بہادر مدظلہ کے دامن دولت تک دسترس پایا۔

بینی نرائن نام بینی نرائن اور تخلص جہاں "دیوان جہاں" کے مصنف ۱۸۱۲ء میں کپتان روبک سکریٹری فورٹ ولیم کالج کے حکم سے اپنے عہد کے ہندوستانی شعراء کا ایک تذکرہ لکھا۔ ایک فارسی قصہ کا ترجمہ موسوم بہ "چار گلشن" کیا جس میں بادشاہ کیوان اور فرخندہ کا ذکر ہے۔ ۱۸۱۶ء میں جب کپتان ٹیلر نے اسے دیکھا تو بہت پسند کیا اور انعام عطا کیا گارساں دی تاسی کی تحقیق ہے کہ شاہ رفیع الدین کی تنبیہہ الغافلین کا بھی ترجمہ اردو میں ۱۸۲۹ء میں کیا۔ بینی نرائن مسلمان ہو گئے تھے اور مولانا سید احمد بریلوی سے بیعت کر لی تھی[1]

سری لال گجراتی نے پرانی بھاشا کو اردو کے نئے روپ میں پیش کیا۔ بے شمار کتابیں اردو میں لکھیں۔ پریم ساگر، مرائج مفتی، لطائف ہندی، کشن جی، وغیرہ کو اردو ادب سے روشناس کرانے سہرا انھیں کے سر ہے[2]

لالہ سداسکھ لال کی ایک کتاب مجموعۂ قوانین، ۱۸۳۴ء میں اور

---

[1] تاریخ ادب اردو صفحہ ۱۸ ضمیمہ [2] گل رعنا

دوسری "گنگا کی لہر" ۱۸۵۷ء میں کلکتہ سے چھپکر شائع ہوئیں۔ اول الذکر ان کی تالیف ہے اور آخر الذکر انگریزی زبان سے ترجمہ جو علم زراعت سے متعلق ایک انگریز نے لکھی تھی۔

ہیتم چندر نے ۱۸۳۷ء میں گل صنوبر کو اردو لباس سے آراستہ کیا متذکرۂ بالا ادیبوں کے علاوہ فورٹ ولیم کالج کے ہند واہل علم وقلم کی فہرست حسب ذیل ہے۔

نام مصنف	تصنیف	سن اشاعت	نام مصنف	تصنیف	سن اشاعت
لالہ دھرم نرائن	اصول انتظام مدن	۱۸۴۶ء	ستیل پرشاد	مراۃ العلوم	۱۸۴۷ء
کالی رائے	کھیت کرم (فن زراعت سے متعلق)	،،	ہری دامن لعل	علم طبعیات	۱۸۴۹ء
			پنڈت موتی لال	پندنامۂ کاشتکاری	۱۸۵۲ء
پنڈت رامچندر	اصول علم ہیئت قانون الطباع	۱۸۴۷ء	منی بھولاناتھ	خلاصۃ الفصائح	۱۸۵۵ء
			دیوی پرشاد	قواعد اردو	؟
روپ نرائن	جغرافیہ ہند	؟			

نبوکرشنا مہاراجہ نبوکرشنا دیب (بہادر) ایسٹ انڈیا کمپنی کے ایجنٹوں میں تھے۔ لارڈ کلایو کے دیوان اور وارن ہسٹنگز کے میر منشی تھے۔ آخری عمر میں شاہی دربار سے بھی وابستہ ہوگئے تھے اپنے زمانے کے بہت مشہور ادیب اور پُرگو شاعر تھے۔ ان کی اولاد میں کئی نامی گرامی شاعر گذرے ہیں

راج کرشنا راجہ راج کرشنا دیب (بہادر) تخلص راج کرتے تھے۔ مہاراجہ نبوکرشنا دیب کے خلف اکبر تھے۔

باپ کی طرح وہ شاہی دربار سے منسلک رہے فارسی اور اُردو میں اچھی استعداد تھی شعر و شاعری کا ستھرا مذاق رکھتے تھے۔ نیش کے شاگرد تھے معظم شاہ کی توصیف اُردو میں ایک نظم کہی تھی جو اتنی مقبول ہوئی کہ دنیا کے بڑے بڑے کتب خانوں مثلاً ایشیاٹک سوسائٹی کلکتہ پیرس کے سرکاری کتب خانہ اور برلن یونیورسٹی لائبریری کی زینت بنی۔ نظموں کے علاوہ غزلوں کا سرمایہ بھی اچھا خاصا ہے ان کی کلیات پانچ جلدوں میں چھپی۔ ان کا یہ شعر زبان زد عام ہے سہ

گر شب کو نہ تم پاس مرے آؤ گے صاحب — تو مجھ کو سحر تک نہ یہاں پاؤ گے صاحب

کنور نام راجہ اپرنوپ کالی کرشنا۔ تخلص کنور۔ سن پیدائش ۱۸۰۷ء راجہ راج کرشنا دیب کے بیٹے تھے۔ اپنے خاندان کے سب سے پہلے شاعر ہیں جنھوں نے انگریزی ادب پاروں کو اُردو جامہ پہنایا مشہور شاعر "گے" (GAY) کی کہانیوں (FABRADE GAY) کا ترجمہ اُردو زبان میں احسن المواعظ، کے نام سے کیا۔ مسلمان بادشاہان ہند کا شاہنامہ، ان کا غیر فانی و قابل قدر کارنامہ ہے۔ متعدد تالیفات و تصنیفات انکی یادگار ہیں۔ ایک دیوان اور ایک تالیف "مجموعۂ لطائف اُردو" مشہور ہیں۔ زبان اُردو کی نشر و اشاعت کی غرض سے ایک ہفت روزہ رسالہ نظام شمسی، ۱۸۳۰ء میں جاری کیا تھا۔

شفیق راجہ جاذب کرشنا دیب تخلص بہ شفیق راج خاندان کے مشہور شاعر، عبدالغفور خاں نساخ کے ہمعصروں اور محرزدں کے شاگرد عزیز تھے۔ شفیق کے دو شعر ہیں سہ

خفتگان خاک ہیں قربان اسی رفتار پر — ہے قیامت کا گماں سب کو قد دلدار پر

نیند تو آتی نہیں جو خواب میں دیکھوں اُسے
حیف آتا ہے مجھے اس دیدۂ بیدار پر

کشن بابو کرشنا چندر گھوش کشن مہاراجہ نو کرشنا دیب کے نواسوں میں اچھے شاعر تھے۔

ارمان راجہ جیجوتی منز ارمان چور بگان کلکتہ کے راجہ فیملی کے چشم و چراغ تھے۔ شرف تلمذ ضیغم سے تھا۔ انھوں نے سب سے پہلے 'گرے' کی نظموں کا اردو ترجمہ کیا۔ صاحب دیوان تھے۔ ان کا یہ مطلع بہت مشہور ہے

کام اپنا نہ کبھی تجھ سے مری جان نکلا
تن سے جاں نکلی مگر دل سے نہ ارمان نکلا

شعرائے اردو کا ایک تذکرہ موسوم بہ نسخہ 'دلکشا' ان کی ادبی شخصیت کو زندہ رکھنے کے لئے کافی ہے۔ اس کی پہلی جلد ۱۸۷۰ء میں شائع ہوئی تھی۔ گارساں دی تاسی کی غیر فانی کتاب "تاریخ ادبیات ہندوستانی" کی دو جلدیں اس سے قبل شائع ہو چکی تھیں اور آخری جلد بھی مطبع کو بھیجدی گئی تھی۔ اگر ارمان کا نسخہ دلکشا، اس سے قبل شائع ہو چکا ہوتا تو دتاسی یقیناً اپنی کتاب میں اور بعض نئی اور مفید چیزوں کا اضافہ کر سکتا تھا لیکن بہرحال دتاسی نے اتنا ضرور کیا کہ بطور ضمیمہ ان تمام شعرا کی فہرست جن کا حال اس تذکرے میں ہے۔ داخل کتاب کر دی۔ یہ فہرست صفحہ ۲۵۵ سے صفحہ ۲۷۶ تک پھیلی ہوئی ہے "تاریخ ادبیات ہندوستانی" کی آخری جلد شائع ہونے پائی تھی کہ ارمان کا انتقال ہو گیا۔ بابو راجندر لال مترجو ارمان کے رشتہ دار تھے ادبیانہ مذاق رکھتے تھے انھوں نے ارمان کی دوسری جلد کا غیر مطبوعہ نسخہ دتاسی کے پاس بھیجدیا جس کا تعارف دتاسی نے اپنی کتاب کی جلد ثالث کے دیباچہ میں کر دیا ہے[1]

---

[1] نسخہ دلکشا اور دتاسی، از عبد الودود بیرسٹر ایٹ لا مطبوعہ جدید اردو ۱۹۴۱ء

ملک کلکتہ کے دوسرے کئی ہندو خاندانوں میں شاعروں نے جنم لیا۔ ان میں ملک خاندان ساکن جوڑا سانکھو کے جگناتھ پرشاد ملک (تخلص بھی ملک تھا) نے سب سے زیادہ شہرت حاصل کی۔ ملک باسط علی محوی کے تلمیذ رشید تھے۔

راؤ کانت راجہ راؤ کانت دیو بہادر، راجہ کالی کرشنا بہادر کے ہمعصر تھے اپنے عہد کے ہر دلعزیز لیڈر، مشہور مصنف اور زبردست اردو داں تھے۔ ایک ضخیم لغت جو سنسکرت اور ہندوستانی زبان میں ہے کے علاوہ فارسی درسی کتابیں ان کی تصانیف ہیں ان کی قابلیت اور ہر دلعزیزی کا اندازہ اس امر سے بخوبی ہو سکتا ہے کہ انھوں نے ۱۶ اپریل ۱۸۶۲ء میں بنگال کے گورنر سر جے پی. گرانٹ کی واپسی کے موقع پر بحیثیت صدر جلسہ انھوں نے نہایت پرمغز اور عالمانہ تقریر کی تھی۔ یہ تقریر اردو، بنگلہ اور انگریزی اخباروں میں چھپی اور بنگال سے لیکر یورپ تک خراج تحسین حاصل کی۔ اس جلسہ میں راجہ کالی کرشنا بہادر بھی شریک تھے۔ یہ تقریر کتابی شکل میں رائل ایشیاٹک سوسائٹی لندن اور کلکتہ میں موجود ہے (خطبات گارساں دی تاسی)

آگہ نام پنڈت جوالاناتھ تخلص آگہ، باپ کا نام وانارام برہمن کلکتہ کے باشندے تھے۔ ان کا ایک شعر ہے

جان جاتی ہے تڑپتا ہوں پڑا\
دیکھیے کیا ہو تماشا کیا ہے

رام موہن راجہ رام موہن رائے فرقہ برہمو سماج کے بانی اور اٹھارویں صدی کے مجددین میں سے تھے۔ بنگلہ اور انگریزی کی کئی کتابیں لکھیں پیرس

یں موسیو گارساں دی تاسی سے بھی ان کی ملاقات رہی اور رسم وراہ اتنی بڑھی کہ ۱۸۵۳ء میں کلکتہ واپس آکر اردو میں خط وکتابت کرتے رہے۔ ۱۸۵۳ء میں ایک اردو اور ایک انگریزی اخبار کے ایڈیٹر بھی رہے۔

طرب

جھنولال طرب اچھے مرثیہ گو تھے۔ ہندو مسلم اتحاد کے دل سے متمنی وخواہشمند دونوں قوموں کے رسم ورواج، معاشرت وتمدن، اور بزرگان مذہب سے متعلق بے شمار مرثیے کہے۔ حضرت کبریٰ رض۔ حضرت قاسم کے حال پر آنسو بہاتی ہیں۔ کتنا دلسوز منظر ہے ؎

آخر لعینوں نے جوانی ماٹی میں ملائی اسکی — کاٹی پہونچوں سے ہائے ہر اک کلائی اس کی
گھوڑے سے گرا اور گھر میں آواز جو آئی اسکی — یوں روتا لاش پہ اس کی فرزند پیمبر آیا

قاسم دلہن کو تیرے ٹھور ہو نہ سٹھاؤں
ماٹی میں یوں مل گیو بر حسن کے ناؤں

گھوڑے پر لاشہ رکھ کر اس زخمی تیغ وسنا کا — خیمہ کی جانب اور وہ شبیر نے گھوڑا ہانکا
سہرے چولے سے اسدم بنڑی نے منہ اپنا ڈھانکا — دولہا کا لاشہ جس دم خیمہ کے اندر آیا

ہاتھ کی چوڑی پھوڑ کے نوچے امیٹھے کیس
منہ کو دھول لپیٹ کے کیا فقری بھیس

آج سے آٹھ دس سال قبل کلکتہ کے ایک بڑے علمی ادارہ مسلم انسٹی ٹیوٹ کے زیر اہتمام ایک نہایت معیاری انگریزی جریدہ "مسلم ریویو" شائع ہوتا تھا ہر قسم کے معیاری مضامین کے علاوہ ہند، ایران وعرب کے قدیم وجدید شعراء وادباء کے تذکرے بھی اکثر شائع ہوتے۔ اس کی فائلیں دیکھنے سے بنگال کے کئی اردو اور فارسی شعراء کا بھی انکشاف ہوتا ہے۔ بعض کا تعارف ذیل میں کرایا جاتا ہے

منھرا داس

شاہجہاں کے عہد کا بہت بڑا فارسی گو شاعر تھا۔ نثر ونظم کا

مجموعہ "منہر الامرا" اس کی شاعرانہ عظمت اور ادیبانہ صلاحیت کا مظہر ہے جب گورنر بنگال خاں زماں نے انھیں قید کردیا تو انھوں نے فارسی میں ایک نظم کہی جو اتنی پسند کی گئی کہ فوراً رہا کر دیئے گئے۔ اس نظم میں EMPERIAL CITY کے نام کا پیغام تھا جو حکیم رکن کاشی کی معرفت بھیجا گیا تھا۔

پروانہ جسونت سنگھ پروانہ نواب شجاع الدولہ (بنگال) کے دربار سے منسلک تھے ؎

ترڑپنے جو دیکھیں ہیں لاشیں تو دل اب
ترے کوچہ کو کربلا جانتا ہے

دل نام دیبی پرشاد۔ تخلص دلؔ۔ مرشد آباد کے رہنے والے تھے اور شاہ عالم کے عہد میں دہلی میں سکونت اختیار کرلی تھی ؎

امید وصل اس سے محبت تو رکھے ہے دل
جس سے کہ رسم نامہ و پیغام بھی نہ ہو

راجہ بینی بہادر راجہ متوطن بنگال۔ تاریخ وفات ۱۱۷۳ھ مطابق ۱۷۶۰ء یہ بھی شاہ عالم کے زمانے میں دہلی آگئے تھے اور درباری شاعروں میں درجۂ امتیاز حاصل تھا ؎

سیاہی مو کی گئی دل کی آرزو نہ گئی
ہمارے جامۂ کہنہ سے مے کی بو نہ گئی

موزوں نام مہاراجہ رام نرائن۔ تخلص موزوںؔ مرشد آباد کے باشندے

شیخ علی حزیںؔ کے زمرۂ تلامذہ میں شامل تھے۔ نواب سراج الدولہ کے دامن دولت سے بھی وابستہ رہے۔ ۱۱۷۰ھ میں وفات پائی۔ نمونۂ کلام سہ

ابر ہوگا تو خجالت سے ستی پانی پانی | مست مقابل ہو مرے دیدۂ خونبار کے ساتھ
غزالاں تم تو واقف ہو کہو مجنوں کے مرنے کی | دیوانہ مر گیا آخر تو ویرانے پہ کیا گذری

عصر حاضر کے ہندو شعراء میں منی لال جوانؔ، شیدا تلمیذ جرمؔ محمد آبادی، بابا لال دردؔ آصفی، مدن لال آبادؔ، بیدلؔ آصفی، لکشمی نرائن موجؔ آصفی آزادؔ، دوشی مظہری، شاگرد خورشید حسین کاوشؔ و رنگینؔ آج بھی اپنے اپنے طور پر اُردو زبان وادب کی خدمت میں مصروف ہیں۔ گو سب کا وطن بنگال نہیں۔ لیکن مدت سے وہاں سکونت پذیر ہیں سرزمین بنگال میں اپنی اپنی زندگی کا بیشتر حصہ گذار رہے ہیں۔

جوانؔ مندرجہ بالا شعراء میں منی لال جوانؔ سب سے زیادہ کہنہ مشق اور قادر الکلام شاعر ہیں۔ عمر تقریباً ۵۵۔ ۶۰ کے لگ بھگ ہوگی۔ کلکتہ میں تیس سال سے مقیم ہیں۔ آرزوؔ لکھنوی جیسے یکتائے روزگار استاد سے شرف تلمذ حاصل ہے۔ کلکتہ کی دنیائے شاعری میں خاص مقام رکھتے ہیں ان کا کلام ہفتہ وار نظام، جدید اردو کلکتہ اور دیگر اخبارات و رسائل میں برابر شائع ہوتا رہا ہے ہیں۔ غیر معمولی صلاحیتوں کے باوجود انھیں وہ شہرت حاصل نہ ہو سکی جس کے وہ مستحق ہیں۔ نمونۂ کلام یہ ہے سہ

یہ خون دل منتقل ہوا ہے پسینے سی تر جبیں نہیں ہے
بدل کے کروٹ بہا ہے دریا کہیں ہے پانی کہیں نہیں ہے

سرفروشانِ محبت باز آ سکتے نہیں | روکتا ہوگا انھیں کو ہاتھ قتلِ عام سے

پامالِ جبرِ ازل سے دلِ ناصبور ہے — اک آئینہ ہے پاس مگر چور چور ہے
امتحاں پہ وہ نگاہِ ناز جب مائل ہوئی — کائناتِ دو جہاں سمٹی سمٹ کر دل ہوئی
آب رکھتا ہو تو کیا جب کام آسکتا نہیں — تشنہ لب کی پیاس آئینہ بجھا سکتا نہیں
کس طرح کشتی امید و بیم کی حد سے بڑھے — جتنی دھارے میں ہے کشتی اتنی ہی ساحل میں ہے؟

جائیے جائیے لیجائیے دیدار کا جام
پینے والا نہ رہا جب تو دوا کیا ہوگی

جواں کا مجموعۂ کلام غیر مطبوعہ ہے ان کے چشمۂ فیض سے جو جواں سال شعراء فیضیاب ہوئے ان میں شیدا، کامل، عشرت، رحیم قابل ذکر ہیں۔

افسوس کہ ہندوستان کے ساتھ ساتھ بنگال کا بھی بٹوارہ ہو گیا لیکن اردو زبان و ادب کا اس تقسیم سے کوئی واسطہ نہیں۔ رائٹ آنریبل سر تیج بہادر سپرو کے حسب ذیل الفاظ نہ صرف قابل احترام بلکہ تاریخ اردو ادب میں سنہرے حرفوں سے لکھے جانے کے لائق ہیں۔

"اردو ہندو مسلمانوں کو اپنے آبا و اجداد سے ایک مشترکہ و مقدس ترکہ کی حیثیت سے ملی ہے جو قطعاً ناقابل تقسیم ہے۔"[1]

۱؎ "ہماری زبان" دہلی یکم مئی ۱۹۴۵ء

بنگال کی اہل قلم خواتین

تمہید بنگال میں اُردو کی ترقی وترویج اور توسیع واشاعت کے سلسلہ میں صرف ارباب علم وفضل ہی نہیں بلکہ طبقہ نسواں کا بھی قابل قدر حصہ رہا ہے۔ انکی خدمات بھی کسی طرح فراموش نہیں کی جاسکتیں۔ یوں تو چند صدی پیشتر مرشد آباد اور ڈھاکہ کے نواب خاندانوں میں بہت سی نامور ادیبہ اور خوش فکر شاعرہ گذری ہیں لیکن انکی شاعری یا انشاء پردازی کوئی افادی حیثیت نہیں رکھتی ان کے ہاں کوئی مستقل تصنیف یا کلام کا مکمل مجموعہ نہیں ملتا

لیکن انیسویں صدی سے آج تک بنگال نے جو اہل قلم خواتین پیدا کیں ان کا نام دنیائے ادب میں فخر ومباہات سے لیا جاسکتا ہے۔ ان کی ادبی سرگرمیاں اور کلام کا گرانقدر سرمایہ ہند وپاک کی مشہور اہل قلم خواتین کے مقابلے میں پیش کیا جاسکتا ہے۔

شرف النساء

ایسی خواتین میں انیسویں صدی کے اول نصف دور میں ایک خاتون کا پتہ چلتا ہے جن کا نام شرف النسا ہے وہ مرشد آباد کے نواب ناظموں کے دربار سے وابستہ تھیں۔ ان کی ایک عدیم المثال قلمی اردو مثنوی[۱] پروفیسر محفوظ الحق ایم اے مرحوم کے ذاتی کتب خانے میں محفوظ ہے۔ یہ مثنوی چار ہزار اشعار اور ۲۱۶ صفحات پر مشتمل ہے مولفہ کے حالات دستیاب نہ ہو سکے ان کا نام حسب ذیل اشعار سے معلوم ہوا ہے

پڑی ہیگی غلطی میں شرف النساء　　نظر تجھ کو اب تک نہ آیا خدا
خدا سے یہی ہے اسے التجا　　جو عاجز تیری ہے شرف النساء
تو کردے سخن کو مرے سر بلند　　سخن ہوئے میرا جہاں کو پسند

مثنوی میں نواب فریدوں خاں کی ماں (رئیس النساء بیگم) اور خود نواب کی تعریف میں بھی مستقل باب ملتا ہے جس سے پتہ چلتا ہے کہ یہ مثنوی نواب فریدوں جاہ اور رئیس النساء بیگم کی حیات میں تالیف ہوئی۔ نواب فریدوں جاہ ۱۸۳۸ء میں مرشد آباد کی مسند پر بیٹھے اور ۱۸۸۰ء تک حکمراں رہے۔ اس لئے یہ مثنوی انہیں دو سنوں کے درمیان لکھی گئی ہے۔

مولفہ اثنا عشری شیعہ ہیں۔ دوازدہ[۱۲] امام کی منقبت بڑے زور و شور سے لکھی ہے۔ حضرت علی کی منقبت میں کہتی ہیں ؎

---

[۱] راقم الحروف نے اسی نسخے اور پروفیسر محفوظ الحق مرحوم کے ایک مقالہ سے استفادہ کیا ہے

خدا کے پیارے محمدؐ کے یار علیؓ مرتضےٰ شاہ دُلدل سوار
ہوئی رحمت حق سب ان پر تمام خدا کے ولی اور ہمارے امام
یہ امت نہ ہو شاد کیوں کر تمام کہ ہوں پیشوا جن کے ایسے امام
خدا کا ہے ان پر درود و سلام ہوا پنجتن پاک جن کا کہ نام

مثنوی کے بعض اشعار سے معلوم ہوتا ہے کہ مولفہ نواب فریدوں جاہ کے محل میں ایک کنیز کی حیثیت رکھتی تھیں ؎

پھریگا یہ قصہ جو شہر و دیار سمجھیں گے سب احمق و ہوشیار
کہیں گے یہ ہے پھر تو اہل تمیز کہ خاوند تھے ایسے ہو ایسی کنیز

ایک جگہ نواب فریدوں کو "آقا" کے نام سے یاد کرتی ہیں۔

کہ نظم و نثر میں نہیں مجھ کو ڈھنگ مگر میرے "آقا" جو ہیں صوبہ بنگ

شرف النساء کا انداز بیان صاف، سادہ اور سلیس ہے روانی بھی ہے لیکن زبان کی غلطیاں بھی کافی ہیں۔ عربی الفاظ کی صحت کا خیال نہیں رکھا گیا ہے۔ جس طرح بولتی ہیں ویسا ہی لکھ دیتی ہیں بعض تشبیہیں نئی اور بہت اچھی ہیں کہیں کہیں زنانہ محاورات بھی آجاتے ہیں بعض جگہ فارسی کے اشعار بھی آگئے ہیں۔ مثلاً جس جگہ اپنی خامیوں کا ذکر کرتی اور پڑھنے والوں سے معذرت کی طالب ہوتی ہیں تو کہتی ہیں ؎

کہیں جبکہ سعدی سے دانش گزیں بساط سخن پردہ بالا نشین
تو گر پرنیانی نیابی مکوش کرم کار فرما و حشوم بپوش
تو پھر اس جگہ ہے زباں میری بند کریں اپنے الطاف دانش پسند

بہر حال مثنوی کے مصائب و محاسن کے متعلق بقول پروفیسر محفوظ الحق اتنا عرض

کردینا ضروری ہے کہ وہ ایک عورت کی تالیف ہے اور بنگال میں لکھی گئی ہے۔ لہذا خاص توجہ اور ستائش کی مستحق ہے۔

خجستہ اختر

کلکتہ کے سہروردی خاندان میں تعلیم وتربیت کا بہت اعلیٰ معیار رہا ہے۔ اس خاندان نہ صرف مولانا عبیداللہ عبیدی جیسے بلند پایہ شاعر، حسین شہید سہروردی جیسے شہرۂ آفاق مدبرو سیاست داں، بلکہ کئی خوش فکر شاعرات اور ممتاز ادیبوں کو بھی جنم دیا جن میں خجستہ اختر بانو سہروردی اور شائستہ اختر سہروردی غیر فانی شہرت کی مالک ہیں۔ ان کے اکثر جواہر پارے دونوں ملکوں کے مشہور رسائل میں شائع ہوکر ارباب ادب سے خراج تحسین حاصل کرتے رہے ہیں۔

خجستہ اختر بانو مولانا عبیداللہ عبیدی کی دختر نیک اختر، سرزاہد سہروردی مرحوم کی اہلیہ محترمہ حسن شاہد سہروردی اور حسین شہید سہروردی، سابق وزیر اعظم متحدہ بنگال اور موجودہ وزیر قانون حکومت پاکستان کی والدہ ماجدہ ڈاکٹر سر حسان سہروردی مرحوم اور سر عبداللہ سہروردی مرحوم کی ہمشیرہ تھیں

مولانا راشد الخیری مرحوم ومغفور کی مشہور تصانیف غم زندگی وصبح زندگی وغیرہ خصوصیت کے ساتھ خجستہ اختر کے زیر مطالعہ رہی شاید یہی وجہ ہے کہ مولانا مرحوم سے زیادہ متاثر تھیں۔ خجستہ کی کئی کتابیں چھپ چکی ہیں ان میں کوکب دری اور آئینہ عبرت " خاص طور پر قابل ذکر ہیں کوکب دری میں حضرت رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے حالات زندگی، عرب کے زمانہ جاہلیت کے واقعات اور میلاد النبی کے موقع پر پند ونصیحت کی

ٓ مولانا عبیداللہ عبیدی فارسی، اُردو عربی زبانوں کے نہایت اچھے شاعر، اُردو اور فارسی کے صاحب دیوان اور مفتاح الادب، مطبوعہ مفید عام پریس لاہور کے مصنف تھے، بنگال میں عبدالغفور نساخ کے ہمعصر تھے۔

مثالیں جس دل پذیر اور دلکش انداز میں قلمبند کی گئی ہیں وہ نہایت سبق آموز و معلومات افزا ہیں فارسی اور اُردو اشعار کے برمحل استعمال نے قارئین کی دلچسپی میں دو چند اضافہ کر دیا ہے بہلیاد کی ایسی جامع و مانع کتاب آج تک شائع نہیں ہوئی علامہ وحشت کلکتوی آرزو لکھنوی مرحوم ناطق لکھنوی مرحوم جیسے اہل نظر اور اساتذہ فن نے اس کتاب کی تصنیف پر تحسین آمیز کلمات لکھے ہیں

خجستہ اختر کی دوسری کتاب " آئینہ عبرت " نہایت شستہ و سلیس زبان میں لکھی گئی ہے اور پڑھنے سے تعلق رکھتی ہے ان کتابوں کی مقبولیت کا اندازہ اس امر سے ہوسکتا ہے کہ دونوں آج تک کلکتہ یونیورسٹی کے نصاب میں داخل ہیں اور وہاں کے ہر کتب خانے میں دستیاب ہیں ۔

شائستہ اختر

خجستہ اختر کی بھتیجی، سر حسان سہروردی مرحوم کی صاحبزادی اور پیرس کے سفیر پاکستان جناب اکرام اللہ صاحب کی اہلیہ محترمہ ہیں ۔

شائستہ اختر کا سن پیدائش ۱۹۲۵ء بمقام کلکتہ ہے ۔ کلکتہ یونیورسٹی کی ایم اے اور لندن یونیورسٹی کی پی ایچ ڈی (اُردو میں) ہیں ۔ اُردو اور انگریزی ادب سے اوائل عمر ہی سے دلچسپی رہی اور دونوں زبانوں میں لکھنے کی یکساں قدرت رکھتی ہیں چنانچہ انگریزی جرائد مثلاً کلکتہ سول اینڈ ملٹری گزٹ، ڈان کراچی اسٹیٹس مین کلکتہ ۔ ہندوستان ٹائمز کلکتہ وغیرہ اور اردو رسائل زیب النسا لاہور، حریم لکھنؤ، تہذیب نسواں ہمایوں لاہور، عصمت دہلی وغیرہ میں ان کے شہ پارے اکثر شائع ہوتے رہے " کوشش ناتمام " کے نام سے ایک افسانوں کا مجموعہ بھی شائع ہو چکا ہے ۔

انھوں نے علمی و ادبی مقالات کے علاوہ سیاست حاضرہ سے متعلق بھی بہت کچھ لکھا ہے ۔ شائستہ اختر اور خجستہ اختر، راحت آرا بیگم بنگال کی چند ایسی باوقار

قابل قدر خواتین میں سے ہیں جن کی خدمات رہتی دنیا تک فراموش نہیں کی جا سکتیں اور جن کی ذات پر بنگال کو ناز ہے اور بجا طور پر ناز ہے۔

رئیسی بیگم مولوی فضل الحق کی صاحبزادی ہیں خوش فکر شاعرہ اور بڑی اچھی انشاء پرداز ہیں۔ شائستہ اختر کی خالہ زاد بہن ہیں۔

صحیفہ بانو یادگار صحیفہ، مطبوعہ رزاقیہ پریس مدراس ۱۳۳۲ھ کی مصنفہ سلہٹ کی رہنے والی تھیں۔ شرف حج بیت اللہ سے مشرف ہو چکی تھیں بڑی متقی اور صوم و صلوٰۃ کی پابند بلند نفس خاتون تھیں شعر بھی کہتی تھیں اور نثر بھی لکھتی تھیں اور دونوں پر قادر تھیں۔

راحت آرا راحت آرا[1] بیگم خان بہادر محمد سراج الاسلام ایم۔اے۔ایل۔بنگال سول سروس کی اہلیہ محترمہ اور شمس العلماء کمال الدین احمد ایم اے آئی، ای، ایس کی صاحبزادی شمس العلماء ذوالفقار علی کی پوتی اور نواب بہادر عبداللطیف برادر حقیقی عبدالغفور خاں نساخ کی نواسی تھیں۔ سن پیدائش بمقام کلکتہ ستمبر ۱۹۱۰ء وفات ۲۱ اپریل ۱۹۴۹ء کلکتہ کی مشہور افسانہ نگار اور ممتاز ادیبہ تھیں۔ ان کا طرز تحریر عجیب دلکش اور دلآویز تھا اس کے متعلق سر تیج بہادر کی رائے ہے۔

"اردو ادب میں یہی طرز رائج ہو جائے گا"

افسانوں کے مجموعے پریمی بانسری کی آواز، شب کی پکار، بدو کی مٹی، دلنواز، انقلاب، غنچۂ افسانہ کے نام سے شائع ہو کر خراج تحسین کر چکے ہیں ان کے مضامین کی تعداد پچاس سے زائد ہیں۔ حسب ذیل رسائل میں عموماً ان کے مضامین شائع ہوا کرتے تھے،

---

[1] ماخوذ از بنگلہ کتاب، مندکالے کیتھے جا چھے، مصنفہ محبوب العالم

سہیل، عصمت، نیرنگ خیال، تہذیب نسواں وغیرہ۔ ٹیگور کا افسانہ "ڈاک گھر" کا بنگالی زبان سے براہ راست ترجمہ کیا مجموعۂ کلام دیوانِ راحت اور ناٹک رادھا کے نام سے منظر عام پر آچکے ہیں۔

حسن زہرہ

حسن زہرہ صاحبہ جو ڈھاکہ میں بیگم لقمان حیدر کے نام سے مشہور ہیں اس ادب نواز خاندان سے تعلق رکھتی ہیں جس نے اردو ادب کو سجاد حیدر یلدرم جیسا مختار ادیب اور قرۃ العین حیدر جیسی افسانہ نگار بخشیں سجاد حیدر یلدرم آپکے چچا اور قرۃ العین حیدر صاحبہ آپ کی چچازاد بہن ہیں۔ آپکے والد سید نثار حیدر زیدی جو خود بھی ایک اچھے نظم گو ہیں اور قیصر تخلص فرماتے ہیں ایک مدت تک یوپی کے مختلف اضلاع میں ڈپٹی کلکٹر کے فرائض انجام دیتے رہے اور اب ریٹائر ہونے کے بعد مستقل طور سے علی گڈھ میں سکونت اختیار کر چکے ہیں۔ ویسے ان کا وطن "ہٹور" ضلع بجنور (یو،پی) ہے۔

حسن زہرہ صاحبہ جون ۱۹۱۶ء میں پرتاپ گڑھ یو،پی میں پیدا ہوئیں ۱۹۳۷ء میں علی گڑھ سے بی۔اے کیا۔

تقسیم ہند کے بعد ۱۹۴۹ء میں اپنے شریک حیات سید لقمان حیدر صاحب مینجر اسٹیٹ بینک آف پاکستان کے ہمراہ کراچی پھر لاہور اور اس کے بعد ڈھاکہ تشریف لائیں۔ بیگم حیدر فطرتاً خلیق، متواضع اور ایک بلند کردار کی مالک ہیں۔ ان کے مزاج میں رعونت یا احساس برتری نام کو نہیں ان کے دولتکدے پر جہاں شہر کے عمائدین وافسران تشریف لاتے رہتے ہیں وہیں وہ ادیب بھی بلا کسی روک ٹوک باریاب ہوتے ہیں جنکے پاس ظاہری نمود نمائش کے اسباب نہیں۔ لیکن بیگم حیدر دونوں صفتوں میں ایک ہی انداز سے خوش آمدید کہیں گی۔ ان کی وسیع النظری اور خلوص میں کسی

قسم کے امتیاز کا شائبہ نہ ہوگا۔

انگریزی اور اردو ادب پران کا مطالعہ وسیع ہے، ادبی تحریکوں کے علاوہ وہ علی گڑھ اولڈ بوائز ایسوسی ایشن کی آنریری جنرل سکریٹری بھی ہیں۔ ڈھاکہ میں بیگم صاحبہ اردو زبان وادب کی بے لوث خدمت اور ترویج وترقی میں پیش پیش ہیں وہاں کی ادبی دنیا میں ان کی وجہ سے کافی گہما گہمی رہتی ہے۔

انھیں شعر کہتے ہوئے چھ سات سال سے زیادہ مدت نہیں ہوئی۔ لاہور کے دوران قیام میں چند غزلیں احسان دانش کو دکھائیں اور اب ڈھاکہ میں علامہ حضرت رضا علی وحشت سے اصلاح لینا شروع کی ہے۔ انھوں نے نظمیں بھی کہی ہیں مگر فطری مناسبت غزل سے ہے۔ متقدمین میں ان کے پسندیدہ شعراء میر اور مومن ہیں۔ زمانۂ حال کے شعراء میں جگر، فیض، اور مجاز کے کلام سے متاثر ہیں۔ ذیل میں ان کے اشعار بطور مشتے از نمونہ خروارے پیش کیے جاتے ہیں جس سے ان کی شاعرانہ صلاحیتوں کا اندازہ بخوبی ہو سکتا ہے ؎

اکثر وہ اشک جو مری آنکھوں سے بہہ گئے
سوز نہاں کا راز زمانے سے کہہ گئے

آئین گلستاں کیا تجھ کو اے باد صبا معلوم نہیں
غنچوں کو پریشاں کرنے سے خود گلشن کی رسوائی ہے

ہم تو قفس میں بند ہیں اب آشیاں سے دور
ڈھونڈا کریں چمن میں ہمیں دن بہار کے

جفا ہی کیوں نہ ہو آخر وہ غافل تو نہیں ہم سے
خدا کا شکر ہے ہم کو وہ اس قابل سمجھتے ہیں

ارکانِ گلستان سے ہم کو اتنی ہی شکایت ہے ہمدم
تخریب گلستاں یاد رہی تعمیر گلستاں بھول گئے

بیگم شادانی ایم اے۔ ٹی ٹی (آکسن) کا تعلق گو بریلی (یو، پی) سے ہے لیکن عرصۂ دراز سے ڈھاکہ میں مقیم ہیں۔ انگریزی اردو، فارسی زبان پر کامل قدرت رکھتی ہیں۔ ان کے کئی زبانوں سے ترجمے اور افسانے ماہنامہ خاور ڈھاکہ اور دیگر رسالوں کی زینت بنتے رہتے ہیں ان کی خاموش خدمات قابل قدر ہیں۔ آج کل میری کالا کو کراچی کی پرنسپل ہیں۔

زینب نعمانی تسنیم اردو ادب میں ایسی شاعرات کی بہت کمی ہے جو نظم و نثر دونوں پر یکساں قدرت رکھتی ہیں۔ گنتی کی ان چند شاعرات میں زینت نعمانی تسنیم کا نام بھی بنگال کے لئے باعثِ فخر و ناز ہے کہ وہ نہ صرف نہایت اچھی شاعرہ ہیں بلکہ ایک خوش فکر ادیبہ بھی ہیں شاعری رنگِ جدید میں حیات آمیز رجحانات کی آئینہ دار اور نثر اسلوب خاص کی حامل ہے۔ اندازِ بیان جداگانہ زبان صاف و شگفتہ اور طرز تحریر دلچسپ و دلکش ہے۔

تسنیم ماہنامہ نگار لکھنؤ کے مشہور مقالہ نگار پروفیسر عبدالقیوم حسرت نعمانی ایم۔ اے مرحوم کی بیوہ ہیں۔ انگریزی اور اردو میں بی۔ اے (آنرز) ہیں قیام پاکستان کے قبل کلکتہ میں رہتی تھیں اور اب گزشتہ چار پانچ سال سے ڈھاکہ میں قیام پذیر ہیں۔

مضامین نظم و نثر ہند و پاک کے معیاری جریدے مثلاً جدید اردو کلکتہ، ماہ نو کراچی، خاور ڈھاکہ، وغیرہ میں وقتاً فوقتاً شائع ہوتے رہتے ہیں۔ نمونۂ نثر کے سلسلہ میں تسنیم کے چند خطوط جو ماہنامہ خاور ڈھاکہ دسمبر ۱۹۵۲ء میں شائع ہو چکے ہیں ان میں سے ایک خط کا اقتباس ذیل میں ہدیۂ ناظرین ہے جس سے انکے ذوق ادب مخصوص طرز تحریر

اور شاعرانہ صلاحیت کا بخوبی اندازہ ہو سکتا ہے۔ اور بقول عندلیب شادانی ــــ "یہ خطوط حکایت و افسانہ نہیں ایک سوگوار زندگی کی حقیقی روداد ہیں اس لئے ان کا حرف حرف درد اثر میں ڈوبا ہوا ہے یہ خطوط انھوں نے اپنے عزیز کو لکھے تھے ان کی اہلیت عرف پاکیزہ بان اور دلنواز پیرایہ بیان ہی پر ختم نہیں ہو جاتی بلکہ ان کے اندر اور بھی بہت کچھ ہے جو بقدر ذوق ان کا مطالعہ کرنے والوں کو مل سکتا ہے۔"

" ارے میرے بھائی! تم نے تو بس حد کر دی۔ تمھارے خطوط پڑھ کر غور کرنا پڑتا ہے کہ غالب اور اقبال کے کلام میں زیادہ معنی آفرینی ہے یا تمھاری گفتار میں کبھی تو سیدھے سادھے خط لکھا کرو۔

سوچتی ہوں کیا روح کے پرواز کر جانیکا نام موت ہے؟ نہیں موت آسمان کی رفعتوں پر منڈلایا نہیں کرتی اور نہ ثریا و پروین کے نغماتی رقص میں شریک ہو سکتی ہے اس کا رفعت و بلندی سے کیا تعلق؟ موت کو دیکھنا ہو تو آؤ بنگال کے سسکتے رینگتے ہوئے افلاس زدہ انسانوں کو دیکھ کر ان غریبوں کی خمیدہ کمر پر تم کو موت کوڑے برساتی ہوئی نظر آئے گی بھائی تم دیکھ سکو گے کس طرح موت کے بے رحم جبڑہ نے مفلس کی بوسیدہ اور شکستہ ہڈیوں کو پیس کر سرمہ کر دیئے ہیں وطن کی حالت پر غور کرتی ہوں تو خود کو انسان کہتے ہوئے شرم محسوس ہوتی ہے۔"

خمار — نام رحیبی۔ تخلص خمار، الہلال کلکتہ کے نائب مدیر مولانا قطب الدین کی اہلیہ شاعر بھی تھیں اور مضمون نگار بھی۔ غزلوں کا ایک مجموعہ شائع ہو چکا ہے۔ وحشت، جگر، جوش، سیماب، احسان، دانش، ساغر وغیرہ جیسے ماہران فن سخن وال نے ان کے کلام کی داد دی۔ صحیفۂ فطرت کے نام سے مضامین کا ایک مجموعہ چھپ چکا ہے

جمیلہ بیگم کا ناول "فیروزہ" خواتین کے بہترین ناولوں میں شمار ہوتا ہے۔

محمودہ بیگم مناپور (مغربی بنگال) کی رہنے والی ہیں۔ خواتین ناول نگاروں میں ان کا مرتبہ بہت بلند ہے، ان کا ناول "روشنک بیگم" معرکہ آرا تصنیف ہے۔ اس میں لکھنؤ اور دہلی کی خانگی زندگی کا خاکہ نہایت موثر دلچسپ انداز میں کھینچا گیا ہے وہاں کی روزمرہ کی زبانیں اور محاورے بڑی بے ساختگی و برجستگی کے ساتھ استعمال کیے گئے ہیں۔ اس کے مطالعہ سے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ لکھنؤ یا دہلی کے کسی گھر میں بیٹھے ہال کے ماحول سے بہت قریب ہیں اور شک تو کیا یقین ہونے لگتا ہے کہ کتاب ایسی خاتون نے سپردِ قلم کی ہے جس کی ساری زندگی خود اس ماحول کا عطیہ ہو لیکن واقعہ یہ ہے کہ محمودہ بیگم ایک پردہ نشین خاتون ہیں اور انہوں نے لکھنؤ یا دہلی تو کیا آج تک مناپور کے احاطہ سے کبھی قدم باہر نہیں نکالا ہے۔

انجم نام عائشہ خاتون۔ تخلص انجم۔ صوبۂ بہار میں پیدا ہوئیں۔ عرصہ سے بنگال میں قیام ہے تقسیم بنگال کے بعد سے اب تک سنتاہار (مشرقی بنگال) میں اقامت پذیر ہیں۔ کہنہ مشق شاعرہ ہیں۔ کلام صاف اور روانی و برجستگی سے مملو ہے۔ چند اشعار ملاحظہ فرمائیے ؎

عشق آزارِ جاں نہ ہو جائے
زندگی امتحاں نہ ہو جائے

رہنما ہے جنونِ شوق اپنا
گم کہیں کارواں نہ ہو جائے

حاصلِ دردِ دل ہے رشکِ انجم
مفت میں رائیگاں نہ ہو جائے

تقسیم ملک کے بعد کلکتہ میں آج بھی ایسی اہل ذوق خواتین موجود ہیں جن کی شاعری کا بنگال کے ہر چہار طرف چرچا ہے خصوصاً کلکتہ کے رسائل واخبارات اور ادبی حلقوں میں ان کا کلام بڑی دلچسپی سے پڑھا اور سنا جاتا ہے ان میں سے بعض کا تعارف حسب ذیل ہے۔

صغریٰ بیگم صغریٰ بیگم سبزواری پروفیسر طاہر رضوی ایم۔ اے مرحوم کی بیوہ ہیں۔ کلکتہ میں پیدا ہوئی۔ اور یہیں زیورِ تعلیم و تربیت سے آراستہ ان کی ساری زندگی اُردو زبان و ادب کی خدمت میں گزری۔ تعلیم بی اے تک حاصل کی ہے تقسیم کے پہلے تک سخاوت میموریل گرلس اسکول میں بحیثیت معلمہ اُردو اور فارسی کی تعلیم دیتی تھیں۔ اصلاحی و تعمیری مضامین لکھنے کی شائق و دلدادہ ہیں۔ ماہنامہ تجلی کلکتہ جو ۱۹۴۵ء تا ۱۹۴۷ء جاری رہا، کی مدیرہ رہ چکی ہیں کئی درسی کتابوں کی مصنفہ بھی ہیں جو کلکتہ یونیورسٹی کے اسکولوں میں پڑھائی جاتی ہیں۔

مخفی نام صحالہ بیگم۔ تخلص مخفی۔ کلکتہ کی مشہور شاعرہ ہیں۔ عرصہ سے شعر کہتی ہیں۔ ادبی مذاق فطرت سے ودیعت ہے۔ کلام صاف اور پختہ خیالات کم اور جذبات زیادہ ہیں۔ اکثر اشعار زندگی کی تلخیوں کا آئینہ دار ہیں۔ ایک غزل کے بعض اشعار ملاحظہ ہوں :-

پیروں میں آبلے ہیں آنکھوں سے ہے خوں رواں، کوئی نہیں بتاتا منزل مری کہاں ہے؛
حاصل ہے دل کو لذت اندوہ روداد غم سہی دلچسپ زندگی ہر رنگین داستاں ہے
انجام زندگی کا اک مشتِ خاک مخفی گر پاک رہ سکے وہ اکسیر بے گماں ہے

اختر نام سعیدہ خاتون۔ تخلص اختر۔ کہنہ مشق شاعرہ اور ادیبہ ہیں اُردو زبان پر اہل زبان جیسی قدرت رکھتی ہیں۔ پروفیسر عبدالرحیم ایم۔ اے (علیگ، ڈھاکہ) کی شریک حیات ہیں۔ پیدائش ۹ دسمبر ۱۸۹۰ء بمقام کلکتہ ہے ان کی طبیعت ہمیشہ سے ادیبانہ و شاعرانہ ہے افسوس کہ زمانے کی بے قدری یا ان کی اپنی بے نیازی کی وجہ سے انھیں وہ شہرت حاصل نہ ہو سکی جس کی متقاضی

ان کی طبعی صلاحیت ہے۔

سعیدہ اختر کا ایک قومی واخلاقی ناول قیام پاکستان سے چند سال پیشتر کئی حصوں میں زیر طبع تھا، اس ناول کا طرز بیان کچھ ایسا موثر ہے کہ اہل ہند کا ہر پڑھنے والا اپنی پستی کا فوری احساس کرنے لگتا ہے اور انگریزوں کی بداخلاقی وستمگری سے نجات حاصل کرنے کی تدبیریں سوچنے میں غرق ہو جاتا ہے۔ یہ ہے وہ افادی پہلو جس کی بنا پر انگریزوں کو خطرہ محسوس ہوا چنانچہ اس ناول کا پہلا حصہ ایک ہزار کی تعداد میں چھپا ہی تھا کہ انگریزوں نے نہ صرف کتاب بلکہ پریس بھی ضبط کر لیا۔

سعیدہ اختر ۱۹۴۲ء یعنی عالمگیر جنگ کے آخری ایام میں یونیورسٹی پوسٹ گریجویٹ کے ممنوعہ اجلاس میں اردو میں تقریر کرنے کے جرم میں چار ماہ قید بامشقت کی سزا بھی بھگت چکی ہیں۔ جیل سے رہا ہونے کے بعد "قید زنگ" کے عنوان سے مضامین کا دلچسپ سلسلہ روزنامہ "ہند" کلکتہ میں شروع کیا اور یہ تمام مضامین بعد میں کتابی شکل میں چھپے۔ نواب نصیر حسین خیال مرحوم نے اس کتاب پر سیر حاصل تبصرہ تحریر کیا تھا۔

غزل، قطعات، رباعیات، ہر صنف سخن پر طبع آزمائی کرتی ہیں۔ ان کے کلام میں سوز و گداز مترشح ہے بطور نمونہ ایک المیہ غزل کے چند اشعار مندرجہ ذیل ہیں ؎

میری خاموش راتوں میں سکون قلب مضطر ہے
مرے پُر شور نالوں میں حسرت آج رقصاں ہے

مری تاریک دنیا میں ضیا باری ہے رحمت کی
مرے ٹوٹے ہوئے دل میں وفور شوق پنہاں ہے

نرالی شان میں اختر ہے شکووں کی فراوانی
یوں روداد ستم لکھ کر تخیل خود پشیماں ہے

سعیدہ اختر کو مولانا راشد الخیری کا رنگ بہت مرغوب ہے اس لئے ان کا کلام غم و الم میں ڈوبا ہوتا ہے ایک شعر ملاحظہ ہو۔ کتنا گہرا احساس ہے ؎

مرے معبود کیوں تخلیق کی زحمت گوارا کی
نہ میں دنیا کے قابل ہوں نہ دنیا میرے قابل ہے

اختر کے حالاتِ زندگی انگریزی میں بھی چھپ چکے ہیں۔

راحت

رضیہ بیگم المتخلص بہ راحت ۳۰ دسمبر ۱۹۱۵ء کلکتہ میں پیدا ہوئیں۔ سعیدہ اختر کی بڑی صاحبزادی ہیں۔ شاعری کا ذوق آغوش مادر کا عطیہ ہے۔ کلام کا رنگ اہل لکھنؤ جیسا ہے۔ چند اشعار ہدیہ ناظرین ہیں ؎

جو ان کی جبیں سے روشن تھی جسمیں تھا اندھیرا زلفوں کا
وہ صبح تمنا دیکھی ہے وہ شام مسرت دیکھی ہے

راحت اپنی نشیلی آنکھوں سے تو نے بہت کچھ دیکھا ہے
دل روئے نگاہیں ہنستی ہوں ایسی بھی صورت دیکھی ہے

مانا کہ بے ثمر ہے مگر کیوں قلم کریں
شاید کبھی پھلے شجر آرزو تو ہے

مراد

نجمہ بیگم مراد کی ولادت ۲۹ نومبر ۱۹۱۷ء بمقام کلکتہ ہوئی افسوس عین شباب میں دنیا سے منہ موڑ گئیں۔ مختصر سی عمر میں جو کچھ کہا بہت خوب کہا۔ لفظی رعایت، زبان کی صفائی، انداز بیان کی برجستگی کلام کی خصوصیات ہیں ؎

تاثیر نہ آہوں میں نہ فریاد و فغاں میں
اور میں ہوں کہ نالوں اثر ڈھونڈ رہی ہوں

دریائے تخیل کی ابھی تہہ کو نہ پہونچی
میں قطرے کے سینے میں گہر ڈھونڈ رہی ہوں

کیا خوب ہے میری بھی ناکام تمنا
شام غم ہجران کی سحر ڈھونڈ رہی ہوں

جس در کی تمنا میں ہوں ناکام تمنا
اک سجدے کی خاطر وہی در ڈھونڈ رہی ہوں

آغوشِ محبت میں مچلتی ہیں مرادیں
اے دل ذرا تھم جا انہیں پھر ڈھونڈ رہی ہوں

سوزاں سوزاں بیگم سوزاں۔ جواں سال شاعرہ۔ باپ پروفیسر، ماں سخن سنج شعر و ادب کی فضاؤں میں پرورش پانے کی وجہ سے بچپن سے ذوقِ شعری نے انگڑائی لی۔ غزلیں کم اور نظمیں زیادہ کہتی ہیں۔ شاعری کا بیشتر حصہ اخلاقیات قومیت، اسلامیت کے موضوعات پر مشتمل ہے۔

ایک نظم "پردیپ" کے چند اشعار ہدیۂ قارئین ہیں جو شوخیٔ بیان، شگفتگیٔ زبان اور روانیٔ کلام کے اعتبار سے خوب ہیں۔

کس قدر پاکیزہ کتنی دلنشیں و سادہ کار
میری ہمدم میری پردیپ میرے خوابوں کی بہار

تیری فطرت کی بلندی رفعتِ پرویز ہے
تیری نظروں میں عیاں اوجِ ثریا کا وقار

گفتگو تیری ہے گویا آسمانی زمزمہ
جس کی شوخی پر فرشتوں کا تبسم بھی نثار

یہ مذاق شاعری یہ تیرا ذوقِ ادب
کچھ فزوں تر ہو گیا ہے ان سے بھی تیرا وقار

جیسے کلیوں کی لطافت جیسے پھولوں کی شمیم
یوں حریمِ خواب میں ہوتی ہے آکر جلوہ بار

بے ارادہ خواب کی وادی میں آجاتی ہے تو
بے سبب تیرا خیال آتا ہے دل میں بار بار

سوزاں کے کلام میں نازک بیانی کے ساتھ مزاح و ظرافت کی چاشنی بھی پائی جاتی ہے۔

کلکتہ کی طوائفوں میں بھی کئی شاعرہ گزری ہیں۔ کلکتہ کا قدیم ماہنامہ "نتیجۂ سخن" میں غیر طرحی مشاعرہ کا سلسلہ جاری تھا۔ جس میں شاعرات بھی حصہ لیا کرتی تھیں متذکرہ بالا شاعرات کے علاوہ سرد ناز شیریں، سید بیگم عجوب۔ مہر تسکین، بیگم صوفیہ کمال، شہناز عندرا، بیگم نہاں، قمر النساء بیگم حجاب زہرہ بیگم حیا۔ شمس النساء مخمور۔ جمیلہ خاتون قمر۔ فصیح النساء فصیح۔ اور امیر مشرفی ایم۔ اے کی دو صاحبزادیاں جو اردو میں ایم۔ اے ہیں۔ وغیرہ

بھی شعر و ادب سے کافی ذوق رکھتی ہیں اور مختلف اخبارات و رسائل میں لکھتی رہتی ہیں۔ بعض کا مجموعۂ کلام بھی منظرعام پر آچکا ہے۔

قطعات تاریخ

وفاؔ یہ آپ کی برسوں کی کاوش کا نتیجہ ہے
کہ ہے بے لوث خدمت کا صلہ "بنگال میں اردو"
طلب ہے عیسوی تاریخ کی شرقیؔ، تو یہ کہہ دے
شگفتہ ہے یہ تحقیقِ وفاؔ "بنگال میں اردو"

۶۱۹۵۴ — امیر الاسلام شرقیؔ ایم اے

خوب تفصیل سے ہے ذکر سخندانوں کا
واقعی داد کے قابل ہے وفاؔ کی محنت
لکھئے یہ مصرعۂ تاریخ جناب کاملؔ
آج "بنگال میں اردو" کی بجا ہے شہرت

سنہ ۱۳۷۴ھ

کامل صدیقی بریلوی

بنگال میں اُردو صحافت

کسی ملک کے ادب، سیاست اور زبان کی ترقی و توسیع کے اہم ذرائع وہاں کے پریس اخبارات اور رسائل و جرائد ہوتے ہیں۔ دنیا کے تمام ترقی یافتہ ملکوں مثلاً روس، امریکہ، یورپ، جاپان اور چین میں کثرت سے رسائل و اخبارات شائع ہوتے اور کم سے کم قیمت پر زیادہ سے زیادہ تعداد میں عوام تک پہنچائے جاتے ہیں۔

مقام افسوس ہے کہ غیر ممالک کے مقابلہ میں برصغیر ہندو پاک کے اخبارات و رسائل اول تو قلیل الاشاعت ہوتے دوسرے تھوڑے ہی مدت میں جاری رہ کر روپوش ہو جاتے ہیں اس کے کئی وجوہات ہیں؛ جن میں سب سے اہم وجہ حکومت

کی ان اخبارات و رسائل کی طرف سے بے توجہی اور اکثر اوقات جائز و ناجائز دباؤ بھی ہوتا ہے۔ لیکن یہ حقیقت نظر انداز نہیں کی جا سکتی کہ ان چیزوں کے باوجود موجودہ بحرانی و انقلابی دور کی تعمیر و اصلاح میں ہمارے ادیبوں، شاعروں اور صحافیوں کا جو نمایاں حصہ رہا ہے وہ دنیا صحافت میں ہمیشہ درخشندہ و تابندہ رہیگا۔ ذیل میں ان اخبارات و رسائل کا ذکر کیا جاتا ہے جن کا اردو ادب و صحافت کی ترقی میں نمایاں حصہ رہا ہے۔

ایک مورخ کا بیان ہے کہ ہندوستان میں سب سے پہلا پریس سنہ ۱۷۸۰ء میں قائم ہوا لیکن مزید تحقیق و تفتیش سے پتہ چلتا ہے کہ اس سے پہلے پریس وجود میں آچکا تھا اور انگریزی کا پہلا اخبار سنہ ۱۷۷۴ء میں انڈیا گزٹ کے نام سے شائع ہوتا تھا

مدراس میں سب سے پہلا اردو اخبار بنام "عمدۃ الاخبار" (غالباً سنہ ۱۸۶۶ء) میں شائع ہوا۔

پنڈت برج موہن دتاتریہ کیفی کے ایک مضمون مطبوعہ سہ ماہی "اردو" اپریل سنہ ۱۹۳۵ء حیدرآباد دکن میں درج ہے کہ اردو میں سب سے پہلا اخبار "اردو اخبار" کے نام سے شائع کرنے کا سہرا صاحب آب حیات مولانا محمد حسین آزاد مرحوم کے والد مولانا محمد باقر حسن کے سر ہے اور اس کا مقام اشاعت دہلی تھا۔ لیکن اس سے قبل اپریل سنہ ۱۸۲۳ء میں کلکتہ میں "جام جہاں نما" کے نام سے ایک ہفت روزے کا اجرا ہوا جو فارسی اور ہندوستانی زبان میں اردو ٹائپ میں اشاعت پذیر ہوتا تھا اس کے ایڈیٹر لال شو داشوک منشی تھے۔

۱؎ "مدراس میں اردو" صفحہ ۱۰۳۔ از نصیر الدین ہاشمی

۲؎ خطبات گارسن دی تاسی صفحہ ۳۲۱

"اُردو گائیڈ"، کلکتہ جو ہندوستان کے اولین اخبارات میں تھا ۱۸۶ء تک جاری رہا۔ مولوی کبیر الدین بنگالی اس کے بانی اور اڈیٹر تھے جس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ اردو کے سب سے پہلے اخبار کی اشاعت کا فخر بنگال کو حاصل ہے۔

گو بنگال اُردو مرکز سے دور رہا مگر یہ ایک ناقابلِ تردید حقیقت ہے کہ یہاں کی محفلیں ہمیشہ سے اربابِ علم و ادب اور اکابرِ سخن کی تجلیاتِ شعر و ادب سے جگمگاتی رہیں اور سرمایۂ زبان و ادب میں گرانمایہ اضافہ ہوتا رہا۔ کلکتہ، ڈھاکہ وغیرہ میں حیدرآباد دکن، لاہور اور دہلی کی طرح پریس و کتابت کی سہولتیں نہ ہونے کے باعث نشر و اشاعت کے ذرائع ہمیشہ مسدود رہے اور معدودے چند مشہور ہستیوں کے علمی و ادبی کارنامے کتابی شکل میں یا اخبارات و رسائل کے ذریعہ منظرِ عام پر نہ آسکے جس سے اہلِ مشرق کی اُردو نوازی، ذوقِ ادب، علمی کاوشوں، مجلسی سرگرمیوں اور بے پناہ خدمات کا صحیح طور پر اندازہ ہوتا۔ لیکن اس کے باوجود بنگال جیسی بنجر و سنگلاخ سرزمین سے اُردو کے بے شمار روزنامے، ہفت روزے، ماہنامے اور قلمی پرچے نکلتے اور زمانے کی بے قدری کی نذر ہوتے رہے۔ ان کے ذریعہ بنگال میں اُردو کی جو بے لوث و ناقابلِ قدر خدمات انجام دی گئیں اور اُردو زبان و ادب کا جو رجحان پیدا کیا گیا وہ ناقابلِ فراموش ہے۔ یہ امر بھی قابلِ ذکر ہے کہ ۱۸۵۹ء میں بنگال کے صرف شہر کلکتہ میں بیس پریس[1] تھے۔

۱۸۲۲ء سے بیسویں کی ربع صدی تک بنگال میں جتنے رسائل و اخبارات جاری ہوئے سب کی مکمل فائلیں "امپیریل ریکارڈس"، "بنگال ایشیاٹک سوسائٹی

---

[1] دیکھیے۔ SELECTION FROM THE RECRDS OF THE BENGAL GOVERNMENT

مسلم انسٹی ٹیوٹ کلکتہ اور قبلۂ محترم حضرت محمود طرزی کے ذاتی کتب خانے میں محفوظ ہیں
ذیل میں انیسویں صدی میں صرف کلکتہ سے شائع ہونے والے اخبارات کی
مختصر سی فہرست پیش کی جاتی ہے۔

نام اخبار	ایڈیٹر	تاریخ اجراء	نام اخبار	ایڈیٹر	تاریخ اجراء
ہفت روزہ مرآت الاکبر	رام موہن رائے	سنہ ۱۸۲۲ء	روزنامہ ماہ عالم افروز	وہاج الدین	سنہ ۱۸۳۳ء
شمس الاکبر "	من رام ٹھاکر	سنہ ۱۸۲۳ء	(بزبان فارسی)		
ماہنامہ دی بنگال ہیرالڈ	رابرٹ منٹگمری مارٹن	سنہ ۱۸۲۹ء	ہفتہ وار آئینۂ سکندری	?	سنہ ۱۹۳۳ء ۵ر جنوری
(یہ رسالہ انگریزی، بنگلہ، فارسی، ہندوستانی ناگری			(بزبان فارسی)		سنہ ۱۸۳۵ء
پانچ زبانوں میں شائع ہوتا تھا)			روزنامہ سلطان الاخبار	?	۲ر اگست
روزانہ سماچار سوکبار اجنبر	شیخ علیم اللہ	سنہ ۱۸۳۰ء	(بزبان فارسی)		
(ہندی بنگالی زبان میں)			" دارالسلطنت	مولوی عبدالکریم سلہٹی	سنہ ۱۸۸۶ء
ہفت روزہ نظام شمسی	کالی کرشنا	سنہ ۱۸۳۰ء			

اب بیسویں صدی اخبارات و جرائد کی فہرست ملاحظہ فرمایئے جس سے اندازہ ہو جائے گا کہ بنگال میں اردو زبان کی بقا و استقرار کے خاطر گلشن صحافت میں کیسا کیا گل ہائے رنگا رنگ کھلائے گئے اور حامیانِ اردو نے اپنے خون، اثیار و محبت سے اس باغ کو کس طرح سینچا۔

روزنامہ الہلال ــــــ مولانا ابو الکلام آزاد کی بے پناہ علمی قابلیت

(۱) مسلم ریویو، اپریل، جون ۱۹۲۹ء

اور عدیم المثال ادبی صلاحیت کو زندہ رکھنے کے الہلال کی فائلیں کافی ہیں۔ یہ وہ پہلا اخبار ہے جس نے نہایت ہی قلیل مدت میں سارے ہندوستان میں ادب و صحافت کا سکہ جما دیا تھا اس نے نہ صرف دوست دشمن سے آزاد کی قابلیت وشخصیت کا لوہا منوالیا بلکہ بڑے بڑے شہسواران صحافت کیلئے مشعل راہ ثابت ہوا۔ الہلال کے عنوانات کو فخر ومباہات کے ساتھ دیگر مدیران اپنے اخبار ورسائل میں اپنا لیتے تھے۔ الہلال کا غیر فانی کارنامہ یہ ہے کہ قرآن کی تعلیم کو کچھ اس طریقے سے پیش کیا کہ مسلمان سیاست، معاشرت تعلیم یہ ساری باتوں کی اصلی بنیاد صرف مذہب اور قرآن کی تعلیم بتائی۔ الہلال کے علمی ادبی، سیاسی مضامین نے نہ صرف مذہبی پیشواؤں، علماء کو مشائخ کو متاثر کیا بلکہ نئی روشنی کے انگریزی تعلیم یافتہ طبقہ کیلئے بھی نشان راہ کا کام کیا۔ مختصر یہ کہ تاریخ ادبیات سنہ میں الہلال کا نام زریں حرفوں میں لکھا جائے گا۔ حامیان ادب ڈھائی سو سال میں جو کام نہ کرسکے ادب اردو کے اس امام اعظم نے اپنے مختصر سے لمحات حیات میں کر دکھایا

الہلال سنہ ۱۹۱۲ء سے سنہ ۱۹۱۸ء تک یعنی صرف ۶-۷ سال جاری رہا۔ اس عرصہ میں مولانا کو کئی بار جیل بھی جانا پڑا۔ جس کی وجہ سے معرض التوا میں بھی پڑا رہا۔

۲ - ۳ ہند و آزاد ہند ——— ہندوستان کے چوٹی کے ادیب، سیاست داں، صحافی مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی کے زیر ادارت فروری سنہ ۱۹۳۱ء میں بمقام کلکتہ جاری ہوا۔ شروع میں کچھ دنوں تک "الہند" کے نام سے شائع ہوتا رہا خلافت اور کانگریس تحریکات کے زمانے میں اس اخبار نے بڑا کام کیا۔ آج بھی کانگریسی تحریکوں کی حمایت اس کی پالیسی ہے ہند کے ہفتہ روزہ کے علاوہ سال میں تین چار خاص نمبر اور عید نمبر شائع ہوا کرتے

تھے اور خبر سیاست حاضرہ ٹھوس محبت کے علاوہ بلند پایہ مقالات، نظمیں اور افسانوں کے اعتبار سے ایک شاہکار ہوتا۔ ہند آج بھی کلکتہ کا کثیر الاشاعت اخبار ہے۔ موجودہ ایڈیٹر غلام سرور ڈگا. بی. اے علیگ ہیں۔

۱۹۴۸ء میں ملیح آبادی روزنامہ ہند سے علیحدہ ہو گئے اور "آزاد ہند" نکالا ذاتی پریس بھی خرید لیا تھا۔ آزاد ہند کا ویکلی ایڈیشن "اجالا" کے نام سے شائع ہوتا ہے ملیح آبادی آج کل دہلی میں مقیم ہیں۔ آزاد ہند کے موجودہ ایڈیٹر احمد سعید ملیح آبادی (موصوف کے صاحبزادے) اور ابراہیم ہوش (کلکتہ کے مشہور ادیب واخبار نویس) ہیں۔

عصر جدید کلکتہ — اس کا پہلا نام دور جدید ہے ۳۰، ۳۵ سال سے جاری ہے۔ پہلے ہفت روزہ کی شکل میں شائع ہوتا تھا۔ شائق احمد عثمانی اس کے ایڈیٹر و پبلشر ہیں۔ ملک کے مشہور فن کار و صحافی بھی اس کے دامن ادارہ سے وابستہ رہے۔ جن کے اسمائے گرامی یہ ہیں۔ اختر حسین عشردی۔ ڈاکٹر ارشد عظیم آبادی۔ چراغ حسن حسرت کاشمیری۔ سلیم اللہ فہمی۔ عبدالجبار وحیدی۔ محمد سلیمان واصف۔ جمیل مظہری۔ ابراہیم ہوش عبدالکریم صدیقی۔ تقسیم ملک سے قبل عصر جدید کی پالیسی مسلم لیگ تحریکات کی حمایت تھی۔ اب یہ کراچی سے قیصر عثمانی کے زیر ادارت اور کلکتہ سے جان محمد کی زیر نگرانی شائع ہوتا ہے۔

ان کے علاوہ بعض روزناموں کی فہرست حسب ذیل ہے۔

نام	مقام اشاعت	ایڈیٹر	تاریخ اجراء
البلال	کلکتہ	وحید الدین نور، اقبال اکرامی	۱۹۳۸ء تا ۱۹۴۲ء

نام بمقام اشاعت	ایڈیٹر	تاریخ اجراء	نام بمقام اشاعت	ایڈیٹر	تاریخ اجراء
رسالت کلکتہ	مولانا ابوالقاسم اور رفیق طادری	بیس سال قبل شائع ہوتا تھا	طوفان کلکتہ	مولانا کامل	۵۱ تا ۱۹۵۲ء
انوالاخبار "	حکیم رکن الدین	۱۲ ۱۹ء	بنگال پنچ "	سوالی	؟
الحق "	ادریس الحق فاطمی بی اے آنرز	۱۵ر جنوری	ہمدرد "	خان شفاعت اللہ خاں،	
	ولی اللہ بی اے معز الدین حالی	۱۹۵۳ء		عبدالجبار وحیدی	
	اسرائیل احمد	دس سال کے سے جاری ہے	زمندر گزٹ "	مولانا عبدالجبار، دانی کے طارق	۳۳ یا ۱۹۳ء
کارواں "	ش مظفر پوری یونس نظری	بارہ سال کے جاری ہے	جہاد "	دانی کے، طارق	؟
جمہور "	پبلشر قاضی عبدالغفار خاں		راعین گزٹ "	"	؟
	ایڈیٹر کیفی چریا کوٹی	سنہ ۱۹۱۸ء	اکھاڑا "	"	؟
نئی دنیا "	سید صدیق حسین قتیل انصاری	؟	المشرق ڈھاکہ	شفاء الملک حکیم حبیب الرحمن احسن	۱۹۰۶ء
نیاز مانہ "	جمیل مظہری ایم اے		پاسبان "	رفیع احمد قدوائی	۶ر جون سنہ ۱۹۴۹ء
	عبدالجبار وحیدی مرحوم	؟	انقلاب "	غلام احمد	۱۹۵۳ء
زمانہ "	کیفی چریا کوٹی	؟	انگارہ "	یوسف رضوی	۱۹۵۲ء
مدبر "	سید مسعود محسن زبیری	؟	مشرقی پاکستان	ڈاکٹر عندلیب شادانی	۱۹۴۷ء تا ۱۹۴۸ء
اقبال "	سید شبیر حسین	؟	امروز کلکتہ	اقبال اکرامی	۱۵ر مارچ
نیو مجاہد "	عابدی فیض آبادی	۱۹۵۱ء			۵۳ء سے
خادم کعبہ ہوڑہ	سنہ خلافت میں شائع ہوتا تھا	۱۹۳۳ء	روزنامہ		جاری ہے
انگارہ کلکتہ	غازی اصلاحی، ادریس الحق	ہفتہ ۱۹ء ۵۱ تا ۵۲ء	ستارہ کلکتہ	رفیع احمد قدوائی	۱۹۵۲ء
ہمدرد "	مولانا محمد علی جوہر	؟			۱۹۵۳ء

ہفت روزے (ان میں سیاسی، ادبی، نیم فلمی بھی شامل ہیں)

نقاش :- کلکتہ کے ہفتہ وار رسالوں میں سب سے زیادہ مقبول اور پابندی وقت کے

ساتھ چھپتا ہی اس کے خاص نمبر شاہکار کی حیثیت رکھتے ہیں۔ نقاش کا عید نمبر ۱۹۴۶ء میرے زیر نظر ہے۔ اس کے معیار کا اندازہ اس کے لکھنے والوں کے چند ناموں سے کر لیجیے، مولانا ابوالکلام آزاد، رضا علی وحشت کلکتوی، ناطق لکھنوی، آرزو لکھنوی، آغا حشر کاشمیری مرحوم علامہ جمیل مظہری ایم اے۔ عبدالقیوم حسرت نعمانی مرحوم، فدا علی خنجر لکھنوی مولانا فنا عمادی پھلواروی وغیرہ

کلکتہ گزٹ کلکتہ	״	״	نیدوتن کلکتہ	محمد رفیع	۴۱ تا ۴۳ء
چیپٹ ״	اقبال اکرامی، فہیم الدین احمد جبین شیخ پوری	دسمبر ۱۹۵۰ء مئی اپریل ۱۹۵۱ء	عبرت ہوڑہ	جوہر غازی پوری	۱۹۴۱ء
نیا شعار ״	جہاں بی اے	۴۴-۱۹۴۵ء	شعاع کلکتہ	سرپرست جرم محمد آبادی	۱۹۴۹ء
کلکتہ دیکلی ״	عابد داناپوری	۱۹۳۵ء		نگراں رضا مظہری ایم اے بی ایل	
ہنگامہ ״	دانی کے طارق	۳۰ تا ۱۹۳۲ء	حور ״	بیگم قتیل انصاری، نورالہدیٰ	۲۲ تا ۲۳ء
نئی منزل ״	ناظرالحسینی، بخشی لاہوری	۴۶-۱۹۴۵ء	ایثار ״	عبدالوصی جمیل مظہری	۳۵ تا ۳۴ء
منزل ״	ناظرالحسینی	۱۹۴۶ء	کلیم ״	مولانا قطب الدین احمد	؟
ضرب کلیم ״	ابراہیم ہوش، شمیم پھلواروی	۴۵-۱۹۴۶ء	شفا ״	حکیم محمد یوسف جعفر پوری	؟
مخدوم ״	حامد مقصود صابری	۳۳ تا ۱۹۳۶ء	پیغام مٹیا برج		؟
خادم ״	ایس ایم جعفری۔ ابراہیم جعفر	۳۲ تا ۱۹۳۴ء	المومن کلکتہ	مولانا عبدالحئی	؟
البیان ״	کامل	؟	السنۃ ״	عبدالحق	؟
ماہ تمام ״	محمد اسحق امرتسری	؟	صداقت ״	فیض قادری	۴۰ مسلسل شائع ہوتا ہے
سیارہ ״	قاری رحمت اللہ	؟	نشتر ״	وحید الدین نوید	۴۸-۱۹۵۰ء
ستارہ ״	افضلی	؟	تازیانہ ״	فہیم الدین	؟
نظام ״	سرپرست آرزو لکھنوی مرحوم		اردو ״	پرویز شاہدی ایم اے	۲۵ اکتوبر ۱۹۳۱ء تا ۲۷ دسمبر ۱۹۳۱ء
	پرتو لکھنوی، ابراہیم ہوش، جرم محمد آبادی	۱۹۴۴ء	بیداری ״	شاہ محمد میاں صابری	یکم مئی ۱۹۴۷ء
	فردوس صبا تین سال تک کلکتہ میں جاری رہا پھر بمبئی منتقل ہوگیا آجکل لاہور سے شائع ہوتا ہے		پریز بزبان فارسی	عابدی فیض آبادی، شمیم پھلواروی۔ یوسف لکھنوی	۱۹۵۲ء

میزان سیدپور		۱۹۵۴ء	المہاجر چاٹگام	ظفر تبریزی - رازی
سرفراز ڈھاکہ			حرف القرآن،	مولانا ذوالفقار
امین "	شمیم پھلواری، خالد عرفانی رامپوری پندرہ روزہ	مئی ۴۹ء تا اکتوبر ۴۹ء	(یہ بنگلہ زبان کا وہ واحد اخبار ہے جو عربی رسم الخط میں چھپتا ہے)	

ماہنامے

چندن کلکتہ	ابراہیم شاہ	مئی ۴۴ء	ماہ تمام کلکتہ	محمد اسحٰق امرتسری جمیل مظہری	
کسوٹی "	کاوش اور نگین	۴۸-۵۰ء	آئینہ	سہیل عظیم آبادی	۱۹۳۵ء
مشرق "	شمس شیدائی ایم۔اے	۳۵ء	رباب سیدپور	احمد سعدی	۱۹۵۴ء
ارمغان "	قدوس صدیقی	۴۹ء	آفتاب کلکتہ	چراغ حسن حسرت	۱۹۲۹ء
سیلاب "	لطیف الرحمن ادریس الحق	۴۷ء	باغبان "	لئیق لکھنوی	؟

نتیجۂ سخن :- بنگال کا سب سے پہلا ماہنامہ۔ بقول حسرت موہانی مرحوم فروری ۱۸۸۱ء کو جاری ہوا۔ اور جنوری ۱۸۸۶ء کے بعد تک نکلتا رہا۔ مرتب منشی محمد وزیر عظیم آبادی غزلیں نظمیں مضامین رنگارنگ سے مزین ہوتا تھا۔ بنگال کے نامور اور بنگال کے گمنام اہل قلم کے رشحات شائع ہوتے تھے۔ لکھنے والوں میں داغ، خواجہ قمرالدین۔ نادر شاہ، شوخ رام پوری، شاغل دہلوی، شاد عظیم آبادی، وحید العصر مولوی عبدالرؤف وحید بہادر شاہ اختر۔ سید علیخاں درخشاں، مرزا سعیدالدین احمد شاگرد غالب، قاضی محمد اختر، عبدالغفور نساخ جیسے نامور اہل قلم و شہرۂ آفاق فن کاروں کے اسمائے گرامی اس کے معیار کی بلندی اور ممبروں کی کامیابی کے ضامن ہیں اپنے زمانہ کا سب سے زیادہ کثیر الاشاعت رسالہ تھا۔

جادو ڈھاکہ	خالد بنگالی حکیم حبیب الرحمن	۱۹۳۳ء	اختر بولائی ضلع میمن سنگھ	خالد بنگالی	۱۹۳۴ء

منفکر ڈھاکہ	نگراں ڈاکٹر عندلیب شادانی	۱۹۴۸ء	خاوند ڈھاکہ	ڈاکٹر عندلیب شادانی	اپریل ۱۹۵۲ء
شاہین ۔	ایڈیٹر قمر عثمانی	؟			تا ۱۹۵۳ء

جدید اُردو ——— ۱۹۴۸ء سے ۱۹۵۰ء تک جاری رہا۔ ادارہ تحریر میں پروفیسر پرویز شاہد ایم۔ اے۔ پروفیسر احسن احمد اشک ایم اے، یونس احمر ایم اے افسر ماہ پوری، عبدالجلیل کے اسمائے گرامی قابل ذکر ہیں۔ جدید اُردو ملک کے اولین درجہ کے رسالوں میں شمار ہوتا تھا۔ کلکتہ کا مقبول ترین علمی و ادبی رسالہ تھا۔ سالنامہ ۱۹۴۱ء بنگال نمبر ۱۹۴۵ء ٹیگور نمبر ۱۹۴۱ء وغیرہ نہایت شاندار اور عدیم المثال نمبر ہیں۔ اس رسالہ کو بنگال کے چوٹی کے شعراء، ادبا کے علاوہ ہندوستان کے مشہور و ممتاز فنکاروں کا تعاون بھی حاصل تھا اسکے تمام نمبروں کا ایک نسخہ راقم الحروف کے ذاتی کتب خانوں میں موجود ہے

شمس ——— علامہ وحشتؔ کلکتوی کے استاذی مرحوم ابوالقاسم شمس فرید پوری کی یادگار میں آج سے تقریباً ۳۰-۳۵ سال قبل منصۂ شہود پر آیا۔ حبیب النبی خاں صولتؔ مرحوم جیسے جلیل القدر ادیب باکمال شاعر اس کے فاضل مدیر تھے۔ اقبالؔ، حسرتؔ، اثرؔ، وحشتؔ، ناطقؔ، آرزوؔ جیسے علمبرداران ادب اس کے مستقل معاونین تھے۔ صولتؔ کے انتقال کے بعد کچھ عرصہ بند رہا۔ ۱۹۴۹ء میں دوبارہ طاہر علی شاکر کلکتوی تلمیذ وحشتؔ کے زیر ادارت شائع ہونا شروع ہوا اور آج تک شائع ہو رہا ہے

صہبا، کلکتہ	محمود طرزی، مفتی گوہر شاہ	نئی جون	نئے دہائے کلکتہ	یونس احمر ایم، اے،	اکتوبر یا نومبر
	محمد قاسم اور اجی بیکش عزیزہ زبیری میرٹھی	۱۹۳۸ء	دوماہی	مہدی رضوی ایم اے	۱۹۴۷ء
			آوازِ مشرق	تابا القادری	۸۴ء تا ۵۰ء
نئی دنیا ،،	وفا راشدی	۱۹۴۵ء ۱۹۴۷ء	تجلی ،،	ضیا عظیم آبادی	جنوری ۴۶ء تا ۴۷ء
نغمہ ونور ،،	مسرور انور	۱۹۳۶ء	عبرت ہوڑہ	ڈاکٹر جوہر	۲۰ سال سے جاری ہے

شبستان کلکتہ	ڈاکٹر جوہر	۲۰ سال سے جاری ہے	الست کلکتہ	؟	۱۹۴۸ء
انگڑائی "	عبدالرحمٰن آصف شیلاسی	۱۹۴۶ء	شباب "	ڈاکٹر ارشد عظیم آبادی	؟
	ذکاالرحمٰن آصفی		شہاب چاٹگام	نسیم بہاری	۱۹۵۰ء
	رضا الرحمٰن آصفی				
شاہین "	؟	۱۹۴۸ء	مشرق "	کاوش بریلوی	۱۹۵۱ء

دلربا ـــــ بیک وقت انگریزی، بنگلہ اور اُردو میں شائع ہوتا ہے اردو میں اگست ۱۹۵۲ء سے نکلنا شروع ہوا۔ اس کے ایڈیٹر ابوالحسنات محمد عبدالقادر ہیں مگر مسٹر سلیم اللہ فہمی اور پروفیسر احسن احمد اشک کی محنت و کاوش ہی رسالہ کی کامیابی کا سبب ہے اسے اہل علم طبقہ میں کافی مقبولیت حاصل ہے۔

نشیمن ـــــ ٹیابرج کلکتہ سے نومبر ۱۹۵۲ء سے جاری ہے فہرست ادارہ میں ظہیر ہاشمی، محمد عثمان، محمد مرزا، صابر ندیم کے نام شامل ہیں۔ نہایت سادہ سنجیدہ مگر بلند معیار رسالہ ہے۔ اُردو زبان و ادب کی بقاو ارتقا کیلئے ایسے رسالوں کی اشد ضرورت مگر افسوس ایسے رسالے زندہ نہیں رہتے۔ مشرق وسہ ماہی چاٹگام ریلوے انسٹی ٹیوٹ اخبارات ورسائل کے علاوہ اسکولوں اور کالجوں کے میگزین ہر سال انگریزی اور بنگلہ کے علاوہ اُردو زبان میں بھی شائع ہوتے ہیں جو اردو ادب کی ارتقا۔ ترقی کے ضامن ہیں۔

قلمی پرچے

آج سے تقریباً ۲۰ - ۱۵ سال قبل سب سے پہلی خاموش فلم "جانِ عالم انّا" کلکتہ میں تیار ہوئی اُس کے بعد نیو تھیٹرز کمپنی نے دیوداس، دھوپ چھاؤں، دشمن، جواب، جیسی اصلاحی

ومعیاری فلمیں پیش کرکے دنیائے فلم میں جو انقلاب پیدا کیا اسکی نظیر آج تک نہیں ملتی۔ ان فلموں کی کہانیاں، مکالمے، گیت، نغمے وغیرہ علامہ آرزو لکھنوی مرحوم جیسے مشہور فنکار کے نتیجہ فکر ہوتے تھے، عوام کے مذاق بلند کرنے اور اخلاقی واصلاحی نقطۂ نظر سے کئی فلمی رسالے بھی منظر عام پر آتے رہے جن میں سب سے پہلا نام فلم اسٹیج "کا آتا ہے۔ جولائی ۱۹۳۲ء سے ۱۹۳۴ء تک جاری رہا۔ اس کے خریدار چار ہزار سے زائد تھے اور اسکی اشاعت دس ہزار کے قریب تھی۔ اور اس زمانے میں ہندوستان بھر میں کثیر الاشاعت رسالہ تھا اس پرچے کے ادارے میں اختر پشاوری، ہیثم راشدی، محمود طرزی وغیرہ شامل تھے مگر اس کی کامیابی محض ایک شخص کی جدوجہد، محنت حوصلہ اور جذبۂ خدمت کا نتیجہ تھی اس شخص کا نام شاہ مسعود صابری مرحوم ہے انھوں نے اور کئی فلمی رسالے بھی نکالے جنکی فہرست ذیل میں درج کیجائے گی

اگر اردو تاریخ میں فلمی ادب کو کوئی جگہ دی گئی تو سب سے پہلے محمد یعقوب طارق مرحوم (جو فلمی وادبی دنیا میں وائی کے طارق کے نام سے مشہور تھے) عنایت حسین دہلوی مرحوم مدیر ہفتہ وار چونچ اور مسعود صابری مرحوم کے نام جلی حرفوں میں قلمبند کیئے جائیں گے ان حضرات نے فلمی جریدوں کے ذریعہ بنگال اور بیرون بنگال کے عوام میں اردو زبان کا جو شوق پیدا کیا اور کہانی، ڈرامے اور شاعری کا جو رجحان دلایا وہ ناقابل فراموش ہے۔ گو یہ پرچے نام کے فلمی ہوتے تھے مگر فلم اسٹیج پر تنقیدیں، ڈرامے اور کہانیوں پر تبصرے فلمی صنعت و حرفت سے متعلق مضامین اور فلمی دنیا کے حالات و کوائف جس انداز سے لکھے جاتے تھے وہ نہ صرف دلچسپ اور موثر ہوتے بلکہ ادب کا گرانقدر سرمایہ معلوم ہوتے ہیں۔

چند مشہور فلمی رسالوں کی فہرست ملاحظہ فرمایئے۔

نام	ایڈیٹر	تاریخ اجراء
ماہنامہ عکاس	(۱) ایم، ایم بیگ (۲) ایس، بی صابری	جنوری ۱۹۳۱ء تا دسمبر ۱۹۳۱ء
ماہنامہ فلم ریویو	(۱) وائی کے طارق (۲) عبدالرؤف	۱۹۳۰ء

، پردۂ فلم	وائی، کے طارق	؟
گراموفون ریویو	یوسف بیگ خادم	اکتوبر ۱۹۲۴ء
، فلم گائیڈ	شاہ مسعود صابری	جنوری ۱۹۳۲ء
، فلمی دنیا	(۱) وائی، کے طارق (۲) ظفر تبریزی بی، اے (۳) شاہ مسعود صابری	۱۹۳۱ء
، شبستان	ایضاً	۱۹۳۴ء
ہفت روزہ جو رنج	عنایت حسین دہلوی	۲۷ جولائی ۱۶؍ اپریل تا ۱۱ ۱۹ء

ادبی انجمنیں

تمہید کلکتہ اور ڈھاکہ کی ادبی انجمنوں کے زیر اہتمام جتنے مشاعرے اور جلسے ہوتے رہے جتنی نظمیں افسانے اور مقالات پڑھے گئے اگر انہیں یکجا جمع کر دیئے جائیں تو سینکڑوں مفید اور معلومات افزا کتابیں مرتب ہو سکتی ہیں۔ دہلی، لکھنؤ، لاہور اور دکن کی طرح پریس کی سہولتیں اور نشر و اشاعت کے ذرائع نہ ہونے کے باعث اہل بنگال کے ادبی کارنامے، علمی کاوشیں بنگال کے باہر دور دراز تک نہ پہنچ سکے بنگال میں جن قومی انجمنوں اور ادبی بزموں نے خاموش مگر ٹھوس اور مفید خدمات انجام دی ہیں انکی صراحت حسب ذیل ہے

دہلی انسٹی ٹیوٹ

خطبات گارساں دی تاسی صفحہ ۳۲۲ میں درج ہے ۱۲ مئی ۱۸۵۷ء میں دہلی کالج فنا کر دیا گیا اور اس کا تمام کتب خانہ نذر آتش تو اس کی وقف آمدنی سے چاندنی چوک کلکتہ میں دہلی انسٹی ٹیوٹ نام کا ایک تعلیمی ادارہ قائم کیا جس میں لارڈ کیننگ کی سفارش سے کلکتہ کی ایشیاٹک سوسائٹی سے جو امداد ملتی تھی اس سے دوگنی کر دی گئی۔"

مجلس مذاکرہ علمیہ اہل اسلام

گارساں دی تاسی اپنے خطبات صفحہ ۵۰۰ پر لکھتا ہے۔

"سرسید احمد خاں کی تحریک پر ۱۸۶۳ء میں کلکتہ کے مسلمانوں کی ایک انجمن قائم ہوئی جس کا نام مجلس مذاکرۂ علمیہ اہل اسلام، رکھا گیا اس کی صدارت نواب عبداللطیف خان بہادر مرحوم ساکن کلکتہ برادر عزیز عبدالغفور خاں نساخ نے فرمائی۔ سرسید نے اپنی تقریر میں فرمایا کہ اپنے آبا و اجداد کی طرح علم و حکمت میں اپنا نام روشن کریں اور یہ تجویز پیش کی کہ ہندوؤں اور مسلمانوں کی ایک کمیٹی بنائی جائے جس میں مذہب و ملت کی کوئی تفریق نہ ہو اس کمیٹی کے سپرد یہ کام ہو کہ جہاں تک ہو سکے مغربی علوم و فنون کی کارآمد کتابوں یا مذہبی دو بنی کتابوں کے ترجمے کئے جائیں جن کے ہندی اور اُردو دونوں ایڈیشن ہوں بلکہ ان سے ہندو اور مسلمان دونوں استفادہ کر سکیں۔

اس انجمن نے ۶۰ ہزار روپے کے انعامات لوگوں کیلئے مقرر کئے جو اُردو میں مندرجہ ذیل موضوعوں پر مضامین لکھیں۔

" حیات اورنگ زیب، ہندی مسلمان، انجمن اور اس کے کل پرزے مطبع کے تاریخ و تمدن پر اثرات۔"

اس انجمن کی سرپرستی بنگال کے لفٹنٹ گورنر نے قبول فرمائی جو اس امر کا ثبوت ہے کہ سرکاری حلقوں میں بھی انجمن کی اہمیت محسوس کی جاتی تھی (خطبات گارساں دی تاسی صفحہ ۵۰۰ - ۴۷۲)

انجمن اسلامیہ

۱۸۶۶ء میں ڈاکٹر لائٹنر کی کوشش سے لاہور میں ایک ایسی جامعہ قائم کرنے کی کوشش کی گئی جس کا ذریعۂ تعلیم اُردو زبان قرار پائے پھر ہندوستان کے مختلف صوبجات میں جلسے ہوئے ۱۸۶۷ء میں انجمن اسلامیہ کلکتہ نے دو ہزار لوگوں کے مجمع میں اس تحریک پر زور دیا وغیرہ وغیرہ (گارساں دی تاسی اور اس کے ہمعصر بہی خواہان اُردو - از محی الدین قادری زور۔ صفحات ۱۲۳ - ۱۲۰)

۱۸۶۵ء میں کلکتہ میں ایک انجمن قائم ہوئی جس کا مقصد یہ تھا کہ ہندوؤں کے مذہب میں جو رسومات قبیحہ داخل ہوگئی ہیں انہیں خارج کردیں۔ راجہ کرشنا بہادر اس انجمن کے صدر تھے اسکی تمام کارروائیاں ہندستانی زبان میں ہوتی تھیں (سالنامہ جدید اردو ۱۹۲۵ء)

مسلم انسٹی ٹیوٹ

سن قیام ۱۹۰۲ء یہ شہر کلکتہ میں مسلمانوں کا سب سے بڑا قومی، علمی و ادبی ادارہ ہے۔ اس کے بعض شعبے یہ ہیں۔ کتب خانہ کھیل جمناسٹک تحریری و تقریری مقابلہ، بزم مذاکرۂ علمیہ اردو، انگریزی، بنگلہ۔ کتب خانے میں ہر زبان و ہر علم و فن کی کتابیں موجود ہیں مشاعرے اور ادبی نشستیں بھی ہوا کرتی ہیں عموماً تمام کارروائیاں اردو ہی میں ہوتی ہیں ایک انگریزی ماہنامہ (مسلم ریویو) نامی عرصہ تک شائع ہوتا رہا گو یہ رسالہ انگریزی میں چھپتا تھا لیکن اس کے مضامین اکثر اردو، فارسی، عربی علوم و فنون ہی سے متعلق ہوتے اور انہیں زبانوں پر علمی و ادبی بحثیں اور تنقید و تبصرے شائع ہوا کرتے۔ اس کے مستقل قلمی معاونین میں ہندو، مسلم ادیبوں کے علاوہ یورپین اور اینگلو انڈین انشاء پرداز بھی شامل تھے ہر قسم کی سیاسی، ادبی، مذہبی کارروائیوں کیلئے اس کا ہال مخصوص ہوتا ہے۔ بنگال کی سربرآوردہ ہستیاں اور قومی رہنما اس ادارے کی کمیٹی سے وابستہ رہے اس کے موجودہ صدر سید بدرالدجا سابق ایم ایل اے اور سکریٹری پروفیسر عبدالمجید ایم۔ اے (۱۹۵۳ء) محمد کبیر ۱۹۵۴ء ہیں۔

رائل ایشیاٹک سوسائٹی اور امپیریل ریکارڈس

کلکتہ کے سب سے بڑے کتب خانے ہیں انگریزوں کے زیر سرپرستی بڑی ترقی کی۔ اردو زبان و ادب کی کتابوں کے علاوہ دیگر ادبیات پر ہر زبان کی کتابیں دستیاب ہوتی ہیں جو دنیا کی لائبریریوں میں نایاب ہیں۔

انجمن ترقی اردو

ڈاکٹر عبدالحق نے جو کوششیں ہندستان کے دوسرے صوبوں میں اس انجمن کے ذریعہ اردو کی ترقی کے سلسلہ میں کی ہیں اگر تھوڑی سی توجہ

بنگال کی طرف بھی مبذول فرماتے تو یہاں بھی اردو کی ترقی کی کافی گنجائش تھی مگر افسوس اس انجمن نے بنگال میں معمولی سی سرگرمی نہیں دکھلائی لیکن اس کے باوجود کلکتہ کے ارباب ذوق کی کوششوں سے یوم اقبال، یوم حالی وغیرہ کے موقع پر جس طرح علمی و ادبی سرگرمیوں کا ثبوت دیا جا رہا ہے نہ قابل ستائش ہے۔ ۱۹۲۵ء میں جس دھوم دھام سے یوم حالی منایا گیا تھا وہ اپنی مثال آپ ہے اس کی صدارت کیلئے آل احمد سرور لکھنؤ سے تشریف لائے تھے۔ علامہ وحشت کلکتوی سلیم اللہ فہمی، میزان الرحمٰن بھی تشریف فرما تھے ان حضرات کے مقالات جو اس جلسے میں پڑھے گئے تھے۔ کتابی شکل میں شائع کر دیے جائیں تو اردو ادب میں بیش قیمت اضافہ ہو جائے

قیام پاکستان کے بعد ۱۹۴۸ء میں انجمن کی شاخ ڈھاکہ میں بھی قائم ہوئی جس کے افتتاح کیلئے بابائے اردو ڈاکٹر عبدالحق اور جگر مرادآبادی ڈھاکہ تشریف لائے تھے یہ جلسہ دائرہ ادب کے دفتر میں منعقد ہوا تھا راقم الحروف کو بھی اس جلسہ میں شرکت کا فخر حاصل ہے۔ اب تک مختصر سی لائبریری اور چند مشاعروں کے علاوہ اس انجمن کی کوئی ٹھوس کارروائی نظر نہیں آئی۔ لیکن مستقبل قریب میں اس سے بہت کچھ امیدیں وابستہ ہیں اس کی ایک شاخ حال ہی میں چاٹگام میں بھی قائم ہو چکی ہے۔

دلکشا انسٹی ٹیوٹ

پہلے اس کا نام دلکشا لائبریری تھا۔ کوئی بیس سال قبل اسکی بنیاد رکھی گئی۔ مسلم انسٹی ٹیوٹ کے بعد کلکتہ کے مسلمانوں کا یہ دوسرا ادارہ ہے جہاں ہر قسم کی کتابوں کے علاوہ اخبارات و رسائل کا باقاعدہ انتظام ہے۔ محمد خلیل بی اے اور عابد حسین اس کے بانی ہیں۔ آخر الذکر اس کے مستقل سکریٹری بھی ہیں۔ کلکتہ کا یہ واحد عوامی ادارہ ہے جس کی اپنی عمارت ہے۔

بزم احباب

۱۹ جون ۱۹۲۰ء بمقام کلکتہ قائم ہوئی۔ ہر ماہ کلکتہ کے اہل علم اور ارباب ذوق کا خاص اجتماع ہوتا ہے جس میں نہایت ٹھوس، مفید اور دلچسپ تخلیقات پیش کی جاتی ہیں خصوصاً وحشت، آرزو و ناطق کے خوشہ چین، پروفیسران اور تعلیم یافتہ

حضرات اس کے ممبر ہیں۔ اس بزم کی ایک خاص کشش یہ بھی ہے کہ ہر نشست میں طعام و نوش کا خاص اہتمام ہوتا ہے۔ جب محفل میں شرکا انواع و اقسام کے کھانے مثلاً قورمہ، پلاؤ، زردہ، کباب وغیرہ سے نوازے جاتے ہیں تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کوئی مخصوص تقریب ضیافت کا دور چل رہا ہے سرپرست خان بہادر رضا علی وحشت۔ صدر رسا ابوالعلا حکیم ناطق لکھنوی مرحوم سکریٹری۔ پرویز شاہدی ایم۔ اے، موجودہ صدر پروفیسر عبدالرحیم ایم اے (علیگ، ڈھاکہ) سکریٹری، امیر رضا مظہر الکاظمی ایم اے، بی، ٹی۔ تقسیم بنگال کے بعد اسکی ایک شاخ ڈھاکہ میں بھی وجود میں آئی جسکے موجودہ صدر سلیم اللہ فہمی ایم۔ اے، بی، سی، ایس اور سکریٹری احسن احمد اشک ہیں

بزم جلال اور مسلم لٹریری سوسائٹی

۱۹۴۲ء میں عالم وجود میں آئی مشاعرے ادبی جلسے، تحریری، تقریری مقابلے وغیرہ برابر ہوا کرتے ہیں، اسکی سب سے بڑی خصوصیات یہ ہے کہ کلکتہ اور مضافات کلکتہ کے ہر جماعت کے اہل ذوق حضرات اس کی سرگرمیوں میں حصہ لیا کرتے ہیں اسکے بانی اور مستقل جنرل سکریٹری ہونے کا شرف راقم الحروف کو حاصل ہے۔ راقم الحروف کے پاکستان چلے آنے کے بعد محمد قاسم صبر خضر پوری کام کر رہے ہیں۔ سرپرست۔ وحشت کلکتوی و آرزو لکھنوی مرحوم۔ صدر پروفیسر عباس علیخاں بیخود ایم، اے۔ نائب صدر (۱) رضا مظہری ایم، بی، ٹی (۲) جرم محمد آبادی (۳) پروفیسر اختر حسین ایم، اے (۴) ڈاکٹر عبدالغنی ۔ اراکین کمیٹی میں ابراہیم ہوش، یونس احمر ایم، اے وغیرہ جیسے مشہور صحافی و فنکار قابل ذکر ہیں مسلم لٹریری سوسائٹی کلکتہ کے بانی اور سابق سکریٹری ہونے کا شرف بھی راقم الحروف کو حاصل ہے۔

اردو مجلس

۱۹۴۰ء میں نواب دہلوی نے اسکی بنیاد رکھی۔ آج کل اس کے سکریٹری رضا مظہری ایم۔ اے، بی، ٹی، ہیں

دبستان آرزو

۱۹۴۱ء میں اسکے سنگ بنیاد رکھنے کا سہرا آرزو لکھنوی کے تلمیذ ارشد جرم محمد آبادی کے سر ہے۔ اسکے تحت فنی معلومات تحقیق

زبان و ادب اور اصلاح کلام کی قابل قدر و بے لوث خدمات انجام دی جا رہی ہیں۔

بزم شاکری

کلکتہ کے ایک گمنام مگر ماہر فن و زبان شاعر طاہر علی شاکر کے شاگردوں کی کاوش و محنت کے سبب آج تک زندہ ہے۔ اس بزم کے تحت ہر ماہ باقاعدگی کے ساتھ مشاعرہ ہوا کرتا ہے اور ہر مشاعرے میں معمولی پڑھے لوگ بھی مصرع طرح پر طبع آزمائی کرتے ہیں اسطرح ایک طرف نوجوان کا شوق ادب پروان چڑھتا ہے تو دوسری طرف اردو زبان سے دلچسپی بڑھتی جاتی ہے وہ شخص جسکی مادری زبان بنگالی ہے اور جسکا اردو تلفظ درست نہیں آج وہ نہ صرف اردو زبان سے واقف ہے بلکہ اردو شاعری اور فن عروض پر بھی بہت حد تک حاوی نظر آتا ہے اور یہ اردو کی ترقی و توسیع کے سلسلہ میں بڑی بات ہے تقسیم بنگال کے بعد اسکی ایک شاخ ڈھاکہ میں بھی قائم ہو چکی ہے مندرجہ بالا انجمنوں کے علاوہ بزم سخن (جو سنہ ۱۹۳۴ء میں علاقہ خضر پور میں قائم ہوئی اور جسکے سکریٹری رشید الزماں خلش، بی۔ اے ہیں) بزم ادب (سن قیام سنہ ۱۹۴۰ء سکریٹری عبد المجید ایم، اے ہیں) بنگال لٹریری سوسائٹی (اس کے تین شعبے، انگریزی، اردو، بنگلہ ہیں شعبہ اردو کے سکریٹری عبد الوہاب بی اے اور راقم الحروف ہیں۔ بزم اردو (سن قیام سنہ ۱۹۴۰ء صدر ابراہیم شفق ایم۔ اے اور سکریٹری پروفیسر طاہر رضوی ایم۔ اے) وغیرہ کی بے لوث خدمات ناقابل فراموش ہیں اس کے علاوہ مشرقی بنگال کی ادبی انجمنیں حسب ذیل ہیں۔

دائرۂ ادب ڈھاکہ چاٹگام

تقسیم ملک کے فوراً ہی بعد سنہ ۱۹۴۷ء کے آخیر میں مشرقی بنگال میں اردو زبان کی ترقی و ترویج کی غرض سے عالم وجود میں آیا۔ بانیوں میں اختر ماہ پوری، عابد دانا پوری اور راقم الحروف کے نام قابل ذکر ہیں۔ خاکسار کو اس کے سابق رکن کمیٹی ہونے کا بھی فخر حاصل ہے۔ یہ وہ واحد ادبی ادارہ ہے جہاں سنہ ۱۹۵۱ء میں بابائے اردو ڈاکٹر عبد الحق اور حضرت جگر مراد آبادی نے مشرقی پاکستان کے دورے کے سلسلہ میں ادارے کے ایک یادگار جلسہ میں جو ان کے اعزاز میں منعقد ہوا تھا شرکت کی اور مشرقی پاکستان کے ادبی ارتقاء اور امکانات

کا جائزہ لیا۔ ڈھاکہ میں انجمن ترقی اردو قائم کرنے کی کارروائیاں بھی وہیں عمل میں آئیں۔ اس ادارے کے صدر ڈاکٹر عندلیب شادانی اور سکریٹری نظیر صدیقی اور افسر ماہ پوری، عابد قانا پوری، مولانا حافظ ظہور الحق باری سرگرم کارکن رہ چکے ہیں۔ اس کی ایک شاخ چاٹگام میں بھی قائم ہو چکی ہے۔

اس کے علاوہ انجمن تحریک اردو ڈھاکہ (جس کے بانی و صدر حضرت خواجہ محمد عادل جہانگیر نگری ہیں۔

ینگ رائٹرز ایسوسی ایشن ڈھاکہ، انجمن تعمیر ادب چاٹگام، بزم ادب چاٹگام قائد اعظم اردو لائبریری چاٹگام، قرآن سوسائٹی ڈھاکہ، بزم ناطق چاٹگام، ترجمان ادب چاٹگام، انجمن مہاجرین چاٹگام، ریلوے انسٹی ٹیوٹ چاٹگام وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

فہرست بنگال میں اردو تصانیف و مطبوعات

(بعض وہ کتابیں بھی شامل ہیں جو بنگال میں لکھی گئیں اور بنگال سے باہر شائع ہوئیں)

کتاب	مصنف	سن اشاعت	کتاب	مصنف	سن اشاعت
قصۂ مہر و ماہ	سید محمد حیدر بخش	۱۸۰۰ء	منظوم ترجمہ پندنامہ سعدی	مظہر علی ولا	۱۸۰۲ء
باغ و بہار	میر امن دہلوی	۱۸۰۱ء	ترجمہ ہفت گلشن (مصنفہ ناصر علیخاں بلگرامی)		۱۸۰۱ء
آرائش محفل یعنی قصۂ حاتم طائی	سید محمد حیدر بخش	"	قصۂ مادھونل وکام کندلا	مظہر علی ولا	"
گنج خوبی	میر امن دہلوی	۱۸۰۲ء	ترجمہ عہد شیر شاہ	"	"
نو طرز مرصع	میر عطا حسین خاں تحسین	۱۷۶۸ء	دیوان ریختہ	"	"
بیتال پچیسی	مظہر علی ولا	۱۸۰۲ء	اردو لغت	ڈاکٹر جان گلکرسٹ	۱۷۵۹ تا ۱۸۴۱ء

کتاب	مصنف	سن اشاعت
ہندوستانی علم اللسان	ڈاکٹر جان گلکرسٹ	۱۷۸۹ء / ۱۸۱۴ء
صرف و نحو	"	"
ہندی کی آسان مشقیں	"	"
فارسی افعال کا جدید نظریہ	"	"
مشرقی زباندانی	"	"
بیاض ہندی	"	"
اجنبیوں کے لیے رہنمائے اردو	"	"
عملی نمونے	"	"
مکالمات ہندی و عربی	"	"
ہندوستانی گو	"	"
اتالیق ہندی	"	"
مشرقی حصہ	"	"
ہندی عربی آئینہ	"	"
انگریزی ہندوستانی لغت	ایس ڈبلو فیلن	۱۸۵۸ء
گلدستۂ نشاط	"	۱۹۳۶۔۳۷ء
ترجمہ قرآن مجید	مولوی عبداللہ مسکین	۱۸۲۹ء
ترجمہ سنگھاسن بتیسی (یعنی	مرزا کاظم علی جوان	۱۸۰۱ء
قصۂ شکنتلا (ترجمہ) مصنفہ کالیداس		
ترجمہ قرآن مجید	"	۱۸۰۴ء
ترجمہ تاریخ بہمنی	"	"

کتاب	مصنف	سن اشاعت
بارہ ماسہ دستور ہند	مرزا کاظم علی جوان	۱۸۰۴ء
خرد افروز (مجموعہ کلام میر سودا)	"	"
طوطا کہانی	سید محمد حیدر بخش	۱۸۰۲ء / ۱۸۰۴ء
ترجمہ مثنوی قصہ لیلیٰ مجنوں (مصنفہ امیر خسرو)	"	"
گل مغفرت	"	"
گلزار دانش (ترجمہ بہار دانش)	"	"
تاریخ نادری (ترجمہ نادر نامہ مصنفہ مرزا مہدی)	"	۱۲۲۴ھ
ہفت پیکر	"	۱۸۰۵۔۰۶ء
دیوان حیدر	"	"
آرائش محفل (ماخوذ از خلاصۃ التواریخ مصنفہ منشی سوجن رائے)	میر شیر علی افسوس	۱۸۰۴ء
باغ اردو (ترجمہ گلستان سعدی)	"	۱۸۰۲ء
دیوان افسوس	"	"
قصہ بے نظیر (ترجمہ مثنوی سحر البیان مصنفہ میر حسن دہلوی)	میر بہادر علی حسینی	
اخلاق ہندی (ترجمہ مفرح القلوب)	"	"
ترجمہ تاریخ آسام (مصنفہ شہاب الدین طالش)	"	۱۸۰۶ء
قصۂ لقمان	"	"
ترجمہ قرآن مجید	"	"
ترجمہ اخوان الصفا	اکرام علی	۱۸۱۰ء

کتاب	مصنف	سن اشاعت	کتاب	مصنف	سن اشاعت
تذکرہ گلشن ہند (ترجمہ	اکرام علی	۱۸۱۰ء	پریم ساگر	سری لال گجراتی	عہد فورٹ ولیم کالج
گلزار ابراہیم)			راج نیتی	"	"
خرد افروز (عیار دانش	مولوی حفیظ الدین	"	لطائف ہندی	"	"
مصنفہ ابوالفضل)			کشن جی	"	"
کلیات میر	میر تقی میر	"	ہندوستانی لغت	ایس ڈبلو فیلن	۱۸۵۸ء
صرف اردو (نظم)	امانت اللہ شیدا	"	گلدستۂ نشاط	"	[illegible]
ہدایت الاسلام (نثر)	"	۱۸۰۴ء	ترجمہ قرآن مجید	شاہ عبدالقادر	۱۲۵۲ھ
اخلاق جلالی (ترجمہ	"	"	سہیل یمن	نصیر الدین حیدر	"
جامع الاخلاق			مثنوی بکاولی	سید ریحان الدین	"
اکبر نامہ (ترجمہ واقعات اکبر)	خلیل علیخاں اشک	۱۸۰۹ء	ترجمہ گل بکاولی (مذہب عشق)	نہال چند	۱۸۱۴ء
اردو محاورات	مرزا جان طپش	۱۸۱۱ء	تاج الملوک	"	"
کلیات طپش	"	"	مجموعۂ قوانین	لالہ سدا سکھ لال	۱۸۳۴ء
بہار عشق (ترجمہ بل دمن)	مہر علی	۱۸۰۴ء	گنگا کی لہر	"	۱۸۵۴ء
ترجمہ بائبل	سیرام پور مرکز	۱۸۰۹ء	گل صنوبر	ہیم چندر	۱۸۳۷ء
ترجمہ عہد جدید	مرزا محمد فطرت	۱۸۰۵ء	اصول انتظام مدن	لالہ ہر نرائن	۱۸۴۶ء
ترجمہ عہد جدید	پادری مارٹن	۱۸۱۴ء	کھیت کرم	کالی رائے	"
دیوان جہاں	بینی نرائن	۱۸۱۲ء	اصول علم ہیئت	پنڈت رامچندر	۱۸۴۷ء
چار گلشن	"	"	قانون الطباع	"	"
ترجمہ تنبیہ الغافلین	"	۱۸۲۹ء	جغرافیہ ہند	روپ نرائن	"
ترجمہ تنبیہ الغافلین	مولوی عبداللہ	۱۸۳۰ء	مراۃ العلوم	ستیل پرشاد	"

کتاب	مصنف	سن اشاعت	کتاب	مصنف	سن اشاعت
علم طبعیات	ہری دامن لال	١٨٤٩ء	دیوان ضیغم	(حافظ سید اکرام احمد ضیغم)	١٨٨٩ء
پندنامہ کاشتکاری	پنڈت موتی لال	١٨٥٢ء	آفتاب عالمتاب	(قاضی محمد صادق اختر	"
خلاصۃ النصائح	منی بھولاناتھ	١٨٥٤ء	عابد حیدری	"	"
قواعد اردو	دیوی پرشاد	"	مطلع العلوم و مجمع الفنون	"	"
کلیات کرشنا	راجہ راج کرشنا بہادر	"	گلدستۂ محبت	"	"
احسن المواعظ	راجہ پوپ کالی کرشنا کنور	"	مثنوی سراپا سوز	"	"
شاہنامہ	"	"	صبح صادق	"	"
دیوان کنور	"	"	بہار بے خزاں	"	"
مجموعۂ لطائف اردو	"	"	بہار اقبال	"	"
نسخۂ دلکش	راجہ جیجوئی نترار مان	١٨٧٠ء	گنج نیرنگ	"	"
لغت سنسکرت اور ہندوستانی	راد کانت	"	ہفت اختر	"	"
مظہر الامرا (فارسی)	متھرا داس		دیوان ریختہ	"	
مثنوی شرف	شرف النساء	١٨٣٨ء	دفتر بے مثال	عبدالغفور نساخ	"
دیوان احد	عبدالودود احد	"	تذکرۂ سخن شعراء	"	١٨٧٥ء
نوید برہان	آغا احمد علی	١٨٦٥ء	تذکرۃ المعاصرین	"	؟
شمشیر تیز تر (فارسی)	"	١٨٦٨ء	قند پارسی (فارسی)	"	"
ترانہ (فارسی)	"	١٨٦٧ء	گنج تواریخ	"	؟
اشتقاق	"	"	ارمغانی (دیوان چہارم)	"	؟
ہفت آسمان	"	١٨٧٢ء	زبان ریختہ	"	؟
دیوان آزاد	نواب سید محمود آزاد	١٨٦٩ء	قطعۂ منتخب	"	؟

کتاب	مصنف	سن اشاعت	کتاب	مصنف	اشاعت
انتخاب نقص	عبدالغفور نساخ	۱۸۷۵ء	رباعیات شہباز	پروفیسر عبدالغفور شہباز	۱۹۲۲ء
منظر معمہ	"	"	عبرت (ناول)	خواجہ عتیق اللہ	"
چشمۂ فیض	"	"	دیوی چودھرائن (ناول)	"	"
شاہد عشرت	"	"	خدا کی شان (ناول)	"	"
مرغوب دل	"	"	خوبیٔ قسمت (ناول)	خواجہ محمد اشرف	"
اشعار نساخ	"	"	مجموعہ تاریخ بتین جلد قطعات تاریخ	خواجہ محمد افضل	"
ارمغان	"	"	غم ماہ محرم قطعات تاریخ		"
ترانۂ خامہ	"	"	دیوان شمس (ابوالقاسم محمد مظہر الحق شمس)		"
باغ فکر معروف بہ قطعات نساخ	"	"	نالۂ عصیم	عبدالحلیم عصیم	"
سوانح عمری نساخ	"	"	دیوان عزیز (عبدالعزیز تلمیذ نساخ)		"
طومار اغلاط	"	"	بڑی بہو (ناول)	خواجہ محمد اعظم	"
ترجمہ پندنامہ مصنفہ فرید الدین عطار	"	"	ثلاثۂ غسالہ (حکیم حبیب الرحمٰن)		۱۸۸۱ء، ۱۹۴۴ء
			آسودگان ڈھاکہ	"	"
خیالات آزاد	نواب سید محمد آزاد	۱۸۸۹ء	مساجد ڈھاکہ	"	"
سوانح عمری آزاد	"	۱۹۰۸ء	ڈھاکہ پچاس برس پہلے	"	"
نوابی دربار	"	"	کچھ اپنی باتیں	"	"
دیوان شائق	خواجہ فیض الدین شائق	"	ڈھاکہ کی تاریخی عمارتیں	"	"
تفریح القلوب	پروفیسر عبدالغفور شہباز	۱۹۰۲ء	رقعات بدر بسر	محمود الرب خاں آگہ بنگالی	؟
خیالات شہباز	"	"	تاریخ ہند (رسالہ بارہ حصے)	عبدالحکیم سلہٹی	۱۸۹۶ء تا ۱۹۳۶ء
زندگانی بے نظیر	"	"	اسلام اور عروج سائنس و تمدن	"	"

کتاب	مصنف	سن اشاعت	کتاب	مصنف	سن اشاعت
ترجمان القرآن	ابوالکلام آزاد	؟	جامع القواعد	مولانا حافظ محمود	۱۹۳۷ء
دیوان وحشت	رضا علی وحشت	۱۹۱۰ء	انتخاب	"	"
ترانۂ وحشت	"	۱۹۵۳ء	دیوان اکمل	اکمل علی اکمل	۱۹۴۴ء
مقالاتِ وحشت	"	غیر مطبوعہ	دیوان سرور	سرور خاں سرور	؟
مسئلہ قربانی (مولانا عبدالرؤف دانا پوری)		۱۹۱۷ء	دیوان نشتر	عبدالکریم	؟
یادگار	"	۱۹۱۲ء	احسن (ناول)	عبدالزماں بدر	؟
اصح السیر (سیرت)	"	۱۹۳۴ء	شکست و فتح	جمیل مظہری	۱۹۵۰ء
البرہان	"	؟	نقشِ جمیل	"	۱۹۵۳ء
تریاق	"	؟	زنجیر محبت (ناول)	محمد سلیمان واصف	۱۹۰۴ء تا ۱۹۵۳ء
اسلام اور مذہبی مسائل	"	؟	پرتھوی راج	"	"
خطبات	"	؟	پاکستان	"	"
نظم اردو (حکیم ابوالعلا ناطق لکھنوی)		؟	اردو بنگلہ نیچے پوڑو کتابچے	نصرت واسطی	؟
سچی کہانیاں (پریم پجاری)	ڈاکٹر عندلیب شادانی		جولیس سیزر (ڈرامہ)	محمد سلیمان واصف	"
نوش و نیش (افسانے)	"		جنگ روس و تاتار (")	"	"
چھوٹا خدا (")	"		شاستا	"	"
تحقیقات (تنقید)	"		عورت کا انتقام (فلمی کہانی)	"	"
دورِ حاضر اور غزل گوئی (تنقید)	"		نادر شاہ (ڈرامہ)	"	"
نشاطِ رفتہ (مجموعۂ کلام)	"		نظام حکومت (رضا مظہری الکاظمی)		۱۹۳۹ء
گلستانِ شرف	شرف الدین شرف	۱۹۳۷ء	گلشن اردو	پروفیسر طاہر رضوی	۱۹۰۵ء تا ۱۹۴۴ء
شمع نبی کے پروانے	مولانا حافظ محمود	؟	خیابان ادب	"	"

کتاب	مصنف	سن اشاعت	کتاب	مصنف	سن اشاعت
دبستانِ رضویہ	پروفیسر طاہر رضوی	۱۹۰۵ء تا ۱۹۴۴ء	یادگارِ صحیفہ	صحیفہ بانو	۱۳۳۲ھ
انتخابِ سبزواریہ	"	"	تیز فرنگ (مضامین)	سعیدہ اختر	؟
چمنستانِ ادب	"	"	پریمی (ناول)	راحت آرا بیگم	؟
اردو کمپوزیشن	وحید النبی وحید	"	فیروزہ "	جمیلہ بیگم	؟
خیروشر (ڈرامہ)	وحید النبی وحید	؟	روشنک بیگم "	محمدیہ بیگم	؟
ترجمہ دیوانِ کامران	پروفیسر محفوظ الحق	؟	ضبط تولید (ترجمہ)	پروفیسر شمس شیدائی	
ترجمہ رباعیات عمر خیام	"	؟	جام بیخودی (پروفیسر عباس علیخاں بیخود)		۱۹۴۶ء
کوکب دری	نجیب اختر سہروردی	؟	سنگریزے (افسانے)	محمد یونس احمر	۱۹۴۴ء
آئینہ عبرت	"	؟	ترجمہ زہریلی بانسری (مصنف قاضی نذرالاسلام) وغیرہ		؟
دیوانِ خمار	جبین خمار	؟	گلابی نادے	ساجن پردیسی	۱۹۴۵ء
صحیفۂ فطرت (مضامین)	"	؟	جامِ نو (حالات وکلام شعراء)	تابان القادری	۱۹۴۷ء
بانسری کی آواز (افسانہ)	راحت آرا بیگم	۱۹۱۰ء ۱۹۴۹ء	شام روح	"	۱۹۵۱ء
شب کی پکار "	"	"	برق وباراں (پروفیسر احسن اشک)		
بدر کی بیٹی "	"	"	مشرقی ریڈیائی تقاریر	ابوالکلام سلیم اللہ فہمی	۱۹۵۳ء
دلنواز "	"	"	خونِ جگر ہونے تک (ناول)	فضل احمد کریم فضلی	"
انقلاب "	"	"	چشمِ غزال (مجموعۂ کلام)	"	"
غنچۂ افسانہ "	"	"	جمع القرآن (مولانا تمنا عمادی پھلواروی)		"
دیوانِ راحت (مجموعۂ کلام)	"	"	انتخابِ کلام مسلم شعرائے بنگال (ترجمے)	احسن احمد اشک	۱۹۵۴ء
رادھا (ناٹک)	"	۱۸۳۸ء تا ۱۸۸۰ء	پیامِ نو	یونس احمر، وفا راشدی	۱۹۴۶ء
مثنوی شرف النساء	شرف النساء شرف مرشدآبادی	غیر مطبوعہ	بنگال میں اردو	"	جنوری ۱۹۵۵ء
			حیاتِ وحشت	"	زیر طبع

ماخذ

کتابیں	نام مصنف	رسائل
خطباتِ گارسن دی تاسی	گارسان دی تاسی	نگار اردو شاعری نمبر ۱۹۳۵ء
تاریخ ادب اردو	رام بابو سکسینہ	ماہنامہ ادبی دنیا لاہور
آبِ حیات	محمد حسین آزاد	سہ ماہی آرزو دکن
تاریخ نظم و نثر اردو	آقا محمد باقر	ماہنامہ جدید اردو کلکتہ
گلِ رعنا	عبدالحیٔ	ماہنامہ اختر بولائی میمن سنگھ
نظم اردو	ناطق لکھنوی	اودھ پنچ لکھنؤ
تذکرہ سخن شعراء	عبدالغفور نساخ	ماہنامہ مسلم ریویو، کلکتہ
مقالاتِ وحشت	رضا علی وحشت	سلکشن فرم دی ریکارڈس آف بنگال گورنمنٹ
دکن میں اردو	نصیر الدین ہاشمی	اخبار انڈین میل ۱۲ر مارچ سنہ ۱۸۶۳ء
مدراس میں اردو	،	
مشرقی پاکستان کے اردو ادیب	عندلیب شادانی اور دیگر	

وقار اشرفی

۱۳ر جنوری سنہ ۱۹۵۵ء

۱۷ر جمادی الاول سنہ ۱۳۷۴ھ